اُردو
دائرۂ معارفِ اسلامیّہ

زیرِ اہتمام

شعبۂ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیّہ

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

نستعلیق ایڈیشن

جلد ۱

(آئین ــــ اَرغُوْن)

طبع اوّل : محرّم ۱۴۳۹ھ/ستمبر ۲۰۱۷ء

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد شفیع، ستارۂ پاکستان، ایم اے (کینٹب)، ڈی اوایل (پنجاب)	رئیسِ ادارہ و مدیر خصوصی[1]
ڈاکٹر محمد وحید میرزا، ایم اے (پنجاب)، پی ایچ ڈی (لنڈن)	مدیر[2] و رئیسِ ادارہ[3]
محمد نصر اللہ احسان الٰہی رانا، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)، پی ایچ ڈی (کینٹب)	معاونِ رئیسِ ادارہ[4]
سیّد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	مدیرِ معاون[5]
سیّد نذیر نیازی	مدیرِ معاون
نصیر احمد ناصر، ایم اے (پنجاب)	معتمدِ ادارہ[6]
عبدالمنّان عمر، ایم اے (علیگ)	مأمورِ خصوصی[7]

۱- از یکم دسمبر ۱۹۵۰ء تا ۱۳ مارچ ۱۹۶۳ء
۲- از ۲۶ مارچ ۱۹۶۲ء
۳- ۱۱ اپریل ۱۹۶۳ء تا ۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء
۴- از اکتوبر ۱۹۶۱ء
۵- از ۲۶ مئی، ۱۹۶۲ء
۶- از ۱۶ اپریل ۱۹۶۰ء
۷- از ۱۲ فروری، ۱۹۵۸ء

مجلسِ انتظامیّہ

۱۔ شیخ محمد شریف، وائس چانسلر، دانش گاہِ پنجاب (صدر مجلس)
۲۔ مسٹر جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمٰن، ہلالِ پاکستان، جج سپریم کورٹ آف پاکستان، لاہور
۳۔ لفٹیننٹ جنرل ناصر علی خان، صدر پبلک سروس کمیشن، مغربی پاکستان، لاہور
۴۔ مسٹر ایم ایم احمد، تمغۂ پاکستان، زائد معتمد اعلیٰ، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
۵۔ مسٹر اے جی این قاضی، معتمد مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
۶۔ مولوی محمد علاء الدّین صدیقی، صدر، شعبۂ علومِ اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب، لاہور
۷۔ مسٹر عبدالرشید خان، سابق کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، مغربی پاکستان، لاہور
۸۔ سیّد یعقوب شاہ، ایم اے، سابق آڈیٹر جنرل آف پاکستان، لاہور
۹۔ ڈاکٹر محمد شفیع، ستارۂ پاکستان، صدر، شعبۂ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب، لاہور
۱۰۔ سیّد شمشاد حیدر، ایم اے، خازن، دانش گاہِ پنجاب، لاہور
۱۱۔ میاں محمد بشیر، ستارۂ خدمت، مسجّل، دانش گاہِ پنجاب، لاہور (معتمدِ مجلس)

بارِ اوّل: محرّم ۱۴۳۹ھ/ستمبر ۲۰۱۷ء
ناشر: محمد ارشد، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)، رئیس شعبۂ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب، لاہور
مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور



الفضل مات

۱۳۸۲ھ

نہایت رنج و افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ پروفیسر مولوی محمد شفیع، رئیس ادارہ، دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو) ۱۳ اور ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کی درمیانی شب کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ شمع، جس سے بزمِ علم و تحقیق مطلع انوار تھی، گُل ہوگئی اور پوری بزم تاریک رہ گئی۔

مولوی محمد شفیع صاحب ۶ اگست ۱۸۸۳ء کو قصور (ضلع لاہور) کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے اور وہیں سے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیاب ہوکر اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۰۴ء میں بی اے ہوئے اور پورے صوبے میں عربی و فارسی میں اوّل رہ کر کئی تمغے اور یونیورسٹی کا وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۰۵ء میں ایف سی کالج لاہور سے ایم اے (انگریزی) کیا اور کچھ مدّت سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں آپ نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۳ء میں ایم اے (عربی) کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے اور میکلوڈ عربک ریسرچ سکالرشپ پایا۔ ۱۹۱۵ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے آپ کو وظیفہ دے کر انگلستان بھیجا گیا اور ۱۹۱۹ء تک آپ کیمبرج یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران میں آپ وہاں تقریباً ایک برس تک ہندوستانی کے استاد بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں آپ نے وہاں سے ایم اے عربی (بذریعۂ تحقیق) کی ڈگری حاصل کی۔

اسی سال لاہور واپس آکر مولوی محمد شفیع صاحب پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرّر ہوئے اور اورینٹل کالج میں ۱۹۲۱ سے ۱۹۳۶ء تک وائس پرنسپل اور ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۲ء تک پرنسپل رہے۔ آپ ۱۹۱۹ سے ۱۹۶۳ء تک پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ اور ۱۹۱۹ سے ۱۹۴۲ء اور پھر ۱۹۴۸

سے ۱۹۶۳ء تک سنڈیکیٹ کے رکن رہے۔ اس عرصے میں وہ تقریباً سترہ برس اورینٹل فیکلٹی کے ڈین کے عہدے پر بھی فائز رہے اور یونیورسٹی کے مختلف انتظامی اداروں کی سربراہی کی۔

۱۹۴۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی آپ کی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رہیں ___ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن رہے، اسلامیہ کالج برائے خواتین کے اعزازی معتمد اور پروفیسر عربی رہے، اسلامیہ کالج کمیٹی اور انجمنِ حمایتِ اسلام کی جنرل کونسل کے کئی برس تک رکن رہے۔ ۱۹۵۰ء سے آپ بزمِ اقبال کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۵۷-۱۹۵۸ء میں آپ نے الندوۃ العالمیۃ الاسلامیۃ منعقدۂ لاہور کے ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیے۔ آپ لائڈن انسائی کلوپیڈیا کی ادارتی مجلس کے بھی رکن تھے اور اس کے مختلف جلسوں میں شریک ہونے کے لیے یورپ گئے۔ آپ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے ثقافتی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ایران گئے۔

دسمبر ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے مولوی محمد شفیع صاحب کی خدمات ایک بار پھر حاصل کرلیں اور آپ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی تدوین میں مصروف ہوگئے اور تادمِ واپسین پورے انہماک سے اس عظیم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لگے رہے۔

۱۹۴۲ء میں برطانوی حکومت نے آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۵۲ء میں آپ کو ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ ۱۹۵۳ء میں حکومتِ ایران نے آپ کو نشانِ علمی (درجۂ اوّل) اور ۱۹۵۹ء میں حکومتِ پاکستان نے ستارۂ پاکستان کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کی خدمات میں ایک ارمغانِ علمی پیش کیا گیا، جو مشرق و مغرب کے ممتاز علماء و فضلاء کے اکتالیس تحقیقی مقالات پر مشتمل تھا۔

ان کی تالیفات میں سے قابلِ ذکر کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) فہارس العقد الفرید لابن عبد ربّہ؛ (۲) میخانۂ عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، فارسی متن مع حواشی و فہارس؛ (۳) تتمہ صوان الحکمۃ لعلی زید البیہقی، متن عربی مع حواشی و فہارس؛ (۴) تتمہ صوان الحکمۃ، ترجمہ فارسی (درۃ الاخیار)؛ (۵) مطلع سعدین از کمال الدّین عبدالرزاق سمرقندی، متن فارسی مع حواشی و فرہنگ؛ (۶) مکاتبات رشیدی، متن فارسی و حواشی؛ (۷) وولنر کومیموریشن ووولیوم، تصحیح و ترتیب بزبان انگریزی؛ (۸) وامق و عذرا، عنصری کی ناپید مثنوی کے چند اوراق؛ (۹) مقالات دینی و علمی؛ (۱۰) ایک سو سے زیادہ مقالات اور نشری تقاریر۔ حسبِ ذیل کتابیں زیر ترتیب و تالیف تھیں: (۱) مطلع سعدین، جلد اوّل؛ (۲) مکاتبات رشیدی، ملخّص مع تعلیقات (انگریزی)؛ (۳) حاجی مراد از ٹالسٹائی (ترجمہ از انگریزی، طبع دوم)؛ (۴) قصّۂ اصحاب الاخدود (سریانی سے انگریزی میں ترجمہ)؛ (۵) کتاب الزہد از العقد الفرید (ترجمہ بزبان انگریزی)؛ (۶) میخانۂ عبدالنبی، طبع دوم۔

مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں پروفیسر محمد شفیع صاحب ''ہمارے دیرینہ کاروان فضائل کے وہ آخری فرد تھے جن کے لیے مجمع علوم کا لقب زیبا تھا''۔ ان کے تبحّر علمی، مؤرّخانہ ذوقِ تحقیق و تنقید، جزئیات پر گہری نظر، ناموری سے بے نیازی، کام کی سچی لگن، غیر معمولی محنت و ریاضت اور نظم و ضبط سے ہماری قدیم علمی روایات زندہ تھیں۔ ان کے اٹھ جانے سے ایک دَور، ایک روایت کا خاتمہ ہوگیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

(ادارہ)

رموز واختصارات

(ا)

کتبِ عربی وفارسی وترکی وغیرہ اوران کے تراجم اوربعض مخطوطات جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

آئین اکبری = ابوالفضل: آئین اکبری، Bibl. Indica.

آئین اکبری، ترجمہ = ترجمۂ آئین اکبری از بلخمن Blochmann (جلد اوّل) واز Jarrett (جلد ۲و۳)، Bibl. Indica.

آ ا = انسائیکلوپیڈیاآف اسلام، انگریزی، طبع اوّل یادوم، لائڈن.

ابن الأبّار = کتاب تَکْمِلَة الصِلَة، طبع کودیرا (F. Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۷-۱۸۸۹ء (BAH V-VI).

ابن الأبّار: تَکْمِلَة = M. Alarcóny C. A. González Palencia: *Apéndice a la adición Codera de Tecmiela* در *Misc. de estudios y textos árabes*، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الأبّار، جلد اوّل = ابن الأبّار: تَکْمِلَة الصِلَة، *texte arabe d'après un ms. de Fès, tome I, complétant les deux vol. édités par F. Codera* بتصحیح A. Bel ومحمد بن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الأثیر ایا ۲ یا ۳ یا ۴ = طبع اوّل، کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ (C. J. Tornberg)، لائڈن ۱۸۵۱-۱۸۷۶ء؛ طبع دوم وسوم، کتاب الکامل، طبع قاہرہ ۱۳۰۱ھ؛ ۱۳۰۳ھ؛ طبع چہارم، کتاب الکامل، طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلد.

ابن الأثیر، ترجمۂ فانیاں = *Annales du Maghreb et de l'Espagne*، ترجمہ از فانیاں (E. Fagnan)، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بَشْکُوال = کتاب الصِلة فی اخبار اَئِمّة الأَنْدَلُس، طبع کودیرا (F. Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH II).

ابن بطّوطہ = تحفة النُظّار الخ مع ترجمہ از C. Defrémery اور B. R. Sanguinetti، ۴ جلد، پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۸ء.

ابن تَغْرِی بِرْدِی = النُجُوم الزاهرة فی مُلوک مصر و القاهرة، طبع پوپر (W. Popper)، برکلے و لائڈن ۱۹۰۸-۱۹۳۶ء.

ابن تَغْرِی بِرْدِی؛ قاہرہ = وہی کتاب، طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ ببعد.

ابن حَوقَل = کتاب صُورَة الأَرض، طبع کرامرز (J. H. Karamers)، لائڈن ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء (BGA II, 2nd edition).

ابن خُرَّداذبِہ = المَسَالک و المَمَالِک، طبع ڈخویہ (M. J. de Goeje)، لائڈن ۱۸۸۹ء (BGA VI).

ابن خَلْدُون: عِبَر = کتاب العِبَر و دِیوان المُبتدأ والخَبَر الخ، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خَلْدُون: مقدّمة = *Prolégomènes d' Ibn Khaldoun*، طبع کاترمیئر (E. Quatremere)، پیرس ۱۸۵۸-۱۸۶۸ء (*Notices et Extraits XVI-XVIII*).

ابن خَلْدُون: مقدّمة، ترجمۂ دیسلان = *Prolègomènes d' Ibn Khaldoun*، ترجمہ وحواشی از دیسلان (M. de Slane)، پیرس ۱۸۶۳-۱۸۶۸ء (طبع ثانی ۱۹۳۴-۱۹۳۸ء).

ابن خَلْدُون: مقدّمة، ترجمۂ روزنتھال = *The Muqaddimah*، ترجمہ از Franz Rosenthal، ۳ جلد، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خَلِّکان = وَفَیَات الأَعْیان و اَنْبَاء اَبْنَاء الزَّمان، طبع وُسٹنفلڈ (F. Wustenfeld)، گوٹنگن ۱۸۳۵-۱۸۵۰ء (حوالے شمارِ تراجم کے اعتبار سے دیے گئے ہیں).

ابن خلّکان، بولاق = وہی کتاب، بولاق ۱۲۷۵ء.

ابن خلّکان، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلّکان، ترجمۂ دیسلان = *Biographical Dictionary*، ترجمہ از دیسلان (M. de Slane)، ۴ جلد، پیرس ۱۸۴۳-۱۸۷۱ء.

ابن رُسْتَہ = الأَعلاق النَفِیْسَة، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۹۱-۱۸۹۲ء (BGA VII).

ابن رُستَہ، ویت = *Les Atours précieux*، ترجمہ از G. Wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سَعْد = کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H. Sachau) وغیرہ، لائڈن ۱۹۰۴-۱۹۴۰ء.

ابن العِذارِی = کتاب البَیان المُغْرِب، طبع کولن (G. S. Colin) ولیوی پرووانسال E. Lévi-Provençal)، لائڈن ۱۹۴۸-۱۹۵۱ء، جلد سوم، طبع لیوی پرووانسال، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شَذَرات = شَذَرات الذَّهَب فِی أَخْبار من ذَهَب، قاہرہ ۱۳۵۰-۱۳۵۱ھ (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں).

ابن الفَقِیہ = مختصر کتاب البُلْدان، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۸۶ء (BGA V).

ابن قُتَیْبَہ: شِعر = کتاب الشِعْر و الشُعَراء، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۹۰۲-۱۹۰۴ء.

ابن قُتَیْبَہ: مَعارِف = کتاب المَعارِف، طبع وُسٹنفلڈ، گوٹنگن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام = کتاب سِیرة رسول اللّٰہ، طبع وُسٹنفلڈ، گوٹنگن ۱۸۵۸-۱۸۶۰ء.

ابوالفِداء: تقویم = تَقْوِیم البُلْدان، طبع رِینُو (J. T. Reinaud) ودیسلان (M. de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = *Géographie d'Aboulfeda traduite de l'arabe en français*، ج i و ii/۱ از ریِنو، پیرس ۱۸۴۸ء؛ ج ii/۲ از St. Guyard، ۱۸۸۳ء.

الإدْرِیسی: المُغْرِب = *Description de l'Afrique et de l' Espagne*، طبع ڈوزی (R. Dozy) وڈخویہ، لائڈن ۱۸۶۶ء.

الإدریسی، ترجمہ جوبار = *Géographie d' Edrisi*، ترجمہ از جوبار (P. A. Jaubert)، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶-۱۸۴۰ء.

الإسْتِیعاب = ابن عبدالبرّ: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد ۱۳۱۸-۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن دُرید: الاشتقاق، طبع وُسٹِنْفِلْڈ، گوٹنگن ۱۸۵۴ء (طبع اناستاتیک).

الإصابة = ابن حجر العسقلانی: الإصابة، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶-۱۸۷۳ء.

الإصْطَخْرِی = المَسالِک و المَمالک، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۷۰ء (BGA I) اور طبع دوم (نقل طبع اوّل) ۱۹۲۷ء.

الأغانی ۱ یا ۲ یا ۳ = ابوالفَرَج الإصفہانی: الأغانی، طبع اوّل، بولاق ۱۲۸۵ھ؛ طبع دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ؛ طبع سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد (طباعت جاری).

الأغانی، برونّو = کتاب الأغانی کی اکیسویں جلد، طبع برونّو (R. E. Brunnow)، لائڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ.

الأنباری: نُزْهَة = نُزْهَة الألِبّاء فی طَبَقات الأُدَباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

بادشاہ نامہ = عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، Bibl. Indica.

بدایُونی = مُنْتَخَب التَواریخ، Bibl. Indica.

برنی = ضیاء برنی: تاریخ فیروز شاهی، Bibl. Indica.

البغدادی: الفَرْق = الفَرْق بین الفِرَق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البَلاذُری: أنْساب = أنساب الأشْراف، ج ۴ و ۵، طبع شلو ر سِنگَر (M. Schlossinger) و گُوئاٹین (S. D. F. Goitien)، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶-۱۹۳۸ء.

البَلاذُری: أنساب، ج ۱ = أنساب الأشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ مخطوطۂ جدیدۂ من أنساب الأشراف، در مجلّۂ معهد المخطوطات العربیة، ج ۶، ۱۹۶۰ء (زیادات از نسخۂ رباط و معارضہ دو مخطوطہ و تصحیحات).

البَلاذُری: فُتُوح = فُتُوح البُلْدان، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۶۶ء.

بَیْهَقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تأریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمّة = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمّة صوان الحکمة، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl. Indica.

تاج العروس = محمد مرتضٰی بن محمد الزَّبیدی: تاج العروس.

تأریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تأریخ بغداد، ۱۴ مجلدات، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.

تأریخ دِمَشق = ابن عساکر: تأریخ دمشق، ۷ جلد، دمشق ۱۳۲۹-۱۳۵۱ھ/۱۹۱۱-۱۹۳۱ء.

تأریخ العراق = عبّاس العزّاوی، تأریخ العراق، ۵ جلد، بغداد ۱۹۳۹-۱۹۵۴ء.

تاریخ گُزیدہ = حَمْد اللہ مُسْتَوفی القزوینی: تاریخ گزیدہ، طبع فاکسمیل از براؤن (E. G. Browne)، لائڈن ولنڈن ۱۹۱۰ء.

تہذیب = ابن حَجَر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ مجلدات، حیدرآباد ۱۳۲۵-۱۳۲۷ھ/۱۹۰۷-۱۹۰۹ء.

توزک جہانگیری = طبع سیّد احمد خان، علی گڑھ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء.

الثعالبی: یَتِیمة = یَتِیمَة الدَهْر فی مَحاسِن اهل العَصْر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمة، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جُوینی = تاریخ جہان گُشای، طبع محمد قَزوِینی، لائڈن ۱۹۰۶-۱۹۳۷ء (GMS XVI).

جُوینی، ترجمہ بوائل = *The History of the World-conqueror*، ترجمہ از بوائل (J. A. Boyle)، ۲ جلد، مانچسٹر ۱۹۵۸ء.

حاجی خلیفہ: جِہان نُما = استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کَشْفُ الظُنُون، طبع محمد شرف الدین یالْتقایا (S. Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Kilisli Rifat Bilge)، استانبول ۱۹۴۱-۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کَشْفُ الظُنُون، نشر فلوگل (Gustavus Flügel)، لائپزگ ۱۸۳۵-۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلد، استانبول ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ.

حُدود العالَم = *The Regions of the World*، ترجمہ از مِنَوَرسْکی (V. Minorsky)، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS N.S. XI).

حمد اللہ مُسْتَوفی: نُزْهَة = نُزْهَة القُلُوب، طبع لیسٹرینج، لائڈن ۱۹۱۳-۱۹۱۹ء (GMS XXIII).

خافی خان = خافی خان: منتخب اللباب، Bibl. Indica.

خواند امیر = حَبِیب السِیَر، (۱) تہران ۱۲۷۱ھ [(۲) بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء].

الدرر الکامنة = ابن حجر العسقلانی: الدُّرَر الکامنة، حیدرآباد ۱۳۴۸-۱۳۵۰ھ.

دستور الوزراء = غیاث الدین بن ہمام الدین معروف بخواند امیر: دستور الوُزَراء، طبع سعید نفیسی، تہران ۱۳۱۷ھ.

الدَمِیرِی = حیوة الحَیَوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = تذکرة الشعراء، طبع براؤن، لنڈن ولائڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حُفّاظ = الذَّہبی: تذکرة الحُفّاظ، ۴ جلد، حیدرآباد ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنّات = محمد باقر خوانساری: رَوضات الجنّات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ از محمد حسن وحسن احمد محمود، ۲ جلد، قاہرہ ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء.

زبدة = حافظ ابرو: زُبدة التواریخ، فقط وہ حصّہ جو زبدة التواریخ بایسُنغُری کہلاتا ہے، جلد ۴، جملہ ۱، از ۷۶۳-۸۰۷ھ، نسخۂ کتاب خانۂ فاتح استانبول (اس نسخے کے کوائف کے لیے رک بہ Felix Tauer: *Les Manus-crits Persans, Historiques des Bibliotheques des Stanboul, No. 38*، نقل مائیکرو فلمی در کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب.

السُبکی = طبقات الشافعیة، ۶ مجلدات، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سِجِلِّ عُثمانی = محمد ثریا: سِجِلِّ عثمانی، استانبول ۱۳۰۸-۱۳۱۶ھ.

سَرکیس = سرکیس: مُعجم المطبوعات العربیة، قاہرہ ۱۹۲۸-۱۹۳۱ھ.

السَمعانی = السَمعانی: الأنساب، طبع عکسی باعتناء مرجلیوث (D. S. Margo-liouth)، لائڈن ۱۹۱۲ء (GMS XX).

السُیُوطی: بُغیَة = بُغیَة الوُعاة، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشَہرَستانی = المِلَل والنِحَل، طبع کیورٹن (W. Cureton) لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضَبّی = بُغیَة المُلتَمِس فی تأریخ رجال اهل الأنْدَلُس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرہ (J. Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۵ء (BAH III).

الضّوء اللّامع = السّخاوی: الضّوء اللّامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳-۱۳۵۵ھ.

الطَّبَری = تأریخ الرُسُل والمُلُوک، طبع ڈخویہ وغیرہ، لائڈن ۱۸۷۹-۱۹۰۱ء.

طبقات اکبری = نظام الدین احمد بن محمد مقیم ہروی، Bibl. Indica.

طبقات ناصری ۱ و ۲ = منہاج سراج جُوزِجانی: طبقات ناصری، (۱) Bibl. Indica؛ (۲) طبع آقای عبدالحی حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء ولاہور ۱۹۵۴ء، ۲ جلد.

عثمانلی مؤلّفلری = بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلّفلری، استانبول ۱۳۳۳ھ.

عَفِیف = شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاهی، Bibl. Indica.

العِقْد الفَرید = ابن عبد ربّہ: العِقْد الفَرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ وطباعات دیگر، حسب تصریح در حوالہ.

علی جَوَاد = ممالک عثمانییّن تاریخ و جغرافیا لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵-۱۸۹۹ء.

عمل صالح = محمد صالح کنبو: عمل صالح، Bibl. Indica.

عُنصُری = دیوان حکیم عنصری، تہران، بلا تاریخ.

عُنصُری ۲ = دیوان حکیم عنصری، تہران ۱۳۶۳ش.

عوفی: لُباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن ولائڈن ۱۹۰۳-۱۹۰۶ء.

عیون الأنباء = طبع مُلّر (A. Müller)، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور، مفتی: خزینة الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ھ.

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار؛ ترجمۂ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرخی = دیوان حکیم فرخی سیستانی، تصحیح عبدالرسولی، تہران آبان ۱۲۱۱ش.

فِرِشتہ = محمد قاسم فِرِشتہ: گلشن ابراهیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲ء.

فرهنگ = فرهنگ جغرافیای ایران، از انتشارات دائرہ جغرافیای ستاد ارتش ۱۳۲۸-۱۳۲۹ش.

فرهنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرهنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹-۱۸۹۴ء.

فقیر محمد = حدائق الحنفیة، لکھنؤ ۱۹۰۶ء.

فلٹن ولنگز = Alexander S. Fulton and Matrin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic Printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.

فہرست = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱-۱۸۷۲ء.

ابن القِفطی = تأریخ الحکماء، نشر لپّرٹ (J. Lippert)، لائپزگ ۱۹۰۳ء.

الکُتُبی: فوات = ابن شاکر الکُتُبی: فَوات الوَفَیات، بولاق ۱۲۹۹ھ.

کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی: مطلع، ادرنہ = مطلع سعدین، نسخۂ جامع سلیمیہ، ادرنہ، نقل مائیکرو فلمی در کتاب خانۂ محمد شفیع لاہوری.

گُزیدہ = تأریخ گُزیدہ.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلد، قاہرہ ۱۳۰۰-۱۳۰۸ھ.

مآثر الأُمَراء = شاہنواز خان: مآثر الأُمَراء، Bibl. Indica.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ.

محمد حسین: مخزن الادویة، مع تحفة المؤمنین، شاہدرہ دلہائی ۱۲۷۸ھ.

مرآة احمدی = علی محمد خان: مرآة احمدی، کلکتہ ۱۹۳۰ء.

مرآة الجنان = الیافعی: مرآة الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد ۱۳۳۹ھ.

مرآة الزمان = سبط ابن الجوزی: مرآة الزمان، حیدرآباد ۱۹۵۱ء.

مسعود کیہان = جغرافیای مفصّل ایران، ۲ جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ش.

مَسعُودی: مُرُوج = مُرُوج الذهب، طبع باربیہ دینار و پاوہ دکُورتَی، پیرس ۱۸۶۱-۱۸۷۷ء.

مَسعُودی: التنبیہ = کتاب التَنبِیہ و الإشراف، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۹۴ء (BGA VIII).

مطلع (سمرقندی) = کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی: مطلع سعدین، جلد ۱ و ۲،

طبع لاہور ۱۹۴۱-۱۹۴۹ء.
مطلع، کیمبرج = وہی کتاب، نسخۂ کرائسٹ کالج کیمبرج، نقل فوٹوسٹیٹ، در کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب.
المَقْدِسی = احسن التَقَاسِیم فی معرفة الأقالیم، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۷۷ء (BGA III).
المَقَّرِی: *Analectes* = نَفْح الطِّیب فِی غُصْن الأنْدَلُس الرَّطِیْب، *Analectes sur l'histoire et la littérature des Arabs de l' Espagne*، لائڈن ۱۸۵۵-۱۸۶۱ء.
المَقَّرِی، بولاق = وہی کتاب، بولاق ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء.
مُنَجِّم باشی = صحائف الأخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.
میر خواند = روضة الصَّفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۴۹ء.
نُزهة الخواطِر = حکیم عبدالحی: نزهة الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء (طباعت جاری).
نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پرووانسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.
نظام شامی = نظام الدین شامی: ظفر نامہ، جلد اوّل، طبع فیلکس تاور (Felix Tauer)، بیروت ۱۹۳۷ء.
الوافی = الصَفَدی: الوافی بالوَفیات، ج ۱، طبع رِٹّر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.
الہَمْدانی = صفة جَزِیرة العَرَب، طبع مُلّر (D. H. Müller)، لائڈن ۱۸۸۴-۱۸۹۱ء.
یاقوت = مُعْجَم البُلْدان، طبع وُسٹِنْفِلْڈ، لائپزگ ۱۸۶۶-۱۸۷۳ء (طبع انا ستاتیک، ۱۹۲۴ء).
یاقوت: إرشاد (یا ادباء) = ارشاد الأرِیب الی مَعْرِفة الأدِیب، طبع مرجلیوث، لائڈن ۱۹۰۷-۱۹۲۷ء (GMS VI)؛ معجم الادباء (طبع انا ستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶-۱۹۳۸ء.
یعقوبی = تأریخ، طبع ہوتسما (M. Th. Houtsma)، لائڈن ۱۸۸۳ء.
یعقوبی: بُلْدان = طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۹۲ء (BGA VII).
یعقوبی، ویت = Ya'qūbī, Les Pays، ترجمہ از G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

زیادات

س ی ب، ۶۰ = *The Statesman's Year-Book 1960*, London 1960.
شفیعیہ = (مخطوطات) کتابخانۂ محمد شفیع لاہوری.
وِٹکر، ۶۱ = Whitaker — 1961, London 1961.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمن، جدید ترکی وغیرہ جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghāni, *Tables*=*Tables alphabétiques du Kitāb al-aghāni,* rédigées par I. Guidi, Leiden 1900.

Babinger = F. Babinger, *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st. ed., Leiden 1927.

Barkan, *Kanunlar* = Ömer Lûtfi Barkan: *XV ve XVI inci Asırlarda Osmanlı Imparatorluğunda Ziraî Ekonominin Hukukî ve Malî Esaxları*, *I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Barthold, *Turkestan* = W. Barthold, *Turkestan down to the Mongol Invasion*, London 1928 (GMS, N. S. V.).

Barthold, *Turkestan*^{2} = the same, 2nd edition, London 1958.

Blachère, *Litt.* = R. Blachère, *Histoire de la Littérature arabe*, i, Paris 1952.

Brockelmann, I, II = C. Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Litteratur*, Zweite den Supplement-bänden angepasste Auflage, Leiden 1943-1949.

Brockelmann, S I, II, III = *G. D. A. L.*, Erster (Zweiter, Dritter). Supplement-band, Leiden 1937-42.

Browne, i = E. G. Browne, *A Literary History of Persia, from the earliest times until Firdawsi*, London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sa'di*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literature under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani, *Annali* = L. Caetani, *Annali dell'Islam*, Milano 1905-26.

Chauvin, *Bibliographie*=V. Chauvin, *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn, *Quellen*=B. Dorn, *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der südlichen Küstenländer des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy, *Notices* = R. Dozy, *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51.

Dozy, *Recherches*^{3} = *Recherches sur l'histoire et la littérature de l' Espagne Pendant le moyen-âge*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.* = R. Dozy, *Supplément aux dictionnaires arabes*, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan, *Extraits* = E. Fagnan, *Extraits inédits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. des Qor. = Th. Nöldeke, *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergstr ässer and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb, *Ottoman Poetry* = E. J. W. Gibb, *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen = H. A. R. Gibb and Harold Bowen, *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher, *Muh. St.* = I. Goldzher, *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90.

Goldziher, *Vorlesungen* = I. Goldziher, *Vorlesungen über den Islam,* Heidelberg 1910.

Goldziher, *Vorlesungen*^{2} = 2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher, *Dogme* = *Le dogme et la loi de l'islam*, trad. J. Arin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall, *GOR* = J. von Hammer (-Purgstall), *Geschichte des Osmanischen Reiches,* Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall, *GOR*^{2} = the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall, *Histoire* = the same, trans by J. J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.), 1835-43.

Hammer-Purgstall, *Staatsverfassung* = J. von Hammer, *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*, 2 vols., Vienna 1815.

Houtsma, *Recueil* = M. Th. Houtsma, *Recueil des textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*, Leiden 1886-1902.

Juynboll, *Handbuch* = Th. W. Juynboll: *Handbuch des islámischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll, *Handleiding* = *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane = E. W. Lane, *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole, *Cat.* = S. Lane-Poole, *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix, Cat. = H. Lavoix, *Catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange = G. Le Strange, *The Lands of the Eastern Caliphate*, 2nd ed., Cambridge 1930.

Le Strange, *Baghdad* = G. Le Strange, *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange, *Palestine* = G. Le Strange, *Palestine under the Moslems*, London 1890.

Lévi-Provençal, *Hist. Esp. Mus.* = E. Lévi-Provençal, *Histoire de l' Espagne musulmane*, nouv. éd., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Lévi-Provençal, *Hist. Chorfa* = E. Lévi-Provençal, *Les Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet, *Matériaux* = J. Maspéro et G. Wiet, *Matériaux pour servir à la Géographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (*MIFAO XXXVI*).

Mayer, *Architects* = L. A. Mayer, *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer, *Astrolabists* = L. A. Mayer, *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1958.

Mayer, *Metalworkers* = L. A. Mayer: *Islamic metalworkers and their Works*, Geneva 1959.

Mayer, *Woodcarvers* = L. A. Mayer, *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez, *Renaissance* = A. Mez, *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922; Spanish translation by S. Vila, Madrid-Granada 1936.

Mez, *Renaissance*, Eng. tr. = A. Mez, *The Renaissance of Islam*, Translated into English by Salahuddin Khuda Bukhsh and D. S. Margoliouth, London 1937.

Nallino, *Scritti* = C. A. Nallino, *Raccolta di Scritti editi e inediti*, Rome 1939-48.

Pakalin=Mehmet Zeki Pakalin, *Osmanlî Tarih seyimleri ve Terimleri Sözlügü*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa = *Realenzyklopaedie des klassischen Altertums*.

Pearson = J. D. Pearson, *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues = *Ensayo bio-bibliográfico sobre los historiadores y geógrafos arábigo-españoles*, Madrid 1898.

Santillana, *Istituzioni* = D. Santillana, *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Rome 1926-38.

Schlimmer = John L. Schlimmer, *Terminologie medico-Pharmacéutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz, *Iran* = P. Schwarz, *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith = W. Smith, *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*, London 1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.* = C. Snouck Hurgronje, *Verspreide Geschriften*, Bonn-Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources inéd. = Henri de Castries, *Sources inédites de l'histoire du Maroc*, Paris 1905-; 2nd Series, Paris 1922.

Spular, *Horde* = B. Spuler, *Die Goldene Horde*, Leipzig 1943

Spuler, *Iran* = B. Spuler, *Iran in früh-islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spular, *Mongolen*^{2} = B. Spuler, *Die Mongolen in Iran*, 2nd ed. Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart, *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization* , Djambatan- Amsterdam 1959.

Storey = C. A. Storey: *Persian Literature*: *a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed. by A.U. Pope, Oxford 1938.

Suter = H. Suter, *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke,* Leipzig 1900.

Taeschner, *Wegenetz* = F. Taeschner, *Die Verkehrslage und das Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek = W. Tomaschek, *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wiel, *Chalifen* = G. Weil, *Geschichte der Chalifen*, Mannheim-Stuttgart 1846-82.

Wensinck, *Handbook* = A. J. Wensinck, *A Handbook of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Zambaur = E. de Zambaur, *Manuel de généalogie et de chronologie pour I'histoire de l'Islam*, Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen = J. Zinkeisen, *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad, *The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahabad 1948 (?).

(ج)

مجلّات، سلسلہ ہائے کتب[1] وغیرہ جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB = *Archives Berbères.*

Abh. G. W. Gött. = *Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Göttingen.*

Abh. K. M. = *Abhandlungen f. d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. Ak. W. = *Abhandlungen d. preuss. Akad. d. Wiss.*

Afr. Fr. = *Bulletin du Comité de l'Afrique française.*

Afr. Fr. RC = *Bulletin du Com. de l'Afr. franç., Renseignements Coloniaux.*

AIÉO Alger = *Annales de l'Instituté d' Études Orientales de l'Université d' Alger.*

AIUON = *Annali dell' Instituto Univ. Orient. di Napoli.*

AM = *Archives marocaines.*

And. = *Al-Andalus.*

Anth. = *Anthropos.*

Anz. Wien = *Anzeiger der philos.-histor. Kl. d. Ak. der Wiss. Wien.*

AO = *Acta Orientalia.*

Arab. = *Arabica*

ArO = *Archiv Orientální*

ARW = *Archiv für Religionswissenschaft.*

ASI = *Archaelogical Survey of India.*

ASI, NIS = the same, New Imperial Series.

ASI, AR = the same, Annual Reports

AÜDTCFD = *Ankara Universitesi Dil ve Tarih-Coğrafia Fakültesi Dergisi.*

As. Fr. B. = *Bulletin du Comité de l' Asie Française.*

BAH = Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR = *Bulletin of the American School of Oriental Research.*

Bell. = *Türk Tarih Kurumu Belleten.*

B Fac. Ar. = *Bulletin of the Faculty of Arts of the Egyptian University.*

BÉt. Or. = *Bulletin d' Études Orientales de l'Institut Français de Damas.*

BGA = Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE = *Bulletin de l' Institut Egyptien.*

BIFAO = *Bulletin de l'Institut Français d' Arachéologie Orientale du Caire.*

BIS = Bibliotheca Indica series.

BRAH = *Boletín de la Real Academia de la Historia de España.*

BSE = *Bol'shaya Sovetskaya Éntsiklopediya* (Large Soviet Encyclopaedia) Ist ed.

BSE[2] = the Same, 2nd ed.

BSL(P) = *Bulletin de la Société de Linguistique de Paris.*

BSO(A)S = *Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.*

BTLV = *Bijdragen tot de Taal-, Land-en Volkenkunde (van Ned.-Indië).*

BZ = *Byzantinische Zeitschrift.*

COC = *Cahiers de l' Orient contemporain.*

CT = *Cahiers de Tunisie.*

EI[I] = *Encyclopaedia of Islam,* 1st edition.

EI[II] = *Encyclopaedia of Islam,* 2nd edition.

EIM = *Epigraphia Indo-Moslemica.*

ERE = *Encyclopaedia of Religion and Ethics.*

GGA = *Göttinger Gelehrte Anzeigen.*

GJ = *Geographical Journal.*

G M S = Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph. = *Grundriss der Iranischen Philologie.*

GSAI = *Giornale della Soc. Asiatica Italiana.*

Hesp. = *Hespéris.*

IA = *Islâm Ansiklopedisi.*

IBLA = *Revue de l'Institut des Belles Lettres Arabes,* Tunis.

IC = *Islamic Culture.*

IFD = *Ilahiyat Fakültesi Dergesi.*

IG = *Indische Gids.*

IHQ = *Indian Historical Quarterly.*

IQ = *The Islamic Quarterly.*

IRM = *International Review of Missions.*

Isl. = *Der Islam.*

JA = *Journal Asiatique.*

J. Afr. S. = *Journal of the African Society.*

JAOS = *Journal of the American Oriental Society.*

J Anthr. I = *Journal of the Anthropological Institute.*

JBBRAS = *Journal of the Bombay Branch of the Royal*

(۱) انھیں رومن حروف میں لکھا گیا ہے۔

Asiatic Society.

JE. = *Jewish Encyclopaedia.*

JESHO = *Journal of the Economic and Social History of the Orient.*

JNES = *Journal of Near Eastern Studies.*

J PAK. H. S. = *Journal of the Pakistan Historical Society.*

JPHS = *Journal of the Punjab Historical Society.*

JQR = *Jewish Quarterly Review.*

JRAS = *Journal of the Royal Asiatic Society.*

J(R) ASB = *Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.*

J(R) Num. S = *Journal of the (Royal) Numismatic Society.*

JRGeog. S = *Journal of the Royal Geographical Society.*

JSFO = *Journal de la Société Finno-ougriene.*

JSS = *Journal of Semetic Studies.*

KCA = *Körösi Csoma Archivum.*

KS = *Keleti Szemle* (Revue Orientale).

KSIE = *Kratkie Soobs̲hčeniy̲a Instituta Étnografiy* (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE = *Literaturnay̲a Énts̲iklopediy̲a* (Literary Encyclopaedia).

Mash. = *Al-Mashriḳ.*

MDOG = *Mitteilungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.*

MDPV = *Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palästina-Vereins.*

MEA = *Middle Eastern Affairs.*

MEJ = *Middle East Journal.*

MFOB = *Mélanges de la Faculté Orientale de Beyrouth.*

MGG Wien = *Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.*

MGMN = *Mitt. z. Geschichte der Medizin und der Naturwissenschaften.*

MGWJ = *Monatsschrift. f. d. Geschichte u. Wissenschaft des Judentums.*

MI = *Mir Islama.*

MIDEO = *Mélanges de l'Institut Dominicain d' Études Orintales du Caire.*

MIE = *Mémoires de l'Institut d' Egyptien.*

MIFAO = *Mémoires publiés par les membres de l'Inst. Franç. d' Arachéologie Orientale du Caire.*

MVAG = *Mitteilungen der Vorderasiatisch-ägyptischen Gesellschaft.*

MMAF = *Mémoires de la Mission Archéologique Franç. au Caire .*

MMIA = *Mad̲jallat al-Mad̲jma' al-'ilmi al-'Arabi*, Damascus.

MO = *Le Monde oriental.*

MOG = *Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.*

MSE = *Malay̲a Sovetskay̲a Énts̲iklopediy̲a* - (Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO = *Mémoires de la Société Finno-ougrienne.*

MSL = *Mémoires de la Société Linguistique de Paris.*

MSOS Afr. = *Mitteilungen des Sem. für oriental. Sprachen, Afr. Studien.*

MSOS As. = *Mitteilungen des Sem. für oriental. Sprachen, Westasiat. Studien.*

MTM = *Milī Taebbü'ler Med̲jmü'asi.*

MW = *The Muslim World.*

NC = *Numismatic Chronicle.*

NGW Gött. = *Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Göttingen.*

OA = *Orientalisches Archiv.*

OC = *Oriens Christianus.*

OCM = *Oriental College Magazine,* Lahore.

OCMD = *Oriental College Magazine, Ḍamima,* Lahore.

OLZ = *Orientalistische Literaturzeitung.*

OM = *Oriente Moderno.*

Or. = *Oriens.*

PEFQS = *Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.*

PELOV = *Publications de l'École des langues orientales vivantes.*

Pet.Mitt. = *Petermanns Mitteilungen.*

PRGS = *Proceedings of the R. Geographical Society.*

QDAP = *Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.*

RAfr. = *Revue Africaine.*

RCEA = *Répertoire Chronologique d'Épigraphie arabe.*

REI = *Revue des Études Islamiques.*

REJ = *Revue des Études Juives.*

Rend. Lin. = *Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.*

RHR = *Revue de l' Histoire des Religions.*

RI = *Revue Indigène.*

RIMA = *Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.*

RMM = *Revue du Monde Musulman.*

RO = *Rocznik Orientalistyczny.*

ROC = *Revue de l' Orient Chrétien.*

ROL = *Revue de l' Orient Latin.*

RRAH = *Rev. de la R. Academia de la Histoira,* Madrid.

RSO = *Rivista degli Studi Orientali.*

RT = *Revue Tunisienne.*

SBAK. Heid. = *Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Heidelberg.*

SBAK. Wien = *Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Wien.*

SBBayr. Ak. = *Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.*

SBPMS Erlg. = *Sitzungsberichte d. Phys.-medizin. Sozietät in Erlangen.*

SBPr. Ak. W.=*Sitzungsberichte der preuss. Ak. der Wiss. zu Berlin.*

SE = *Sovetskaya Étnografiya* (Soviet Ethnography).

SI = *Studia Islamica.*

SO = *Sovetskoe Vostokovedenie* (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= *Studia Islamica.*

S.Ya. = *Sovetskoe Yazĭkoznanie* (Soviet Linguistics).

TBG = *Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.*

TD = *Tarih Dergisi.*

TIE = *Trudĭ instituta Étnografiy* (Works of the Institute of Ethnography).

TM = *Türkiyat Mecmuasĭ.*

TOEM = *Ta'rīkh-i 'Othmānī* (*Türk Tarīkhī*) *Endjümeni medjmūʿasĭ.*

TTLV = *Tijdschrift v. Indische Taal-, Land- en Volkenkunde.*

Verh. Ak. Amst. = *Verhandelingen der Koninklijke Akademie van Westenschappen te Amsterdam.*

Versl. Med. Ak. Amst. = *Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van Wetenschappen te Amsterdam.*

VI = *Voprosĭ Istoriy* (Historical problems).

WI = *Die Welt des Islams.*

WI, NS. = the same, New Series.

Wiss. Veröff. DOG = Wissenschaftliche Veröffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG = *World Muslim Gazetteer*, Karachi.

WZKM = *Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes.*

ZA = *Zeitschrift für Assyriologie.*

Zap. = *Zapiski.*

ZATW = *Zeitschrift für die alttestamentliche Wissenschaft.*

ZDMG = *Zeitschrift der Deutschen Morgenländischen Gesellschaft.*

ZDPV = *Zeitschrift de Deutschen Palästinavereins.*

ZGErdk. Berl. = *Zeitschrift der Gesellschaft für Erdkunde in Berlin.*

ZK = *Zeitschrift für Kolonialsprachen.*

ZOEG = *Zeitschrift f. Osteuropäische Geschichte.*

ZS = *Zeitschrift für Semitistik.*

(د)

بعض علامات جو اکثر اس کتاب میں آئی ہیں

✱	= نئے مقالے کا آغاز (از ۴:۳۸۵)	ح	= Ḥ
⊗	= جدید مقالہ از ادارہ (از ۴:۹۲۵)	خ	= KH
[ ]	= اضافہ از ادارۂ دائرۂ معارفِ اسلامیہ (اردو)	ذ	= DH
[ ]	= اضافہ در انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی)	ز	= Z
⊸	= نشان منازِل راہ آہن وغیرہ	ژ	= ZH (or Ž)
<	= مبدّل بہ	ش	= SH (or Ch)
ببعد	= f.، ff.، sq.، sqq.	ص	= Ṣ
بذیلِ مادّۂ فلاں یا کلمۂ فلاں	= s.v.	ض	= Ḍ
رک بآن (= رجوع کُنید بآن)	= q.v.	ط	= Ṭ
قب (قارِب یا قابِل)	= cf.	ظ	= Ẓ
کتاب مذکور	= op. cit.	ع	= ʿ
م	= متوفّی	غ	= GH
محلِّ مذکور	= loc. cit.	ق	= Ḳ
وہی کتاب	= ibid.	ـَـ	e کی آواز ظاہر کرتی ہے، مثلاً بِل (Bell)
ھ	= ہجری	ـُـ	o کی آواز ظاہر کرتی ہے، مثلاً مُول (mole)
ء	= عیسوی یا (میلادی)	ـْـ	علامتِ سکون یا جزم
۱، ۲، ۳	= کتاب طبعِ اوّل، دوم، سوم	ـٗـ	(ترکی یا جرمن الفاظ میں کسی حرف یا ضمّے کے اوپر) ü، کی آواز ظاہر کرتی ہے، مثلاً تورک (Türk)؛ گُل (Gül)
ء	= ’	ـ٘ـ	ö کی آواز ظاہر کرتی ہے، مثلاً کول (Köl)
ث	= TH	ـٰـ	(کسی حرف یا فتحے کے اوپر) ä کی آواز ظاہر کرتی ہے، مثلاً اَرَجَب (ärädjäb)؛ رَجَب (rädjäb)
ج	= DJ		
چ	= Č		

ا

* **آئین** : [بہت پرانا] فارسی لفظ ہے [جو عہدِ عبّاسی میں عام طور پر مستعمل تھا] بمعنی قانون، رسم یا معمول و دستور۔ ان تصانیف کے ذیل میں جو دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابن المُقفّع نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیں الفہرست (ص ۱۱۸) میں ایک کتاب آئین نامہ کا بھی ذکر آیا ہے (اس عنوان کا ترجمہ بعض اوقات عربی میں کتابُ الرُّسوم کیا گیا ہے)۔ خدای نامہ کی طرح یہ کتاب بھی نیم سرکاری حیثیت رکھتی تھی اور اس میں، بظنِ غالب، ساسانی حکومت کی ترتیب و تنظیم کے علاوہ بالاتر طبقات کے امتیازات اور حقوقِ خصوصی کا ذکر بھی تھا اور درباری زندگی اور درباری آداب و رسوم کی تفصیل بھی دی تھی چنانچہ اسی لیے کرسٹن سن (Christensen) نے اسے ''قدیم شاہی تقویم'' (Le vieil almanach royal) کا نام دیا ہے۔ اس کے بیشتر مضامین حکمت آموز اور نصیحت آمیز تھے۔ ابن قُتیبہ کی تصنیف عُیون الاخبار میں آئین نامے کے مذکورۂ بالا [عربی] ترجمے کے چند اقتباسات محفوظ ہیں اور انوشتر انشیف (Inostranzev) نے ان کے اہمّ ترین حصّے کا گہرا مطالعہ کیا ہے، جو فنونِ حرب، تیراندازی اور چوگان بازی سے متعلّق ہے۔ ممکن ہے کہ ضخیم سرکاری آئین نامہ کے پہلو بہ پہلو خصوصی موضوعوں کے مختصر تر رسائل بھی موجود ہوں، جن میں درباری زندگی کی تعلیم و تربیّت کے ہر پہلو پر الگ الگ بحث کی گئی ہو۔ یہ گمان چند اَور کتابوں کے نام پڑھ کر ہوتا ہے، جو فہرست میں مذکور ہیں، مثلاً آئین الرَّمی اور آئین الضَّرب بالصَوَالِجَة، گو یہ بھی تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ یہ بڑے آئین نامہ کے بعض اجزا یا اقتباسات ہی ہوں۔ ساسانی آئین نامہ کا المسعودی نے (تَنبِیہ، ص ۱۰۴ - ۱۰۶ میں) بھی ذکر کیا ہے (جعلی؟)۔ جاحظ کی کتاب التاج فی اخلاق الملوک میں، جہاں ساسانیوں کے آئین و آداب کے متعلّق پوری تفصیلات ملتی ہیں، ایک کتاب آئین الفرس کا بھی ذکر آیا ہے، گو اس سے براہِ راست کوئی اقتباس نقل نہیں کیا گیا۔ 'آئین' کا نام بعد کے زمانے میں فارسی کی دیگر تصانیف کو بھی دیا گیا ہے، جن کا موضوع اسلامی تاریخ اور اسلامی [دستور و] معمولات ہے، مثلاً ابو الفضل علّامی [رک بآن] (سولھویں صدی) کے اکبرنامہ کے اس حصّے کا نام جس میں دربارِ اکبری کے آداب و رسوم کا بیان ہے آئین اکبری ہے۔

[لیکن اسلامی دستور کی تحریری تشریح شہنشاہ اکبر کے دَور سے نہیں شروع ہوئی۔ خود الماوردی الشافعی کی الاحکامُ السلطانیّة اور ان کے ہم عصر ابویَعْلی الفرّاء الحنبلی کی ہم نام کتاب (الاحکام السلطانیّة) بھی پانچویں صدی ہجری کی اور بہت متأخّر مثالیں ہیں۔ اوّلین اسلامی دستور خود بعہدِ نبوی ۱ھ میں آپؐ کی مدینے میں آمد پر مرتّب ہو کر نافذ ہوا۔ کسی حکمران کی طرف سے مرتّب اور نافذ شدہ ''تحریری دستور'' کی دنیا میں اوّلیں مثال یہی ہے۔ (ارسطو کا دستور آتینہ (Athens) ملتا ہے لیکن یہ حکمران کی طرف سے نافذ کردہ آئین نہیں، بلکہ ایک مؤرّخ کے مشاہدات اور دستوری رواجات کے متعلّق مؤلّف کی تشریح پر مشتمل ہے)۔ خوش قسمتی سے عہدِ نبویؐ کے مذکورۂ صدر دستور کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔

اس کا متن ابن اسحٰق، ابن خُیثَمہ اور ابوعُبید کی روایت سے مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ باوَن دفعات کے اس دستورِ مملکت میں ایک مستقل سیاسی ''اُمّت'' ("اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِنْ دُوْنِ النَّاس") کے قیام کا ذکر ہے، جو مسلم اور غیر مسلم رعایا پر مشتمل تھی۔ پھر راعی اور رعایا کے حقوق و فرائض، عدل گستری، قانون سازی، بیرونی علاقوں سے صلح اور جنگ، مذہبی آزادی، غیر مسلم رعایا کے حقوق و خصوصیّات، مَعاقِل (سماجی بیمہ) اور ان تمام مسائل کے متعلّق احکام ہیں جن کی اُس زمانے میں شہری اِیالتِ مدینہ کو ضرورت تھی۔ عدل گستری میں یہ انقلاب آفرین حکم بھی نظر آتا ہے کہ حاکمِ عدالت کا کام محض اظہارِ حقّ نہیں بلکہ نَفاذِ حقّ بھی ہے اور حق دلانا افراد کا نہیں بلکہ مرکزی اقتدار کا کام ہے۔ قانون سازی میں بجائے رواجات اور پنچوں کی رائے زنی کے مرکزی شارع کو ہر امر کے متعلّق (''مَهْمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ'') قانون سازی اور حکم دہی کا مجاز و مقتدر قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ حال میں اسلامی مملکتوں کے تحریری دستوروں کا آغاز ترکی سلاطین سے ہوتا ہے۔ سیاسی زیردستی سے ذہنی زیردستی پیدا ہونے کے باعث بعض اسلامی ممالک میں مغربی اصول کے دستور مرتّب اور نافذ ہوئے لیکن رفتہ رفتہ ان کے غیر اسلامی عناصر کی اصلاح کی طرف بھی توجہ پیدا ہو چلی ہے۔ اس سلسلے میں جمہوریۂ شام کے بعد اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے دستور کی اسلامی دفعات کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے]۔ (محمد حمید اللہ)

مآخذ: (۱) Inostranzev: *Sasanidskie Etiudï*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۹ء، ص ۲۵-۸۰؛ (۲) F. Gabrieli: *L'opera di Ibn al-Muqaffa*، در *RSO*، (۱۹۳۲ء)، بالخصوص ص ۲۱۳ - ۲۱۵؛ [(۳) محمد حمید اللہ: الوثائق السیاسیّة،

وثیقہ شمارہ ۱ اور مآخذ جو وہاں مذکور ہیں؛ (۴) وہی مصنّف: عہدِ نبوی کا نظامِ حکمرانی، طبع دوم، حیدرآباد دکن، بذیل: "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور"؛ (۵) وہی مصنّف: *The First Written Constitution in the World*، در *Islamic Review* (اگست-نومبر ۱۹۴۱ء)، ووکنگ ۱۹۴۱ء].

(F. GABRIELI و محمد حمید اللہ)

⊗ **آب:** بابلی نام ہے اس شمسی سال کے پانچویں ماہ کا جو شام کے یہودیوں کے ہاں سلیوقس نِقاطُر (Seleucus Nicator) کے زمانے (یکم اکتوبر ۳۱۲ ق-م) سے پندرھویں صدی عیسوی تک مقبول رہا۔ اس ماہ کے ہمیشہ تیس دن ہوتے ہیں اور علمائے یہود کی روایت کے مطابق اس ماہ کی یکم کو حضرت ہارون علیہ السلام (Aaron) کا یومِ وفات تھا۔ ۹ تاریخ کو یہود روزہ ("صومِ سیاہ") رکھتے تھے اور یہ ان کے لیے سوگ کا دن تھا (جزئیات کے لیے دیکھیے بَرْنَبی (Burnaby) اور *Jewish Encyclopaedia*)۔ ۱۵ آب کو (جو عموماً وسطِ اگست کے لگ بھگ آتا ہے) خوشی منائی جاتی ہے (*Jewish Encyclopaedia*، ۱: ۲۵-۲۶)۔ زمانۂ قدیم میں ۱۸ آب کو بھی روزہ رکھا جاتا تھا کیونکہ اس روز یہودیوں کے معبد کا "نورِ مغربی" شاہ اِیحَز (Ahaz) کے زمانے میں بجھ گیا تھا۔

مآخذ: علاوہ کتبِ لغت فارسی کے دیکھیے: (۱) *Jewish Encyclopaedia*، لنڈن و نیویارک ۱۹۰۱ء، ۱: ۲۳-۲۶؛ (۲) Burnaby: *Jewish and Muhammadan Calendars*، لنڈن ۱۹۰۱ء، ص ۲۰۱-۲۰۲؛ (۳) B.Vincent: *Haydn's Dictionary of Dates*، لنڈن ۱۸۹۵ء، ص ۵۸۳؛ (۴) سمتھ (W. Smith): *A New Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۶۹۳؛ (۵) *Encyclopaedia Britannica*، طبع نہم، ۵: ۷۱۵.

(احسان الٰہی، رانا)

---

* **آبادان:** رک بہ عَبّادان

---

* **آبادہ:** ایران کا ایک چھوٹا سا شہر، جو شیراز سے اصفہان جانے والے مشرقی (سرمائی) راستے پر واقع ہے۔ دورِ حاضر کی شاہراہ کے راستے سے آبادہ شیراز سے ۲۸۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور اصفہان سے ۲۰۴ کیلومیٹر اور اس فرعی سڑک سے جو (براہِ اَبَرْقُوہ) مشرق کی طرف جاتی ہے یزد سے ۱۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ موجودہ نظامِ اداری (۱۹۵۲ء) کے مطابق آبادہ اُستانِ (صوبۂ) فارس کی انتہائی شمالی شَہرِستان (ولایت) ہے۔ آبادی کا زیادہ تر شغل (افیون، روغنِ بید، انجیر اور روغنِ کنجد کی) زراعت و تجارت ہے۔ اِقْلِید نام کا ایک اَور چھوٹا سا شہر بھی ہے، جو آبادہ [کے جنوب میں اور اُس] سے متعلّق ہے۔ (ہوسکتا ہے کہ کلمۂ اِقْلِید دراصل کِلِید یعنی [فارس کی] کنجی ہو)۔ تمام ولایت میں ۲۲۳ دیہات ہیں اور آبادی بیاسی ہزار نُفُوس پر مشتمل ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر خصوصیت سے چودھویں صدی میں آتا ہے۔ اس شہر کو ولایتِ فارس کے اسی نام کے متعدّد قریوں (مثلاً علاقۂ نِیرِیز [(نَیرِیز (یاقوت: معجم البلدان و لبّ اللباب، ص ۲۶۹)] کے آبادۂ طَشک وغیرہ سے) متمیّز کر لینا چاہیے۔

مآخذ: (۱) لی سٹرینج (Le' Strange)، ص ۲۹۷؛ (۲) مسعود گیہان: جغرافیاے مفصّل [ایران]، (۱۳۱۱ ھ-ش)، ۲: ۲۲۶؛ (۳) فرہنگِ جغرافیاے ایران، (۱۳۳۰ ھ-ش/۱۹۵۱ء)، ج ۷، اُستان ہفتم: ص ۲.

(V. MINORSKY مِنَوْرسکی)

---

* **آبازہ:** [اَبازَہ] ترکی زبان میں ان لوگوں کا نام جنھیں (Abazes) آبازی کہتے ہیں [رک بہ ابخاز]۔ یہ لفظ عثمانیوں کی تاریخ میں بہت سے اشخاص کے نام کے ساتھ، جو اَبازیوں کی نسل سے ہیں، لقب کے طور پر استعمال ہوا ہے [مثلاً اَبازَہ پاشا [رک بآں]، اَبازہ حسن پاشا [رک بآں]، اَبازہ محمد پاشا [رک بآں]، اَبازہ سیاوش پاشا، اَبازہ ملک احمد پاشا، اَبازہ سلیمان پاشا وغیرہ؛ سامی، ۱: ۴].

۱- آبازہ پاشا: [اَبازہ محمد پاشا کا عرف؛ سامی]۔ ترکی کے ایک باغی جان بُولاط اوغلی نامی کا خزانچی، جو جان بُولاط کی شکست کے موقع پر پکڑا گیا اور قیدی کی حیثیت میں مراد پاشا کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی جان بخشی صرف ینی چریوں (یکی چریوں) (الِانکشاریّہ) کے آغا خلیل کی سفارش پر ہوئی۔ خلیل جب قپودان پاشا [امیرالبحر، وزیرِ بحریّہ] بنا تو اُس نے اِس [بغایت شُجاع و جَسُور شخص، یعنی اَبازہ پاشا] کو ایک جنگی کشتی کا حاکم (کمانڈر) بنا دیا اور جب خلیل صدرِاعظم بنا تو اس نے اَبازہ پاشا کو مَرْعَش کی حکومت عطا کر دی۔ کچھ عرصے بعد وہ اِرْضُ روم کا والی بنا اور اس نے ینی چریوں کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا؛ جو ینی چری (یکی چری) اس کے صوبے میں تھے انھوں نے بابِ عالی میں اس کے خلاف شکایتیں بھیجیں، اسے معزول کر دیا گیا، لیکن اُس نے بابِ عالی کے احکام ماننے سے انکار کر دیا (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء)۔ اس نے سلطان عثمان ثانی کی موت کا بدلہ لینے کے بہانے سے لوگوں پر مالی تحمیلات (ٹیکس) عائد کیے اور لشکر تیار کر کے اَنقرہ اور سِیواس پر چڑھائی کر دی، بُرُوسَہ پر قبضہ جما لیا، لیکن قلعے کو سَر کرنے سے قاصر رہا۔ ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء میں صدرِاعظم حافظ پاشا نے اسے قَیسارِیّہ کے قریب قَرَہ صُوندی کے پل پر ایک خون ریز جنگ میں شکست دی، اس لیے کہ طیّار (محمد) پاشا ترکمانوں سمیت اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اَبازہ نے اِرْضُ روم میں پناہ لی اور وہ اس شرط پر وہاں کا حاکم بننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ قلعے میں ینی چریوں کے ایک محافظ دستے کو داخل کر لے گا۔ ۱۰۳۶ھ/[۱۶۲۷ء]

میں اس نے اس شُبہے کی بنا پر کہ اَخِسکہ [اَخسحہ؛ سامی] کے خلاف جو مہم بھیجی جا رہی ہے، وہ درحقیقت اس کے خلاف بھیجی جا رہی ہے ینی چریوں کی ایک بڑی تعداد کو، جو فوج سے متعلّق تھی، قتل کرا دیا، اس کے پرانے مربّی خلیل نے اِرضُ روم کا محاصرہ کیا لیکن بے سود، کیونکہ برف باری کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا (۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء)۔ اگلے سال خَسرِو پاشا بوسنوی نے، جو صدرِ اعظم بنا دیا گیا تھا، پھر اس کا محاصرہ کیا اور اسے دو ہفتے کی ناکہ بندی کے بعد اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا؛ باغی کو معافی دے دی گئی اور ساتھ ہی اُسے بوسنہ کی حکومت بھی تفویض کر دی گئی۔ اَبازہ پاشا نے یہاں پھر اپنے دشمنوں، یعنی ینی چریوں، کو آزار پہنچایا۔ اسے معزول کر دیا گیا اور وہ بلغراد چلا گیا؛ وہاں اس نے ایک پہاڑی پر، جو بلغراد کے جنوب میں واقع ہے، اَبازہ کوشکی (Abāza Kiöshki) کے نام سے ایک محل تعمیر کرایا۔ بعد ازاں اسے وِدِّین (Widdin) بھیج دیا گیا، جہاں اس نے (۱۶۳۳ء میں) پولینڈ پر چڑھائی کرنے والے عساکر کی قیادت کی۔ سلطان مراد رابع کے اعتماد سے مشرّف ہونے کے باعث وہ سلطان کے ہمراہ اِدِرنہ گیا اور پولینڈ کے خلاف نئی مہم کی تیّاریاں کی جانے لگیں؛ لیکن اس کی اقبال مندی نے حاسدوں کی آتشِ حسد کو بھڑکا دیا اور انھوں نے چالاکی سے اس کے خلاف ایسی اطلاعات شائع کیں جن سے سلطان اس کی طرف سے کبیدہ خاطر ہو گیا اور اسے موت کی سزا دی (۲۹ صفر ۱۰۴۴ھ/ ۲۴ اگست ۱۶۳۴ء)۔

مآخذ: (۱) ہامر پُورگشٹال (Hammer-Purgstall)، ۴:۵۶۹، ۵۸۲؛ ۵:۲۶، ۸۳، ۱۷۳ ببعد، ۱۸۹ ببعد؛ (۲) مصطفٰی اِفندی: نتائج الوقوعات، ۲:۴۸، ۸۲؛ (۳) اِولیاء اِفندی: سفر نامہ، ۱:۱۱۹ ببعد۔

۲۔ آبازہ حسن [پاشا]: اَبازہ حسن نے حیدر اَوغلی نامی ایک باغی کو گرفتار کیا تھا، جس کے صلے میں اسے ایشیائے کوچک کے ترکمانوں کا سرِعسکر (کمانڈر) بنا دیا گیا۔ جب اسے بغیر کسی سبب کے معزول کر دیا گیا تو اب اس کی باری آئی کہ بغاوت کا علَم بلند کرے، چنانچہ اُس نے گِرِیندہ (Gerende) اور بُولُو (Bolu) کے درمیانی علاقے پر قبضہ جما لیا۔ اس نے پرانے ڈاکو قاطِرجی اَوغلو کو، جو اس کے مقابلے میں لڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا، شکست دی، مگر اس شرط پر حکومت کی اطاعت قبول کی کہ ترکمانوں کے ویودہ [تلفّظ: وای وُدا] Voivode [= امیر] کا لقب اسے ملے گا۔ کچھ عرصے کے بعد اُن شکایات کی بنا پر جو اس کے خلاف دائر کی گئیں اسے ہفت برج [یِدی قلعہ] (Seven Towers) میں قید کر دیا گیا۔ اس قید سے رہائی اسے اس وقت ملی جب بہایی (Behayi) [اِفندی] [دوسری بار] شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہوا (۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء)۔ بہایی اس کا دوست تھا۔ اُس نے اِسے اَوخری (Okhri) کی سَنجَق عطا کر دی۔ جب سلطان محمّد رابع نے [مصطفٰی الملقّب بہ] اِپشیر پاشا کو، جو خود بھی آبازی تھا، صدرِ اعظم بنایا تو اس نے اَبازہ حَسن کو اپنے پاس بلا لیا، اِپشیر پاشا کو سزائے موت ملی [۴ رجب ۱۰۶۵ھ/ یکم مئی ۱۶۵۵ء، زامباور، ۱۶۳] تو آبازہ حسن بدستور اس کی وفاداری کا دم بھرتا رہا اور اپنی باقی ماندہ فوج ساتھ لے کر ایشیائے کوچک کو لوٹ آیا۔ اُس نے ترکمانوں کے امیر (''ویودہ'' Voivode) کا منصب ازسرِنو حاصل کر لیا (۱۰۶۵ھ/ ۱۶۵۵ء)؛ حَلَب کو اپنا مستقرّ بنایا اور ملکِ شام میں وہ لوٹ مار کی کہ دِیوان نے چاہا کہ اُسے سلطنت کے حدود سے خارج کرا دے لیکن صدرِ اعظم سُلیمان پاشا نے اسے والی کے عہدے پر مستقل کر کے دربِ دانیال کے استحکامات کا دفاع اس کے سپرد کر دیا۔ ۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۶ء میں اسے دیارِ بَکر کا والی بنا کر بھیجا گیا۔ دو سال بعد اس نے بغاوت کی اور اس وقت کے صدرِ اعظم محمد کوپُرُولو کی معزولی کے مطالبے کے نام سے اپنی زیرِ قیادت بھاری فوج اکٹھی کر لی اور بُرُوسَہ کو خطر و خوف میں ڈال دیا۔ اِلغِن (Ilghin) کے قرب و جوار میں اس نے مرتضٰی پاشا کو، جو اس کے مقابلے میں بھیجا گیا تھا، شکستِ فاش دی (۱۵ ربیع الاوّل ۱۰۶۹ھ/ ۱۱ دسمبر ۱۶۵۸ء)؛ لیکن وہ ایک دامِ فریب کا شکار ہو گیا جو اس کے لیے بچھایا گیا تھا؛ وہ اطاعت کی شرطیں طے کرنے کے لیے عَین تاب چھوڑ کر حَلَب گیا، جہاں اسے غدر و فریب سے قتل کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) ہامر پُورگشٹال (Hammer-Purgstall)، ۵:۴۸۱، ۵۶۰ ببعد، ۵۶۳، ۵۷۵، ۶۳۴؛ ۶:۳۵ ببعد، ۵۱ ببعد؛ [۲] قاموس الأعلام، ص ۵۹۰، ۱۹۴۹]۔

۳۔ آبازہ محمد پاشا: مَرعَش کا بکلر بکی تھا، جسے (۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء میں) روسیوں کے خلاف مہمّ کے دوران میں خانِ کریمیا کی موافقت میں کام کرنے کے احکامات ملے۔ بِنڈر [Bender واقع در بسارابیا Bessarabia] کے قلعے کی کمان اُسے سپرد ہوئی اور چوکُزِم (Choczim) کا محاصرہ اٹھوانے میں نمایاں کارگزاری دکھانے کے صلے میں اُسے تیسرا تُوغ انعام میں ملا۔ اُسے چوکُزِم کے دفاع کی خدمت تفویض ہوئی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ عثمانی فوج اسے تنہا چھوڑ گئی ہے تو وہ بھی بھاگ گیا۔ بعد ازاں اسے مَولدَاویا [بَغدان] کی مدافعت کا کام تفویض ہوا، مگر وہ اس کے سرانجام دینے سے قاصر رہ گیا۔ کَغُول (Kaghul) کی لڑائی (یکم اگست ۱۷۷۰ء) میں اُسے میمنے کی کمان سپرد ہوئی۔ ترکوں کے شکست کھا جانے پر وہ اسمٰعیل کے مقام پر [اس کے لیے دیکھیے *Spruner-Menke Handatlas*، نقشہ ۷۲] چلا گیا۔ پھر وہ سِلِسْتِرِیا کا والی مقرّر ہوا، لیکن ان اموال کو جو اُسے مزید لشکر بھرتی کرنے کے لیے ملے تھے فضول طور پر ضائع کر دینے کی وجہ سے اُسے معزول اور قُسطَنْدِیل (Kustendil) کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ جب روسیوں نے کریمیا فتح کیا اور خان سلیم گِرائی بھاگ نکلا تو اس نے اس تھوڑی سی فوج کو، جسے لے کر وہ آ رہا تھا خشکی پر اتارنے سے انکار کر دیا اور سِینُوپ کو لوٹ آیا؛ [اس پر] اُس کا سر قلم کر دیا گیا (۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء)۔

مآخذ: (۱) ہامر پُورگشٹال، ۸:۳۴۱، ۳۴۸، ۳۶۹، ۳۸۷؛ (۲) واصِف

افندی، منقول، در *Précis historique de la guerre des Turcs contre les Russes*، از P. A. Caussin de Perceval، ص ۲۳، ۳۱، ۳۷ ببعد، ۵۹، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۴۸، ۱۶۷.

(CL. HUART ایوار)

⊗ **آبان:** (یا اَبان، یا آبان ماہ = پہلوی ابان، سغدی ʾβʾn) قدیم ایرانی شمسی (یعنی یزدگردی) آٹھواں مہینہ، جس میں آفتاب بُرجِ عقرب میں ہوتا ہے۔ اس میں تیس دن ہوتے ہیں اور اسے باران ریز بھی کہتے ہیں [فرہنگ آموز گار، ص ۲۷، عمود ۱، سطر ۱۵].

آبان ایرانی دیومالا کے اس فرشتے کا نام ہے جو لوہے پر موکّل اور جس کے سپرد اُن امور و مصالح کی تدبیر ہے جو آبان ماہ اور بالخصوص آبان روز میں واقع ہوتے ہیں.

فارسیوں کے نزدیک آبان روز، آبان ماہ کا روزِ عید تھا.

مآخذ: علاوہ کتبِ لغتِ فارسی مثلاً برہان قاطع، لغت نامۂ دہخدا و شائن گاس کے دیکھیے: (۱) المسعودی: مروج الذهب، طبع پیرس، ۳: ۴۱۳؛ (۲) عمر خیّام: نوروز نامہ، تہران، ۱۹۳۳ء، ص ۶، ۸۳؛ (۳) البیرونی: الآثار الباقیة، لائپزگ ۱۸۷۸ء، ص ۴۲؛ (۴) نُوبِرگ (H. S. Nyberg): *Hilfsbuch des Pehlevi*، اُپسالا ۱۹۲۸ء، ص ۳۱؛ (۵) F. Justi: *Des Iranisches Namenbuch*، ۱۸۹۵ء، ص ۱۸-۱۹؛ (۶) R. Schram: *Kalendariographische und chronologische Tafeln*، لائپزگ ۱۹۰۸ء، ص ۱۳۷-۱۸۱؛ (۷) وُستِنفِلڈ (Wustenfeldt) وغیرہ *Vergleichungs-tabellen*، وِیس باڈِن (Wiesbaden)، ۱۹۶۱ء، ص ۴۶، ۸۵؛ (۸) حَسن تقی زادہ: *Old Iranian Calendars*، لنڈن ۱۹۳۸ء، ص ۵۲.

(احسان الٰہی، رانا)

⊗ **آبدست:** رک بہ وضو.

✱ **[آبَسکُون] (یا اَبَسکُون):** [بالمدّ در اصطخری و ابن حَوقَل و مقدّسی و نُزْهَه، مگر قب یاقوت] بحیرۂ خَزَر کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک بندرگاہ ہے، اس کا شمار اعمالِ جُرجان رگُرگان میں ہے اور بقول یاقوت (۱: ۵۵) جُرجان سے تین دن کی مسافت یا ۲۴ فرسخ (یاقوت، ۱: ۹۱) کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے محلِّ وقوع کی تعیین خَورِ (estuary) رُودِ گرگان کے قریب (خوجہ نفس؟ کے مقام پر) کی جاسکتی ہے [حواشی حدود العالم، ص ۳۸۶ پر صاحبِ مقالہ ہی نے گُمبُش تاپا (Gümüsh täpä) پر اس کا محلِّ وقوع بتایا ہے]۔ الاصطخری، ص ۲۱۴ (ابن حوقل، ص ۲۷۳) آبَسکون (بحیرۂ خَزَر کی) سب سے بڑی بندرگاہ قرار دیتا ہے۔ خود بحیرۂ خَزَر کو بھی بعض اوقات 'بحر آبَسکُون' [یا بحر اَبَسکُون] کہا جاتا تھا [یاقوت، ۱: ۵۶؛ جوینی، ۲: ۱۱۵].

ممکن ہے کہ آبَسکون وہی شہر ہو جس کا ذکر بطلیموس (Ptolemy) [V1، باب ۹؛ مِنَوْرسکی] Σωχανάα کے نام سے کرتا ہے، جو Hyrcania (گرگان) میں تھا۔ آبَسکون پر روسی بحری ڈاکوؤں نے کئی بار حملے کیے (۲۵۰ اور ۲۷۰ھ/ ۸۶۴ اور ۸۸۴ء کے درمیان اور ۲۹۷ھ/ ۹۰۹ء میں؛ رک بہ ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، بتصحیح عبّاس اقبال، ص ۲۶۶ [ترجمہ از E. G. Browne، ص ۱۹۹])؛ قب نیز مسعودی، ۲: ۱۸؛ بحدود ۳۰۰ھ/ ۹۱۲ء)۔ خوارزم شاہ علاء الدین نے، جس کا تعاقب مغل کر رہے تھے، ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء میں "(بحر) آبَسکُون کے ایک جزیرے میں" پناہ لی [اور ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں منتقل ہوتا رہا] (رک بہ جوینی، ۲: ۱۱۵ ببعد، [قب ۱: ۱۲۱ اور جس جزیرے میں اس کا انتقال ہوا وہیں اسے دفن کر دیا گیا؛ قب ۲: ۲۰۱])۔ ابن الأثیر، ۱۲: ۲۴۲ کے بیان کے مطابق خوارزم شاہ کے قبضے میں "اَبْ سکُون" [کذا] میں ایک قلعہ تھا، [آبَسکُون کے "حصنٌ مِن اَجُرٍ" کا ذکر مقدّسی نے کیا ہے]، جس کے اردگرد پانی تھا۔ بظاہر جزائرِ آبَسکُون اَشُورآطہ کے جزائر اور وہ قطعات زمین ہیں جنھیں رَودِ گرگان کے دہانے سے ایک تنگ آبنائے جدا کرتی ہے۔ [گُمبُش تاپا اور آشُورآطہ دونوں کے لیے دیکھیے نقشہ جو بارٹولڈ: *Turkestan* کے آخر میں دیا ہے]۔ [بیرونی نے القانون المسعودی میں (اقتباس در صفة المعمورة علی البیرونی، *Memoirs of the Archaeolog. Survey of India*، عدد ۵۳،) ص ۴۰ پر ابسکون کا طول بلد ۷۹ درجہ ۱۵ دقیقہ اور عرض بلد ۳۷ درجہ ۱۰ دقیقہ دیا ہے].

مآخذ: [(۱) اصطخری، ص ۲۱۴؛ (۲) ابن حَوقَل، ص ۲۷۳؛ (۳) مقدّسی، ص ۳۵۸؛ (۴) یاقوت، ۱: ۵۵، ۹۱؛ (۵) مستوفی: نزهة القلوب، ص ۲۳۹]؛ [۶] B. Dorn: *Caspia, Über die Einfälle der alten Russen in Tabaristan*، طبع ۱۸۷۵ء، دیکھیے اشاریہ؛ [۷] بارٹولڈ (Barthold): *Istoriya orosheniya Turkestana*، طبع ۱۹۱۴ء، ص ۳۳؛ [(۸) وہی مصنّف: *Turkestan*، طبع وقفیہ گب، ۱۹۲۸ء، ص ۴۲۶؛ (۹) Le' Strange: *Lands* etc، ص ۳۷۹ و مواضع دیگر بہ امدادِ اشاریہ؛ (۱۰) حدود العالم، مترجمۂ مِنَوْرسکی، طبع وقفیہ گب، ص ۳۸۶؛ (۱۱) آئین اکبری، ترجمۂ جیرٹ، ۳: ۸۶؛ (۱۲) فرہنگ انجمن آرای ناصری، بذیلِ کلمہ؛ (۱۳) صنیع الدولہ محمد حسن خان: مرآة البلدان ناصری، تہران ۱۲۹۴ھ].

(V. MINORSKY مِنَوْرسکی)

آبِش: رک بہ (آلِ) سَلغُر. ✱

---

* **آبِق:** رک بہ عبد.

---

*⊗ **[آبنُوس]:** (آبْنُوس، آبُنُوس، اَبَنُوس اور آبُنُوس مختلف تلفّظ ہیں) یہ یونانی لفظ ابرینوس ἔβενος سے ماخوذ ہے اور وہیں سے انگریزی ebony، لاطینی ebenum، فرانسیسی ébène، اطالوی و پرتگالی ebano، جرمن ebenholz، رومانوی eben وغیرہ نکلے ہیں۔ عبرانی ''ہوبن'' (hoben) اور قدیم مصری haben کا بھی اسی سے رشتہ ہے۔ یونانی سے یہ آرامی میں جا کر اَبُنُو سا بنا اور پھر وہاں سے فارسی، عربی، ترکی، اردو اور دیگر زبانوں میں پھیلا۔ قدیم زمانے سے ہی سامی قومیں اس سے اچھی طرح واقف تھیں اور ہندوستان وحبش سے اس کی درآمد کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ ازرقی: اخبار مکّہ، طبع وسٹنفلٹ، ص ۹۰ کے مطابق ابرہہ نے جب صنعا میں اپنا مشہور گرجا ''قلیس'' [یا قُلّیس یا قُلّیس] تعمیر کیا تو اس میں آبنوس کا منبر بنوایا، جس میں سفید عاج بھی لگایا گیا تھا، قب سُہیلی: روض الأُنف، ۱: ۴۰؛ ابن جُبیر، ص ۷۶ سے روایت ہے کہ اس نے جدّے میں ایک مسجد دیکھی جو حضرت عمر بن الخطاب [رض] سے اور بعض کے نزدیک ہارون الرشید سے منسوب تھی۔ اس میں دو دوستون آبنوس کے تھے (تقی الدّین الفاسی: شفاء الغرام، طبع وسٹنفلٹ، ص ۷۵)؛ لیکن ابتدائے اسلام میں اس کا استعمال کم ہوا، کیونکہ یہ لکڑی ملتی کم تھی اور فنکارانہ اشیا کی ضرورتیں بھی زیادہ نہ تھیں۔ اس روایت کے باور کرنے میں تامّل ہوتا ہے کہ جب خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بیت المقدّس کے قُبّۃ الصَخرہ کی تعمیر شروع کی تو وہاں کی مقدّس چٹان کو اس نے آبنوس کے کٹہرے سے گھیر دیا۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ اس سے پہلے ہی خلفا کے زمانے میں اس لکڑی اور ہاتھی دانت کو شطرنج اور نرد کے مہروں [دیکھیے مادّۂ شطرنج] اور پچی کاری میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد کو یہ پچی کاری کی صنعت نہایت کاریگری سے اثاثِ خانہ (فرنیچر)، دروازوں، کھڑکیوں کی جالی اور دیواروں کی تختہ بندی میں برتی جانے لگی۔ قاہرہ کے دارالآثار العربیّہ میں اس کے بہت سے نمونے نظر آتے ہیں۔

''ابوحنیفہ دِینَوَری کی کتاب، کتاب النبات کا وہ حصّہ چھپ گیا ہے جو حرف الف سے زاء تک ہے؛ اس میں لفظ آبنوس کا کہیں ذکر نہیں، لیکن البیرونی نے اپنی کتاب الصَیدَنَہ میں حرف الف کے تحت آبنوس کا ذکر کرتے ہوے دِینَوَری کا جو اقتباس دیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

ابوحنیفہ دِینَوَری نے کتاب النبات میں بیان کیا ہے کہ کَرَم [فارسی میں رز؛ صیدنۂ فارسی]، جس سے صِحاف (=لکڑی کے برتن [جمع صَحفَہ = کاسۂ بزرگ جس میں پانچ آدمیوں کا کھانا آجائے]) بنائے جاتے ہیں، ایسا درخت ہے جو زیادہ اونچا نہیں ہوتا، لیکن موٹا، غلیظ اور سیاہی و زردی لیے ہوے ہوتا ہے۔ گاہے زردی کی جگہ سرخی ہوتی ہے۔ یہ بوزنطی سرحد (''دُرُوب الروم'') پر اگتا ہے۔ خَلَنج کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں سے یہ سب سے عمدہ ہے۔ آبنوس کی دوسری قسم گہری سیاہ بھی ہوتی ہے، جس میں کسی اَور رنگ کی آمیزش نہیں ہوتی۔ یہ مجمع الجزائر قُمَیر میں جزیرۂ واقواق سے لائی جاتی ہے۔ واقواق کے لوگ سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ وہاں کے غلاموں کو قُمَیر والوں کے مقابلے میں، جو سانولے ہوتے ہیں، زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ ترکوں کی طرح ہوتے ہیں لیکن بُوچے (مُخَرِّمُوا الآذان)۔ سیاہ آبنوس ایسی لکڑی کا مغز ہے جس کا چھلکا اتار دیا جاتا ہے یہ [آبنوس کی قسم] مُلَمّع سے [جو زردی مائل سیاہ ہے اور جس میں جَزع یعنی سفید و سیاہ مہرے کی طرح کی چمک ہوتی ہے] سخت تر اور بہتر ہے'' [صفۃ المعمورۃ، یہ عبارت الصیدنۃ سے ماخوذ ہے مگر [صیدنہ کے فارسی ترجمے (نسخۂ محمد شفیع لاہوری، ورق ۱۵۴: مادّۂ کَرَم) میں یہ مضمون نہیں ہے]۔ دِینَوَری کی مطبوعہ جلد میں لفظ 'اَثل' اور 'خَلَنج' کے تحت مذکورہ بالا معلومات کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، جس سے البیرونی کے لفظ 'کَرَم' کے متعلّق دیے ہوے اقتباس کی توثیق ہوجاتی ہے۔

کتبِ طبّ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے؛ چنانچہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی سے ایرانیوں اور عربوں کو دیسقوریدس (Dioscorides) اور جالینوس کی تالیفوں کے ترجمے مل گئے تھے، جن کے حوالے سے آبنوس کو قرحۂ فُلُوقْطِنُس (phlyctenous inflammation= بُثُورِ رُفَاخات) اور مُزمِن سیلانِ چشم میں مفید قرار دیا جاتا تھا۔ امراضِ معدہ وشکم میں داخلی استعمال کے لیے وہ سفوف کے طور پر کھلایا جاتا تھا۔ اور جلے ہوے عضو پر اسے چھڑکا بھی جاتا تھا۔ ابن البیطار نے یہ بھی لکھا ہے کہ [عیسٰی] ابن ماسَہ کے قول کے مطابق آبنوس پلکوں کے بال اگانے میں نافع ہے اور بقول سفیان الاندلسی اسے گھِس کر داخلی طور پر استعمال کیا جائے تو خطرناک پھوڑوں کو فائدہ دیتا ہے، پھوڑے مندمل ہوکر سوکھ جاتے ہیں۔ دیسقوریدوس کے قول کے مطابق حبشی آبنوس کو ہندی آبنوس کے مقابلے میں زیادہ تر مؤثّر خیال کیا جاتا ہے۔ حبشی آبنوس میں جو خاصیّتیں بیان کی جاتیں ہیں وہ آج کل جزائر شرق الہند، مجمع الجزائر ہند، مدغاسکر اور موریشس میں اگنے والی قسموں یعنی دِی اُوس پِرُوس (Diospyros) اور مابَہ (Maba) میں پائی جاتی ہیں اور وہ خاصیتیں یہ ہیں: رنگ نہایت سیاہ ہو اور دانے اتنے مہین ہوں کہ ریشے سے ان کا امتیاز ناممکن ہوجائے۔ آبنوس کے افریقی انواع کو عرب پسند کرتے تھے۔ آج کل بجا طور پر ان کی قدر کی جاتی ہے اور خاص کر ملکِ حبش کا درخت [شجر بَبَنُوس] تو A. E. Brehm کی تالیف *Reisesk.aus Nordostafrika* کے مطابق درخت نہیں محض ایک جھاڑی ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی جو کم قدر و قیمت رکھتی ہے استعمال کے قابل تو ہوتی ہے لیکن اگر استعمال نہ کی جائے تو سوکھ کر بوسیدہ ہوجاتی ہے۔

ابن البیطار کے مأخذ الغافقی نے بھی اپنی الادویّۃ المفردۃ میں آبنوس کا ذکر کیا ہے۔ مونٹریال (Montreal) کے مخطوطے میں آبنوس کے درخت کی تصویر بھی دی ہے۔ الغافقی کے بیان کا، جو دو صفحے پر مشتمل ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس کی سوکھی لکڑی کو آگ پر ڈالیں تو خوشبودار دھواں نکلتا ہے، کچی لکڑی میں ایسا کم

ہوتا ہے، [’سیقامینا‘ مترجم بہ توت، نسخۂ بدل: سیسامینا، گویا شیشم] بھی سیاہ ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آبنوس کے برخلاف ’’یہ نرم اور مسام دار ہوتا ہے اور اس کی چھپٹیوں (’شظایا‘) میں ہلکا سا اودا رنگ جھلکتا ہے۔ مزے میں یہ زبان کو ذرا بھی تیز نہیں لگتا اور آگ پر رکھیں تو بخور بھی نہیں دیتا‘‘ [’’لا یلذع اللسان البتة و اذا وُضع علی النار لم یَفُح منه رائحة‘‘]۔ آبنوس بصارت کو جلا دینے میں بھی مفید بتایا جاتا ہے۔ اس کا بُرادہ اَور اس کا کوئلہ دونوں طبّی اغراض کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ آنکھوں کے علاوہ معدے کی بعض بیماریوں نیز مثانے میں پیدا ہونے والی پتھری کو ریزہ ریزہ کرنے میں بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

حبیب زیّات نے (مقالۂ ’’صُحُف الکتابة و صناعة الورق فی الاسلام‘‘، مطبوعہ در المشرق، جنوری ۱۹۵۴ء میں) الکُشاجِم (دیوان، طبع بیروت، ص ۱۶۸) کا یہ بیت نقل کیا ہے:

نِعمَ المُعِیْنُ علی الآداب والحِکَم
صحائفُ حُلُک الأَلوان کالظُلَمِ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ آبنوس کی تختیاں استعمال کیا کرتے تھے۔

تعلیقہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کتاب الصیدنة (مخطوطۂ بروسہ، ورق ۹ ببعد) سے آبنوس کے متعلّق ایک اقتباس بھیجا ہے۔ اس مخطوطے کا عکس لاہور میں بھی ہے۔ اس سے مقابلے کے بعد ترجمہ درجِ ذیل ہے:-

’’آبنوس دو قسم کا ہوتا ہے: ایک دو رنگا (’مُلَمّع‘)، سیاہ اور زرد۔ جیسے دو رنگا منکا؛ اور کبھی تو اس کے دونوں رنگ سیدھے خط میں ایک دوسرے سے متّصل ہوتے ہیں اور کبھی ٹیڑھی دھاریوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ آبنوس کی یہ قسم سواحل زنگ کے جزیروں سے آتی ہے۔ ان کی زبان میں اسے مُنگیُو (فارسی ترجمے میں: میکوا) کہتے ہیں۔ اس کا درخت عناب کے درخت کی طرح کا اور بیج مہندی کے بیج کا سا ہوتا ہے۔ اسی جگہ اس کی ایک اَور قسم بھی ہوتی ہے، جس میں لاکھ کی سی سرخی، صندل کی سی سفیدی سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا بیج فلفل (کالی مرچ) کا سا ہوتا ہے۔ اسے چھڑیوں کے دستے اور کمانوں کے مڑے ہوئے سرے (گوشے) بنانے کے کام میں لاتے ہیں۔ بعض اسے شَوحَط بھی کہہ دیتے ہیں، مگر یہ وہ شوحَط نہیں ہے جس سے عرب اپنی کمانیں بناتے ہیں۔ کتب متعلّقۂ تورات کے سِفْرُ المُلُوک میں لکھا ہے: سلیمان علیہ السلام بن داؤد علیہ السلام ہندوستان سے جو تحفے لائے ان میں ایک رنگ برنگی لکڑی تھی، جس سے ہیکل کی بہت سی چیزیں بنائی گئیں۔ بنی اسرائیل کی سرزمین میں اس کے بعد ویسی لکڑی ہند سے نہیں آئی۔ اس کی تفسیر کرنے والوں نے کہا ہے کہ اس لکڑی کا نام سریانی میں فیستوثا ہے اور عورتوں کے ملک سے آتی ہے، جو چین کے اندرونی حصّے میں ہے۔ یہ موتی کی طرح چمکتی ہے اور اس میں رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، خوشبو اچھی آتی ہے اور پانی کی سطح پر نہیں تیرتی۔

میرا خیال ہے کہ یہ لکڑی وہی آبنوس ہے اور اس کی چمک اور صفائی اسی کی سی ہے۔ آبنوس کی ساری قسمیں بھاری ہونے کی وجہ سے پانی کی تہ میں بیٹھ جاتی ہیں، تیرتی نہیں۔ عناب کی لکڑی بھاری پن میں، پانی کی تہ میں بیٹھ جانے میں اور سرخ و سفید دو یکساں طور پر ملے جلے رنگوں سے رنگین ہونے میں اس سے مشابہت رکھتی ہے اور شنشف (؟) بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی، جس سے اہلِ ہند سریر میّت (نعوشهم) کے پائے بناتے ہیں.

آبنوس کی دوسری قسم گہری سیاہ ہوتی ہے، جس میں کوئی اَور رنگ ملا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ لکڑی وقواق سے آتی ہے، جو قُمیر کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ ہے۔ وقواق کے باشندے گہرے کالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ لوگ انھیں غلامی کے لیے قُمیر کے اَور حصّوں کے باشندوں کی بہ نسبت، جو ترکوں کی طرح گندمی رنگ کے اور کان کٹے ہوتے ہیں، زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ آبنوس ایک لکڑی کا اندرونی گودا ہے، جس کے اردگرد کا مواد سب اتار دیا جاتا ہے۔ یہ دو رنگے قسم کے آبنوس سے زیادہ سخت اور زیادہ نفیس ہوتا ہے۔ دیسقوریدس کہتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ مضبوط حبش کا ہوتا ہے اور وہ ایسا کالا چمک دار ہوتا ہے گویا گھِسا ہوا (صاف کیا ہوا) سینگ ہے؛ لیکن بات یہ ہے کہ حبش میں آبنوس نہیں ہوتا، البتہ سودان (کالے لوگ) کا ذکر یونانی کتابوں میں کوش کے نام سے آیا ہے اور اکثر مفسّرین نے اس کی تشریح حبشہ یا ہند سے کی ہے؛ دوسرے مقام پر دیسقوریدس کہتا ہے: وہ جو کوش سے آتا ہے (اور کوش سند کا ایک ناحیہ ہے) اور جو سودان سے آتا ہے سب سے گہرے کالے رنگ کا ہوتا ہے اور چھونے میں کچھوے کی پیٹھ کی طرح ہوتا ہے۔ سند اس ذیل میں داخل نہیں اور نہ ان کے اور ہند والوں کے ہاں آبنوس ہوتا ہے.

مآخذ: [۱] ابو منصور مُوَفّق: کتاب الأبنِیَة، نشرِ زیلِگ مان (Seligmann)؛ (۲) احمد بن محمد الغافِقی (م بحدود ۵۶۰ھ): منتخب کتاب جامع المفردات (انتخاب ابن العِبْری)، طبع مایرہوف (Myerhoff) وصبحی، مصر ۱۹۳۲ء، ص ۱۶؛ ترجمہ و شرح، ص ۷۲؛ (۳) ابن البیطار: الجامع فی الادویة المفردة (طبع بولاق ۱۲۹۱ھ)، ص ۸، نیز فرانسیسی ترجمہ از L. Leclerc، جو *Notices et Extraits des mss. de la Bibl. Nat.*، پیرس، عدد ۲۳: ۱ میں شائع ہوا؛ (۴) القزوینی: عجائب المخلوقات (شائع کردہ وُسٹِنْفِلْڈ)، ۱: ۲۴۷؛ (۵) البیرونی: کتاب الصَیْدَنَة (مخطوطۂ بُرُسَہ، ترکیہ)؛ [(۶) زکی ولیدی طوغان: صفة المعمورة علی البیرونی (تذاکیر دیوان الآثار القدیمة بالهند، العدد ۵۳)، طبع دہلی، ص ۱۰۸ ببعد؛ (۷) وہی کتاب ترجمۂ فارسی (باختصار و زیادات) نسخۂ مذکورۂ متن، ورق ۱ الف؛ (۸) مخزن الادویہ، دہلی ۱۲۷۸ھ، ص ۴۰؛ (۹) مخزنِ علوم و فنون، حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء، ص ۳۱].

(محمد حمید اللہ و ہِل J. HELL)

آت: [اَت] (ترکی) = گھوڑا، کئی اَعلام اس لفظ سے ترکیب پذیر ⊗ ہوے ہیں، مثلاً اَت بازار، اَت میدان.

اَت بازار (لفظی معنی: گھوڑوں کی منڈی) قازاقستان کے وفاق

جمہوریۂ اشتراکیۂ روسیہ (USSR) کے ناحیۂ آق مؤلِنسک (Akmolinsk) کا ایک قصبہ۔

اَت میدان (= گھڑ دوڑ کا میدان Hippodrome)، قُسطنطِینیہ (= استانبول) کے جنوب مشرقی کونے میں ساحل کے قریب ایک کھلے میدان کا نام ہے۔ قیصرِ قسطنطین اوّل نے ۱۱ مئی ۳۳۰ء کو تعمیرِ شہر کے وقت اَت میدان کی بھی بِنا رکھی۔ صدیوں اس میدان کی آرائش پر شاہی خزانے سے روپیہ خرچ کیا جاتا رہا۔ کئی ستونوں اور بتوں سے اسے آراستہ کیا گیا۔ اس کے گرداگرد بلند دیوار تھی، جو اس میدان کو شہر سے جدا کرتی تھی۔ وینس والوں نے چوتھی صلیبی جنگ کے زمانے میں اَت میدان سے مشہور بُت سازلائی سی پَس (Lysippus) کے بنائے ہوئے گھوڑوں کے مجسّمے ہٹا کر وینس بھجوا دیے، نپولین وہاں سے انھیں پیرس میں لے آیا؛ ۱۸۱۵ء میں وہ پھر وینس پہنچا دیے گئے۔ ستونوں کو دوسری عمارتوں میں استعمال کرلیا گیا۔ اب یہاں ایک خوشنما باغیچہ موجود ہے۔

اَت میدان کے ایک کونے میں قصرِ شاہی ہے اور مشرق میں کوچک آیا صوفیا ہے۔ میدان کا بیشتر حصّہ اب سلطان احمد کی جامع کے صحن میں شامل کرلیا گیا ہے۔ جنوب میں ٹریم وے (tram-way) کوچک آیا صوفیا سے ہوتی ہوئی یدی قُلّہ (= قلعۂ ہفت بُرج) کو جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) Robert Liddell: *Byzantium and Istanbul*، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۸۶ ببعد؛ (۲) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع اوّل)، ۱: ۵۰۴؛ (۳) G. Ostrogorsky: *History of the Byzantine State*، (ترجمہ از Joan Hussey)، اوکسفرڈ ۱۹۵۶ء، ص ۳۷۰؛ (۴) B.Vincent: *Haydn's Dictionary of Dates*، لنڈن ۱۸۹۵ء، ص ۱۱۰۹؛ (۵) اسلام اَنسیکلوپیدیسی، جز ۵۳ الف، بذیل استانبول۔

(احسان الٰہی، رانا)

⊗ **آتش:** خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلُّص۔ باپ کا نام [خواجہ] علی بخش تھا (از رُوے ریاض الفصحاء کہ قولِ مستند ہے) سلسلۂ نسب خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے۔ بزرگوں کا وطن بغداد تھا، جو تلاشِ معاش میں دہلی آئے اور وہیں پرانے قلعے میں بس گئے (ریاض الفصحاء، ص ۴)۔ خواجہ علی بخش، شجاع الدّولہ بہادر [ذی الحجّہ ۱۱۶۷ - ۲۳ ذی القعدہ ۱۱۸۸ھ / اکتوبر ۱۷۵۴ - ۲۲ مارچ ۱۷۷۵ء] کے عہد میں دہلی سے فیض آباد آئے اور محلّۂ مغل پورہ میں قیام کیا۔ آتش کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی؛ صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ ریاض الفصحاء (تالیف ۱۲۲۱ - ۱۲۳۶ھ) میں آتش کی عمر ۲۹ سال بتائی ہے۔ اس سے ان کی تاریخِ پیدائش ۱۱۹۲ھ اور ۱۲۰۷ھ کے درمیان قیاس ہوسکتی ہے اور بوقتِ مرگ (۱۲۶۳ھ میں) وہ ۵۶ تا ۶۲ برس کے ہوں گے۔ لیکن اگر امیر اللہ تسلیم کا اندازہ کہ وہ ''کوئی ستّر برس کے قریب ہوں گے'' (آبِ بقا، ص ۱۱) صحیح تھا تو ماننا پڑے گا کہ مصحفی نے آغازِ تذکرہ ہی کے وقت (۱۲۲۱ھ میں) انھیں ۲۹ برس کا پایا تو اس حساب سے آتش کی تاریخِ ولادت ۱۱۹۲ھ کے قریب ہوگی، جو تسلیم کے اندازے کو ممکن بنا سکتی ہے۔

آتش وجیہ، باپ کی طرح گورے چٹّے اور خوب صُورت، کشیدہ قامت اور چھریرے بدن کے تھے (انتخابِ آتش، ص ۱۴)۔ ابھی اچھی طرح جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا اور تعلیم نامکمل رہ گئی۔ دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھتے رہے (قب ریاض الفصحاء، ص ۹؛ آبِ حیات، ص ۳۷۳) اور اپنے تھوڑے سے علم کو بہروپ کے پردے میں ڈھال دیا (جلوۂ خضر، ۲: ۱۰۶)۔

سر پر کوئی مربّی موجود نہ تھا اس لیے مزاج میں آوارگی پیدا ہوگئی۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شورہ پشت ہو گئے۔ اس زمانے میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی۔ آتش کو اپنی بہادری دکھانے کے بہت سے مواقع ملے۔ مغل بچوں کی صحبت میں تیغ زنی بہت اچھی آ گئی تھی۔ بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے۔ کم سنی سے تلوریے مشہور ہو گئے (آبِ بقا، ص ۹)۔

آتش کی شاعرانہ صلاحیّت اور سپاہیانہ بانکپن نے نوّاب مرزا محمد تقی خان 'تَرَقّی'، رئیسِ فیض آباد کو بہت متأثّر کیا، جو فنِ شعر اور سپہ گری دونوں کے دلدادہ تھے [نوّاب کے حالات کے لیے دیکھیے قیصر التواریخ، ۱: ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۴؛ نجم الغنی: تاریخ اودھ، ۴: ۲۳۴؛ آبِ بقا، ص ۱۷۲]۔ آتش اور ان کے ہم عصر ناسخ دونوں نے نوّاب صاحب موصوف کی ملازمت اختیار کر لی۔ جب نوّاب محمد تقی خان نوّاب غازی الدّین حیدر کے عہد [رجب ۱۲۲۹ - ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ / جولائی ۱۸۱۴ - اکتوبر ۱۸۲۷ء] میں [وفاتِ بہو بیگم کے بعد، جو محرّم ۱۲۳۰ھ / جنوری ۱۸۱۵ء میں ہوئی، فیض آباد سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ آ گئے، (دیکھیے تاریخ فرح بخش، ترجمۂ انگریزی، ۲: ۲۹۳)] تو آتش نے بھی لکھنؤ ہی کو اپنا مسکن بنایا۔ لکھنؤ میں آکر رفتہ رفتہ آتش کی صحبت بدل گئی۔ انھیں مطالعے کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے (آبِ بقا، ص ۱۰)۔ مصحفی [م ۱۲۴۰ھ] کے شاگرد وہ فیض آباد سے آتے ہی ہو چکے تھے۔ دیباچۂ دیوانِ ششم (تمام در ۱۲۲۴ھ) میں مصحفی بظاہر آتش کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں (نگار، جنوری ۱۹۳۹ء، ص ۴۹؛ آبِ حیات، ص ۳۸۹؛ آبِ بقا، ص ۱۰؛ انتخابِ آتش، ص ۱۲؛ صفدر مرزا پوری: حُسن خیال] میں آتش و مُصحفی کی نوک جھوک کا ذکر ہے (دیکھیے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ ۱۹۴۴ء، ص ۳۴۳ اور سراج الحق مچھلی شہری در مجلّۂ نگار، نومبر ۱۹۴۰ء)۔ مصحفی کے بیان کے مطابق ابتدا میں فارسی شاعری کی طرف بھی میلان تھا [ریاض الفصحاء، ص ۵]۔

لکھنؤ پہنچنے کے [چند سال بعد] نوّاب محمد تقی خان بہادر 'تَرَقّی' کا انتقال ہو گیا۔ [۱۲۳۴ھ تک نوّاب کے زندہ ہونے کا پتا نجم الغنی: تاریخ اودھ، ۴: ۱۶۶ ببعد سے ملتا ہے: قب فرح بخش (ترجمۂ انگریزی)، ۲: ۳۰۲]۔ ناسخ نے

نوّاب معتمدالدولہ بہادر [وزیر غازی الدّین حیدر بادشاہ] کی ملازمت کر لی، لیکن آتش نے آزاد رہنا پسند کیا۔ اسّی روپیہ مہینہ [واجد علی شاہ نے (جلوس ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ/ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) ایامِ شاہزادگی میں کر دیا تھا (انتخابِ آتش، ص ۱۵؛ آبِ بقا، ص ۱۶: سو روپیہ)۔ آبِ حیات میں ہے کہ فقیر محمد خان گویا اور دوست محمد خلیل اور خواجہ وزیر بھی امداد کرتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں عموماً] توکّل پر گزارہ تھا، مگر اس کے باوجود ایک گھوڑا ضرور بندھا رہتا تھا۔ ''سپاہیانہ، رندانہ اور آزادانہ وضع رکھتے اور اس لیے کہ خاندان کا تمغا بھی قائم رہے کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا، ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن نباہے جاتے تھے۔ سر پر ایک زلف اور کبھی حیدری چُٹّا، کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا سکّہ ہے، اس میں ایک طرّہ بھی سبزی کا لگائے رہتے تھے اور ایک بانکی ٹوپی بھووں پر دھرے جدھر چاہتے چلے جاتے تھے'' [دیکھیے تصویر در مخزنِ علوم و فنون، حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء، ص ۴۷]۔ ''زمانے نے ان کی تصاویرِ مضمون کی قدر ہی نہیں، پرستش کی، مگر انھوں نے جاہ و حشمت سے ظاہر آرائی نہ چاہی نہ امیروں کے دربار میں جا کر غزلیں سنائیں۔ نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے'' (آبِ حیات، ص ۳۷۳ ببعد)۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ نے چند بار بلوایا مگر نہ گئے (جلوۂ خضر، ۲: ۱۰۷)۔

معالی خان (آبِ حیات، ۳۷۳: بالی خان) کی سرائے میں رہتے تھے۔ آبِ بقا (ص ۱۰ ببعد) میں ہے کہ ان کی سکونت محلّۂ ''نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے ماہولال (کذا) کی چڑھائی'' کے اتار پر ایک کچے سے مکان میں تھی؛ اسی کتاب میں (ص ۱۷ پر) ہے کہ آتش کا مکان ماہولال کی چڑھائی پر تھا جہاں اب چونے والی بھٹی ہے [''اب نہ گھر ہے نہ نشانِ قبر''، انتخابِ آتش، ص ۲۲)۔

ایک بیٹا تھا، صاحبزادے کا نام محمد علی تھا، یہ بھی شاعر تھے اور جوش تخلّص کرتے تھے (آبِ بقا، ص ۱۳ ببعد)۔

آتش مذہباً اثنا عشری تھے، لیکن دراصل وہ مذہب کے معاملے میں خاصے آزاد خیال تھے۔ ان کا خاندان صوفیوں اور خواجہ زادوں کا تھا۔ آتش نے اگرچہ پیری مریدی کے طریقے کو سلام کہہ کر درویشی اور فقیری کا آزادانہ مسلک اختیار کیا (آبِ حیات، ص ۳۷۲)، لیکن تصوّف کے بہت سے عقائد نے انھیں متأثّر کیا، جس کا پرتو ان کی شاعری پر ہے۔

[ناسخ کی وفات سے نو سال بعد] ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں آتش نے انتقال کیا۔ ''ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے کہ یکا یک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے'' [آبِ حیات، ص ۳۷۴؛ قبؔ کریم الدّین: تذکرۂ شعراءِ ہند، ص ۳۵۴]۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ وفات لکھی ''خواجہ حیدر علی اے وا مردند''۔ [مکان مسکون میں دفن کیے گئے۔ ان کی ''قبر اب ایک مکان میں شامل کر لی گئی ہے، جس کا ملنا اب ذرا مشکل ہے''۔ آبِ بقا، ص ۱۷۰-۱۷۱؛ انتخابِ آتش، ص ۲۲]۔ [ان کا بیٹا خواجہ محمد علی جوش ۱۲۶۴ھ میں ہیضے سے فوت ہوا؛ آبِ بقا، ص ۱۰، ۱۷۴]۔

[دیوان ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ میں چھپا اور ان کی اپنی تصحیح سے شائع ہوا؛ تذکرۂ شعراءِ ہند، ۳۵۴]۔ ان کے انتقال کے بعد دیوانِ دوم کے اضافے کے ساتھ ان کے شاگرد میر دوست علی خلیل نے مرتّب کر کے [۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء میں] شائع کیا؛ فاضل معاصر قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ ''آتش کے دونوں دیوان مطبع محمدی لکھنؤ نے ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں چھاپے تھے، نسخہ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے (امین اللہ ابن طوفان: تذکرۂ شعراء، پٹنہ ۱۹۵۴ء، ص ۴۹، تعلیقہ)؛ کُلّیات میں صرف غزلیں ہیں۔ [''سوائے غزل کے اَور کسی صنفِ سخن پر قادر نہ تھے''؛ نسّاخ: سخن شعراء، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ، ص ۵]۔ ایک واسوخت [کریم الدّین: گلدستۂ نازنیناں، مطبع رفاہ عام، دہلی ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء ص ۲۴۷ میں، چمن بے نظیر، لکھنؤ ۱۹۲۷ء، ص ۳۱۳ میں (اور انتخابِ آتش، ص ۱۰۲ میں) ملتی ہے۔ چمن بے نظیر، ص ۳۰۲ پر ان کا ایک مخمّس بھی ہے]۔ [کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں کلّیاتِ آتش، طبع کان پور ۱۸۷۱ء و ۱۸۸۴ء موجود ہے اور دیوانِ اوّل و دوم پر مشتمل ہے۔ دونوں طباعتوں میں تعداد اشعار برابر ہے یعنی کلیات کے دونوں دیوانوں میں کل آٹھ ہزار پانچ سو اٹھاون (۸،۵۵۸) بیت ہیں۔ صاحبِ آبِ بقا کے پاس دیوان کا دوسرا ایڈیشن طبع ۱۲۶۸ھ موجود تھا۔ ایک قلمی نسخے کے لیے دیکھیے براؤن: A. Suppl. Handlist of the Muham. MSS.، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۸۵]۔

شاگردوں کی تعداد بہت ہے، جن میں سے اکثر باکمال شاعر ہوے ہیں۔ ان کے کلام سے لکھنؤ کی شاعری کا فروغ ہوا۔ ان میں سے نوّاب مرزا شوق، پنڈت دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ اختر، میر دوست علی خلیل، آغا حجّو شرف [ان کے لیے دیکھیے سخنِ شعراء، ۱۲۹۱ھ، ص ۲۴۴، سیّد سادات حسین خان نام تھا]، نوّاب سیّد محمد خان رند [سراپا سخن، ص ۶۹] اور میر وزیر علی صبا [م ۱۲۷۱ھ؛ سخن شعراء] اپنی اپنی طرز کے بے مثال شاعر ہو گزرے ہیں۔

آتش کی شاعری کے بارے میں مصنّفِ آبِ حیات، ص ۳۷۴ کی رائے ہے کہ ''جو کلام ان کا ہے وہ حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفاے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں'' (تفصیلی نقد و نظر کے لیے دیکھیے انتخابِ آتش، لاہور ۱۹۵۷ء)۔ آتش کے معاصر مولوی کریم الدّین (تذکرۂ شعراءِ ہند، ۳۵۴) نے (گلشن بے خار کے الفاظ میں) یہ لکھنے کے بعد کہ ''روشِ رندانہ اور وضع بے باکانہ رکھتا ہے'' کہا ہے کہ: ''طبیعت اچھی، الفاظ پاکیزہ، محاورہ دلچسپ، روزمرّہ گفتگو با قرینہ رکھتا ہے''۔

ناسخ اور آتش میں معاصرانہ چشمک تھی۔ آزاد لکھتے ہیں: ''ان دونوں صاحبوں کے طریقوں میں بالکل اختلاف ہے۔ شیخ صاحب کے پیرو مضمون دقیق ڈھونڈتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے معتقد محاورے کی صفائی، کلام کی سادگی

کے بندے ہیں اور شعر کی تڑپ اور کلام کی تاثیر پر جان قربان کرتے ہیں‘‘ (آب حیات، بذیل ناسخ)۔ (آتش) کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا، بلکہ کلام کی گرمی اور چمک کی دمک نے استاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اجالے کا امتیاز دکھایا (آبِ حیات، ۳۷۲)۔

امداد امام اثر لکھتے ہیں [کاشف الحقائق، ۲:۱۶۶، ۱۷۰] کہ آتش کے یہاں لطفِ زبان ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی اور محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتی۔ اکثر اعلیٰ درجے کے مضامین بندش پاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں شوخی اور بانکپن ہوتا ہے، [اکثر مضامین فقر و آزادمزاجی سے خبر دیتے ہیں]، کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے۔ غزل گوئی کے لیے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے، ورنہ اشعار، میں جلالت و متانت کی صفتیں حاصل نہ ہوں گی۔ زبان کے اعتبار سے ان کی زبان ناسخ کی زبان سے زیادہ دل فریب ہے، گو اصلاحِ زبان کی حیثیت سے شیخ صاحب کا درجہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان صحتِ لغات کے اعتبار سے شیخ صاحب کی زبان کو نہیں پہنچتی مگر خواجہ صاحب کی زبان کا حسن ایسا ہے کہ چند غلط العام شکلیں جوان کی بعض غزلوں میں دیکھی جاتی ہیں وہ چہرۂ زیبا میں خال کا حکم رکھتی ہیں۔

نوّاب مصطفیٰ خان شیفتہ نے لکھا ہے کہ لکھنؤ والے آتش اور ناسخ دونوں کو وہاں کے مسلّم استادوں میں شمار کرتے اور دونوں کو ہم وزن سمجھتے ہیں، مگر اس تحقیق کی قباحت صاحبِ فہم پر مخفی نہیں (گلشن بے خار، ص۹)؛ غالب کے نزدیک آتش کے یہاں بیشتر اور ناسخ کے یہاں کمتر نشتر ملتے ہیں (خط بنام چودھری عبدالغفور سرور [اردوے مُعلّٰی، طبع مبارک علی، لاہور، ص۱۱۰]۔ نسّاخ نے (محلِّ مذکور) میں لکھا ہے کہ ’’اشعار ان کے پُرمضمون اور بامزہ ہوتے ہیں‘‘۔

مولوی عبدالسّلام ندوی کے قول کے مطابق اردو زبان میں رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ کے جوش اور ان کی سرمستی کا اظہار صرف خواجہ آتش ہی کی زبان سے ہوا ہے (شعر الہند، ۱:۲۱۸)۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھتے ہیں کہ ’’جو حالت پیش آتی تھی اور خیالات پیدا ہوتے تھے ان کو اصلیّت اور جوش و خروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں بانکپن، آزادی، جاں بازی اور شجاعت کے مضامین عمدہ پہلو سے ادا ہوے ہیں‘‘ (آبِ بقا، ص ۱۹)۔

مولوی عبدالحی الحسنی ندوی کا خیال ہے کہ ’’زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پروازی میں ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے اور سوز و گداز میں یہ ان سے آگے ہیں‘‘ (گلِ رعنا، ص ۳۶۱)۔

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ کلام میں تخلّص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنّع اور تکلّف مطلق نہیں ..... نہ بے جا و فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کیے ہیں۔ ترشے ہوے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیّت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کیے ہیں کہ ان کی شاعری مرصّع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں (سکسینہ: تاریخ ادبِ اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۲۱۷ ببعد)۔

مآخذ: (۱) مُصحفی: ریاض الفصحاء، طبع انجمن ترقّیِ اردو، دہلی ۱۹۳۴ء؛ (۲) کریم الدّین و فیلن (Fallon): تذکرۂ شعراءِ ہند، دہلی ۱۸۴۸ء؛ (۳) صفیر بلگرامی: جلوۂ خضر، ج ۲، آرہ (بہار) ۱۸۸۴ء؛ (۴) امداد امام اثر: کاشف الحقائق، طبع دوم، ۲:۱۶۲، لاہور ۱۹۵۶ء؛ (۵) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی: آبِ بقا، لکھنؤ ۱۹۱۸ء (؟)؛ (۶) محمد حسین آزاد: آب حیات، لاہور ۱۹۰۷ء؛ (۷) نوّاب مصطفیٰ خان شیفتہ: گلشن بے خار، طبع دوم، ۱۲۵۲ھ بذیل آتش؛ (۸) قطب الدّین باطن: گلستانِ بے خزاں، معروف بہ نغمۂ عندلیب، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۵ء، ص ۳۰؛ (۹) عبدالسلام ندوی: شعر الہند، اعظم گڑھ، سلسلۂ دارالمصنّفین، عدد ۲۵؛ (۱۰) عبدالحی الحسنی ندوی: گل رعنا، اعظم گڑھ، سلسلۂ مطبوعات دارالمصنّفین، عدد ۲۲، طبع سوم ۱۳۶۴ھ، ص ۳۵۸ ببعد؛ (۱۱) ابواللّیث صدیقی: لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ ۱۹۴۴ء؛ (۱۲) رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو، ترجمۂ مرزا محمد عسکری، طبع لاہور بدون تاریخ؛ [(۱۳) مرتضیٰ حسین فاضل: انتخابِ آتش، لاہور ۱۹۵۷ء]؛ (۱۴) مخزنِ علوم و فنون، حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء، بذیل آتش؛ (۱۵) خلیل الرحمٰن اعظمی: مقدمۂ کلام آتش، لکھنؤ ۱۹۵۹ء؛ (۱۶) *Memoirs of Delhi and Faizābād*، (فیض بخش کی تاریخِ فرح بخش کا انگریزی ترجمہ) ۲: ۲۶۶ – ۳۰۲، الٰہ آباد ۱۸۸۹ء؛ (۱۷) نجم الغنی خان: تاریخِ اودھ، ۴:۱۶۶ ببعد؛ (۱۸) اعجاز حسین: کلامِ آتش، الٰہ آباد ۱۹۵۵ء].

(خلیل الرحمٰن اعظمی و مرتضیٰ حسین فاضل)

الآثارُ العُلْوِیَّہ: یعنی ’’کائنات الجوّ‘‘۔ یہ عنوان عربوں نے ارسطو ⊗ اور تھیوفرسطس (Theophrastus) کی Meteorology (یعنی علمِ حوادثِ سماوی) کے لیے استعمال کیا ہے۔

۱۔ رسالة فی کمیّة کُتُب اَرِسْطُوطالِیس و ما یُحتاجُ الیه فی تحصیل الفلسفة میں الکِندی نے علومِ طبیعیّہ یا (’الطبیعیّات‘) کی کتابوں میں کتاب احداث الجَوّ و الارض (کائنات ہوا اور زمین) کا ذکر چوتھے مقام پر کیا ہے؛ (دیکھیے M. Guidi و R.Walzer: *Uno scritto introduttivo allo studio di Aristotele, Studi su al-Kindī*, i, *Atti della R. Acad. dei Lincei Mem.della classe di scienze morali*، ۶:۶، ۱۹۳۷ء)۔ ’’الطبیعیّات‘‘ کی یہی تقسیم الیعقوبی نے بھی کی ہے، ۱:۱۴۹، جو کتاب

فی الشرائع وھو کتاب المَنْطِق فی الآثار العُلْوِیَّة کا حوالہ دیتا ہے (نیز دیکھیے Klamroth:- *Über die Auszüge aus grie chischen Schriftstellern bei al-Yaqubi*، در *ZDMG*، ۴۱، ۱۸۸۷ء: ۴۱۵-۴۴۲)۔ ''الآثار العُلْوِیّة'' کا عنوان فہرست، ۲۵۱ میں اور ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۵۸ میں بھی آیا ہے۔ جابر کی کتاب البحث میں علم حوادثِ سماویّہ کتبِ متوسّطہ (middle books) میں شامل ہے، یعنی اس کا شمار طبیعیاتی تصانیف میں ہے (دیکھیے P. Kraus: *Jābir b. Hayyān*، ۱: ۳۲۲ ببعد، در *Mém. de l'Institut d' Égypte*، ۴۵، ۱۹۴۲ء).

اَرِسْطُو کے علم طبیعیات اور علم الحیات (biological sciences) کو عربی میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش شروح کے اُن ترجموں کی شکل میں ظاہر ہوئی جو یُوحنّا (یحییٰ) بن البِطْرِیق مَلَکی (Melchite) نے کیے، جو موالیِ خلیفۂ مامون میں سے تھا۔ اس کی Meteorology [کتاب الآثار العلویة] کا ترجمہ قطعی طور پر کسی سریانی اصل سے کیا گیا ہے اور وہ ہم تک دو مخطوطوں کی شکل میں پہنچا ہے، جن میں سے ایک استانبول میں ہے (یکی (Yeni) ۱۱۷۹) اور دوسرا روما میں (Vat. hebor ۳۷۸)۔ ابن البطریق کے ترجمے کی پہلی تین کتابیں جِیرَارْڈ کْرِیْمُونَوِی (Gerard of Cremona) نے لاطینی زبان میں منتقل کیں (دیکھیے Lacombe: *Arostoteles Latinus*، ۱: ۵۶)۔ چوتھی کتاب، یعنی رسالۂ علم الکیمیا *Treatise on Chemistry* کے تین عربی-لاطینی طرز کے ترجموں کی نشان دہی فُوبز (Fobes) نے کی ہے (دیکھیے *Classical philology*، ۱۰، (۱۹۱۵ء): ۲۹۷ - ۳۱۴)۔ ان متون میں سے ایک، جو *ms. cod. Bibl. Nat.*, lat. ۶۳۲۵ میں شامل ہے، اس [لاطینی] ترجمے کی نمائندگی کرتا ہے جو ابن البِطْرِیق کی [عربی] کتاب سے کیا گیا۔

ابوالخیر الحَسَن بن سُوَار [بن بِہْنام] (سالِ ولادت ۳۳۱ھ/ ۹۴۲ء) کی فہرستِ تصانیف میں، جو الفہرست، ص ۲۶۵ میں دی گئی ہے، ایک کتاب الآثار العُلْوِیَّة کا ترجمہ بھی شامل ہے [جو اس نے سریانی سے کیا]۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں کہ اس نام سے واقعی ارسطو کی Meteorology (=علم کائنات الجوّ) مراد ہے۔ علم کائنات الجوّ پر ابن سُوَار کی ایک اَور کتاب [بھی الفہرست میں مذکور ہے یعنی کتاب الآثار المَخِیلة فی الجوّ الحادثة عن البخار المائی وھی الھالة والقوس والضَباب، قب] ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۱: ۳۲۳.

ارسطو کے متن کی شرح کبیر از اُوْلِمْپِی اُوْڈُوْرَس [الفہرست، ۲۵۱ میں مصحّفًا: المقیدورس] *Olympiodorus* کا ترجمہ الفہرست، ص ۲۵۱ کے بیان کے مطابق ابوبِشْر مَتَّی بن یُونس (م ۳۲۸ھ/ ۹۴۰ء) نے اور اسکندر اَفْرُوْدِیْسِی (of Aphrodisias) کی کتاب کا ترجمہ یحییٰ بن عَدِی (م ۳۶۳ھ/ ۹۷۳ء) نے کیا۔ ان ترجموں میں سے کوئی بھی ہم تک نہیں پہنچا۔ فارابی کی شرح کے لیے دیکھیے ابن القِفْطِی، ص ۲۷۹ اور ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۱: ۱۳۸، ابن سینا کی کتاب الشِفاء میں علم کائنات الجوّ اور جغرافیہ موضوع ہیں الفنّ الخامس (پانچویں فن) کا۔ اس کے اُس حصّے کا ترجمہ جس میں چاند کے ہالے اور قوسُ قُزَح کی بحث ہے ہورٹِن (Horten) اور ویڈِمان (Wiedemann) نے کیا (*Meteorologische Zeitschr.*، ۳۰، ۱۹۱۳ء: ۵۳۳ - ۵۴۴)۔ کتاب النَّجاة (طبع قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۲ - ۱۵۷) میں ابن سینا نے کتاب الشِفاء کے مفصّل بیان کا ملخّص دے دیا ہے۔ علم کائنات الجوّ پر ابن رُشد کے تفصیلی مباحث کا عربی ملخّص ہمارے پاس موجود ہے (طبع حیدرآباد ۱۳۶۵ھ).

علمِ کائنات الجوّ کے متعلّق جن خیالات کا اظہار اَرِسْطُو نے شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے اُن سے (بالخصوص اُن سے جو چوتھی کتاب میں درج ہیں) مسلمانوں کے علم الطبیعیات کی تاریخ پر بہت اثر پڑا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے شروع میں معتزلی متکلّم النَظّام [رک بآن] نے دہریوں کی پیش کردہ چار بنیادی صفتوں (''قُوًی غریزیّة'') سے متعلّق عقیدے پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اسے محض استبدادی تصوّر کرتا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد صرف قوتِ لامسہ پر ہے (''لمس''، ''ملسمہ'' [والصواب: ملمسہ] =(τσ απτιχσν)۔ اسے دونوں قسم کے بخارات کے بنیادی نظریّات کا پورا پورا علم تھا (بخار ارضی، بُخار مائی αναθυμιασιζ ατμιζι) اور اس نے سمندر کے نمکین ہونے پر بھی ایک راے کو مشرّح طور پر بیان کیا ہے، (دیکھیے اس کی کتابوں کے اجزا کے بعض اقتباسات جو الجاحظ نے کتاب الحَیَوان، ج ۵ [ص ۱۴ ببعد] میں پیش کیے ہیں)۔ جابر کے نِظام میں عناصر کا نظریہ صاف طور پر اَرِسطو کے نظریے پر مبنی ہے (دیکھیے Kraus: کتاب مذکور، ۱۶۳ ببعد)۔ گو ارسطو نے اس اصول کو صرف مبہم طریق پر ہی پیش کیا تھا (۳۳۹ الف، ۲۰ ببعد)۔ علم کائنات الجوّ کی عربی روایات میں، ابن البِطْرِیق سے ابن رُشْد تک سب نے، زمین پر تاثیرِ افلاک کے اصول کی تاویل نجومی نظریے کے مطابق پیش کی ہے۔ اس نجومی نظریے کی تفسیر کے لیے دیکھیے مثلاً کتاب مسمّٰی بہ [خزانة الاسکندر] *Treasure of Alexander*، جس کے عربی متن کا اقتباس رُسْکا (Ruska) نے *Tabula smaragdina*، ص ۸۰ پر دیا ہے، اس نظریے کے مطابق ''دنیائے زیریں دنیاے بالا کے تابع ہے اور دنیاے زیریں کے اجسام منفردًا دنیاے بالا کے اجسام کے حکم کے تابع ہیں، کیونکہ ہوا اِدھر ظاہرِ اجسامِ [ارضی] سے اور اُدھر افلاک سے متّصل ہے''۔ سرّ الخلیقة میں، جو کیمیا گری کی کتاب ہے، جسے بلیناس طُوَانِی (Apollonius of Tyana) سے منسوب کیا جاتا ہے (دیکھیے کراؤس (Kraus: کتابِ مذکور، ص ۱۴۷، حاشیہ ۲)۔ افلاک کی تاثیر کا تخیّل نظریۂ پیدائشِ عالم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جس کی رُو سے معدنیات، نباتات اور حیوانات کا مسلسل نشوو ارتقا فلک کی تیز رفتاری کا نتیجہ ہے۔ یہ خیال ابن البطریق کے *Meteor*، ۱/۱ ('علم کائنات الجوّ') کی تفسیر میں بھی موجود ہے۔ ''اُن جسموں اور چیزوں کی حرکت جو زمین سے متعلّق ہیں اور جنھیں (آسمانی اجسام) حرکت دیتے ہیں، مثلاً پودے، حیوانات و

معدنیات وغیرہ کی پیدائش، اگران کے ہیئت بدلنے اور تحوّل قبول کرنے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حرکت سماوی اثرات سے پیدا ہوتی ہے''۔ اس نظریے کی تشریح اخوان الصفاء، رسائل، ۲: ۵۴ ببعد باب آثار العُلوِیّہ میں بھی تفصیل سے دی گئی ہے۔ علی ابن رَبَّن الطَّبَری نے فردوس الحکمۃ، ص ۲۱ میں اسے بالصراحت ارسطو سے منسوب کیا ہے۔ نیز دیکھیے ابن رشد: الآثار العُلوِیّۃ، ص ۶.

۲۔ تیو فرسطس (یا ثاوفرسطس) Theophrastus کی کتاب الآثار العُلوِیّۃ (Περι μεταρσιων)، کا یونانی اصل ناپید ہے، اس کے ایک حصّے کا ترجمہ تو مشہور و معروف [ابو] الحسن [عیسٰی، دیکھیے W. Wright: *A Short History of Syriac Literature*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۲۲۸] بن بَہلُول [الاوانی] الطِّیرُہانی (اس کلمۂ نسبت کا صحیح تلفّظ یہی ہے، دیکھیے ابن ابی اُصَیبِعَہ، ۱: ۱۰۹) نے کیا تھا، دیکھیے Bergsträsser: *Neue meteorologische Fragmente des Theophrast* (*Sitzungber.der Heidelb.Akad.der Wiss. Phil-hist. Kl.*، ۱۹۱۸ء: ۹)۔ اس کا سریانی متن، جس کا ترجمہ بَرْ بَہلُول [یعنی ابن بہلول مذکور] نے کیا ہے، ہم تک پہنچا ہے، دیکھیے Drossaart Lulofs: *The Syriac translation of Theophrastus's Meteorology Autour,d' Aristote. Recueil d'études offert à A. Mansion*، لُوو َین (Louvain) ۱۹۵۵ء، ص ۴۳۳-۴۴۹.

(برنارڈ لُوئس B. LEWIS)

[فارسی میں بھی آثار عُلوِیّہ پر چند کتابیں لکھی گئیں۔ بعض کا حال درج ذیل ہے:

خواجہ امام ابو حاتم مظفّر اسفزاری معاصرِ عُمر الخیّام، جو علومِ ہیئت، علم الاَثقال و حِیَل کا ماہر تھا اور ریاضیّات و آثارِ عُلوِیّہ وغیرہ پر کئی کتابوں کا مصنّف (بیہقی: تتمّۃ صوان الحکمۃ، لاہور ۱۹۳۵ء، ص ۱۱۹ ببعد)، اُس نے پانچویں صدی کے اواخر میں ابو المظفّر علی فخر الملک ابن نظام الملک کے نام پر جو بَرْکِیَارُق (مقتول ۴۸۸ھ میں) کا (۴۸۸ھ میں) اور سنجر (م ۵۵۲ھ) کا وزیر تھا ایک رسالہ موسوم بہ آثار عُلوِی لکھا (اس کے اقتباس کے لیے دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۶۲-۶۶)۔ جس رسالے میں یہ اقتباس درج ہوا ہے وہ شرف الدّین محمد بن مسعود المسعودی کی تصنیف ہے اور اُس کا عنوان ہے: رسالہ در معرفتِ عناصر و کائنات الجوّ (دیکھیے وہی میگزین، ص ۳۱-۹۱)۔ یہ مسعودی الکفایۃ فی علم الھیئۃ کا مصنّف بھی ہے؛ اس کتاب کا فارسی ترجمہ خود اسی نے جہانِ دانش کے نام سے کیا، جس کے متعدّد نسخے موجود ہیں۔ نویں صدی ہجری کے اواخر میں غیاث الدّین علی ابن علی امیران الحسینی الاصفہانی نے دانش نامۂ جہان آثار عُلوِی پر لکھا (دیکھیے ریو، ۴۳۹ ب)۔ (اسی مصنّف نے ۸۹۲ھ میں ایک مختصر سا رسالہ، جو فوائدِ نجومی پر مشتمل ہے، بدخشان میں لکھا؛ یہ رسالہ موجود ہے)۔ اصفہانی مذکور نے (کتاب مذکور: اصل ۲۰) جو کچھ بطونِ زمین میں حادث ہے اسے بھی آثارِ عُلوی میں شامل کیا ہے۔ اور ایسا کرنے کی توجیہ بھی بتائی ہے؛ چنانچہ حاجی خلیفہ نے بھی علم آثار العلویہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں، یعنی کائناتِ جوِّ عالی، آثارِ روے زمین، آثارِ زیرِ زمین].

آجُرُّوْمِیّہ: رک بہ ابن آجُرُّوم. *

آچے: رک بہ اَچے. *

آحاد: رک بہ خبر واحد و حدیث. *

آخال تکّہ: ۱۸۸۲ اور ۱۸۹۰ء کے درمیان آخال تکّہ ایک ضلع (uězd) کا نام تھا، جو ماوراے بحیرۂ خزر کے روسی علاقے ('oblast) میں واقع تھا اور جسے روسیوں نے ۱۸۸۱ء میں فتح کر لیا تھا۔ یہ ذیل کی تقسیمات جزئی پر مشتمل تھا: (۱) اَتک [رک بآن]، اس کا اہم مقام موضع کاخَکہ تھا؛ (۲) دُرُون [رک بہ Durūn] (دَرُون؛ اس کا اہم مقام بَخَرْدِن تھا)۔ ۱۸۹۰ء سے اس ضلع کا نام عشق آباد [رک بآن] ہے۔ آخال (یہ کلمہ جدید الاستعمال ہے) ان نخلستانوں کا نام ہے جو کوپت داغ اور کوْرِن داغ کی شمالی ڈھلان پر واقع ہیں؛ تکّہ یا تکِہ [رک بآن] سے مراد ترکمان ہیں، جو آج کل اِس علاقے میں آباد ہیں۔ قرونِ وسطٰی کے اسلامی جغرافیہ دانوں نے اس علاقے کا کوئی خاص نام نہیں لکھا۔ اس میں ایرانی آباد تھے، جو آبپاشی کے ماہر تھے۔ شہرِ نَسا [رک بآن] [بفتح یا بہ کسرِ نون] اسی خطّے میں آباد تھا، مگر اب کھنڈر ہو چکا ہے اور کسی زمانے میں شہرستان کا سرحدی قلعہ تھا۔ (شہرستان نَسا کے شمال میں تین فرسنگ کے فاصلے پر تھا) اور یہیں فَراوَہ (اَفْراوَہ) بھی تھا، جو موجودہ قیزیل اَرْوَت [محرّف از قِیزِیل رُباط = لی سٹرینج: *Lands* etc، ص ۳۸۰] کے قریب ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں یہ ملک اُزْبکوں کے زیرِ نگیں آ گیا اور اسے صُوْبُوْیُو (طرفِ آب) (یعنی خاص خوارِزْم) کے مقابلے میں تاغ بُوْیو (طرفِ کوہ) کہنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہرِ نَسا اس زمانے تک موجود تھا لیکن بعد میں بالکل برباد ہو گیا، اس لیے کہ آب رسانی میں غفلت برتی گئی؛ اس زمانے میں دُرُون (دَرُون) کا ذکر بھی آتا ہے۔ جب رُوس نے یہ علاقہ فتح کیا تو اس میں کوئی شہر باقی نہ تھا، عشق آباد اور قیزِیل اَرْوَت روسیوں کے دورِ حکومت ہی میں آباد ہوے، پہلے نہ تھے۔ اس علاقے میں زلزلے بہت آتے ہیں (مثلاً ۱۸۹۳ء، ۱۸۹۵ء، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۴۸ء میں یہاں زلزلے آئے).

مآخذ: (۱) Brockhaus-Efron: *Entsiklope dičeskiy Slovar'*، طبع اوّل، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۱ء، ۲: ۵۲۶ ببعد اور ۱۲، نقشہ بعد ص ۱۶۰؛ (۲) *Bol'shaya Sovyetskaya Entsiklopediya* طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ۳: ۵۶۲

(تربیّتِ اسپان)، قبؔ نیز ماخذ بذیل مادّۂ عَشق آباد.

(شپولر B. SPULER و بارٹولڈ W. BARTHOLD)

---

* **آخالُچِخْ:** رکؔ بہ آخِسْخَہ.

---

* **آخِرَت:** یہ لفظ آخِر کا مؤنّث ہے، یعنی ''سب سے بعد کی''۔ یہ اصطلاح قرآن [مجید] میں حیات بعد الموت کے لیے استعمال ہوئی ہے، جو بقول مفسّرین اصل میں الدّارُ الآخِرۃ ہے، یعنی آخری گھر؛ اُس کی ضد (الدّار یا الحیاۃ) الدُّنْیَا ہے، یعنی نزدیک تر یا نزدیک ترین مسکن یا زندگی، یعنی موجودہ دنیا۔ آخرت کا مرادف مَعَاد ہے۔ یہی تضاد ''دارالبقاء'' (یعنی ابدی زندگی کا گھر) اور ''دارالفَنَاء'' (یعنی فنا کا گھر) سے بھی ظاہر ہوتا ہے؛ نیز ء-ج-ل اور ع-ج-ل کے مادّوں سے۔ آخرت سے دوسرے جہان میں سعادت و شقاوت کے اعتبار سے نفسِ ناطقہ کے احوال بھی مراد ہیں اور اس کی ضدّ بھی لفظِ ''دنیا'' ہی ہے، جس سے مراد ہے موجودہ دنیا میں آدمی کا بہرہ، خصوصًا دنیاوی عیش و مسرّت؛ زیادہ اصطلاحی رنگ کی کلامی اور فلسفی تعبیرات کی بنا انھیں معنوں پر ہے، جیسے کہ حشرِ موتٰی کا حال، خواہ جسمانی ہو یا غیر جسمانی۔ حکما کی اصطلاح میں، جو حشرِ اجساد کے منکر ہیں، آخرت کا اطلاق معادِ روحانی پر ہوتا ہے (نیز ملاحظہ ہو دُنیا) [اور مادّۂ القیامت، بعث].

مآخذ: (۱) لین (Lane): مدّالقاموس، بذیلِ مادّہ؛ (۲) تھانوی: کشّاف اصطلاحات الفنون، طبع شپرنگر، بذیلِ مادّہ؛ (۳) غزّالی: اِحیاء عُلومِ الدّین، کتاب ۴۰ اور دیگر مواضع کثیرہ؛ (۴) فخر الدّین الرّازی: محصّل، رکن ۳، قسم ۲.

(ٹُرِٹَّن A. S. TRITTON)

⊗ **آخری چہار شنبہ:** ماہِ صفر کا آخری بدھ، جسے پاکستان اور ہندوستان کے [بعض] مسلمان تہوار کی طرح مناتے ہیں۔ ان میں عیدَیْن، شبِ برات اور آخری چہار شنبہ سال کے چار بڑے تہوار ہیں۔ آخری چہار شنبہ اس لیے مناتے ہیں کہ مشہور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن بیماری میں تخفیف محسوس کی اور غسل فرمایا اور اس دن کے بعد پھر غسل نہ فرمایا، کیونکہ چند ہی دن کے بعد مرض میں شدّت ہوئی تا آنکہ ربیع الاوّل میں آپؐ نے پیر کے دن انتقال فرمایا.

حضورؐ کی علالت کا آغاز صفر کے چہار شنبے سے ہوا۔ مگر مدّتِ علالت اور تاریخِ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، دیکھیے سیرۃ النبی، ۱/۲: ۱۷۱، س ۲ جس میں اس پر مفصّل بحث موجود ہے۔ ان روایات میں تاریخِ وفات ۱۲ اور ۲ اور یکم ربیع الاوّل بتائی گئی ہے۔ ان تاریخوں میں سے یکم ربیع الاوّل کو ترجیح ہے۔ زیادہ تر روایات سے علالت کی کل مدّت چہار شنبہ ۱۸ صفر سے شروع کر کے ۱۳ دن ہوتی ہے (قبؔ ابن ہشام، ص ۹۹۹، وہاں ہے کہ علالت کی ابتدا، صفر کی کچھ راتیں باقی تھیں جب ہوئی یا ماہ ربیع الاوّل میں ہوئی)۔ علالت کے دوران میں جب تک آمد و رفت کی طاقت رہی آپؐ مسجد میں جا کر نماز پڑھاتے رہے اور ایسا بھی ہوا کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر آپؐ کو مسجد میں لائے۔ (حبیب السیر، ۱/۳: ۷۹ میں ہے کہ ایّامِ مرض میں آپؐ دو مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے؛ قبؔ ابن ہشام: سیرۃ، ص ۱۰۰)۔ بہرحال پاک و ہند میں آخری چہار شنبے کے منانے کا رواج پڑا گو اس کے لیے کوئی معتبر سند نہیں ملتی۔ ۱۲ ربیع الاوّل کی رات کو شاہجہان بادشاہ مجلسِ میلاد منعقد کیا کرتا تھا [مصر میں بھی اسی شب کو ''مَوْلِدُ النَّبِیؐ'' منائے جانے کا ذکر لین (Lane) نے انیسویں صدی کے نصف اوّل میں کیا ہے؛ دیکھیے *The Modern Egyptians*، ص ۴۰۸]۔ اس کا ذکر بادشاہ نامے میں سال بہ سال کے وقائع میں آیا ہے مگر آخری چہار شنبے کے منانے کا ذکر اُس میں نہیں ہے.

آخری چہار شنبے کے دن بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ لوگ اس دن غسل کرتے، نئے کپڑے پہنتے اور خوشبو لگاتے ہیں، باغوں میں پھرنے اور سبزے کے روندنے کو مبارک سمجھتے ہیں.

قلعۂ مُعلّٰی دہلی میں ۱۳ صفر کی صبح کو اس تقریب سے دربار لگتا تھا اور شہزادے اور امرا شریک ہوتے تھے، تفصیل کے لیے دیکھیے فرہنگِ آصفیہ، طبع دوم، ۱: ۱۲۶، بذیل آخری چہار شنبہ.

لکھنؤ میں بھی اس دن کوری ٹھلیاں توڑی جاتی تھیں۔ گھڑے یا بدھنے توڑے جاتے تھے۔ چنانچہ کسی کے ہاں برتن زیادہ ٹوٹتے ہیں تو کہتے ہیں: ''آج تم نے آخری چہار شنبہ کر دیا'' (دیکھیے نور اللغات، طبع جدید، کراچی ۱۹۵۷ء، ۱: ۷۸، بذیل آخری چہار شنبہ، آخری چہار شنبہ کر دینا).

آخری چہار شنبے کی رسوم کے لیے جو تفصیل قانونِ اسلام، ۱۴۹ ببعد میں دی ہے اس میں یہ بھی شامل ہے: سات سلام (یعنی قرآنِ مجید، ۳۶: ۵۸؛ ۳۷: ۷۹، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۳۰؛ ۳۹: ۷۳؛ ۹۷: ۵) زعفران، سیاہی یا گلاب سے آم کے چھلکے یا کیلے کے پتوں پر لکھتے ہیں اور انھیں پانی سے دھو کر پیتے ہیں تا کہ مصائب سے محفوظ اور خوش و خرّم رہیں۔ مزدوری پیشہ لوگ کام سے تعطیل مناتے ہیں، اور استاد شاگردوں کو منقّش یا رنگین کاغذ پر ''عیدیاں'' لکھ کر دیتے ہیں وہ انھیں ماں باپ اور رشتہ داروں کو سناتے ہیں اور ماں باپ سے استاد کے لیے انعام لاتے ہیں.

مآخذ: علاوہ ان کے جو اوپر مذکور ہوے: (۱) ابن ہشام: سیرۃ رسول اللہ، ص ۹۹۹؛ (۲) شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ۱/۲: ۱۷۱ ببعد؛ (۳) جعفر شریف دکھنی: *Qanoon-e-Islam*، ترجمہ بہ انگریزی از G. A. Herklots، مدراس ۱۸۶۳ء، اشاریّہ؛ (۴) فرہنگِ آصفیہ، دہلی ۱۹۱۸ء، ۱: ۱۲۶؛ (۵) نور الحسن نیّر کاکوروی: نور اللغات، کراچی ۱۹۵۷ء، ۱: ۷۸، (۶) J. T. Platt: *A Dictionary of*

Urdu etc.، 'بذیل آخری'؛ (۷) E. D. Sell: *The Faith of Islam*، ۱۹۰۷ء، اشاریہ؛ (۸) Garcin de Tassy: *L' islamime d' apris le Coran*، ص ۳۳۴ ببعد.

[ادارہ]

[اب سوال یہ ہے کہ آخری چہار شنبے کے منانے کی مذکورہ رسمیں کہاں سے پیدا ہوئیں؟

گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ روز تین تہواروں یا عیدوں کا مجموعہ بن گیا ہے، یعنی (۱) ماہِ صفر کے آخری چہار شنبے، (۲) چہار شنبۂ سوری اور (۳) سیزدہ بدر کا.

(۱) ماہِ صفر کا آخری چہار شنبہ: اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ (۲) چہار شنبۂ سوری (=خوشی کا بدھ): شمسی سال کا آخری بدھ، [سلیمان حکیم: فرہنگِ فارسی انگلیسی، تہران ۱۳۱۲ھ] جو ایران میں صدیوں سے مسلسل منایا جاتا ہے۔ بہار عجم، ۱: ۳۰۰ میں جو ''چہار شنبۂ سوری'' کو ''چہار شنبۂ آخرین ماہِ صفر'' لکھا ہے درست نہیں ہے اور محمد سعید 'اشرف' مازندرانی (م بعد ۱۱۲۴ھ) کا شعر جو بہار نے سنداً پیش کیا ہے وہ بھی مفیدِ مطلب نہیں ہے.

یہاں چہار شنبۂ سُورِی منانے کی چند رسموں پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے:-

ا- ایرانی اس بدھ کی شام کو مغرب کے وقت کوئی خشک جھاڑی (بُتّہ = بوتہ) یا گھاس پُھوس جلاتے اور خاندان کے سب چھوٹے بڑے افراد اس جلتی ہوئی آگ پر سے پھاندتے ہیں اور کہتے ہیں: ''میری زردی تیری، تیری سرخی میری'' (=زردی من از تو، سرخی تو از من) ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح وہ آئندہ دوسرا چہار شنبہ سوری آنے تک تمام سال خوش وخرم اور سُرخ وسفید رہیں گے.

ب - ایران کی عورتیں اس شب فال لیتی ہیں، اسے فالگوشی کہتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ کسی چوک میں، ایک طرف کو، نسبۃً تاریک جگہ اس طرح کھڑی ہو جاتی ہیں کہ آنے اور جانے والے انھیں نہ دیکھیں یا دیکھیں تو ان کی طرف متوجّہ نہ ہوں۔ پھر دل میں اپنے مدّعا کی نیّت کرتی ہیں، اور راہ گیروں کی گفتگو سے اسی طرح مطلب اخذ کرتی ہیں جیسے لوگ کسی فالنامے کی عبارت، دیوانِ حافظ کے اشعار اور کلام اللہ کی آیات سے مطلب اخذ کرتے ہیں.

ج - ایران کی غریب یا ایسی عورتیں جن کے یہاں کوئی بیمار ہو ایک ہاتھ میں تانبے کا کوئی برتن اور ایک ہاتھ میں چمچہ لے کر لوگوں کے گھر جاتی اور چمچے سے برتن بجاتی ہیں، اسے چمچہ مارنا (=قاشق زنی) کہتے ہیں۔ لوگ کھانے کی کوئی چیز اور چاندی کا سکّہ ان عورتوں کو دیتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ اس چیز کے کھانے سے بیمار شفایاب ہو جاتے ہیں.

(۳) سیزدہ بدر: (=تیرہ باہر)، ایرانی 'سیزدہ' کا عدد منحوس سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اپنے یقین کے مطابق اس عدد کی نحوست سارے سال کے لیے دفع کرنے کو یہ دن مناتے ہیں [دیکھیے فرہنگِ فارسی انگلیسی مذکور، ۱: ۱۴۹]۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عیدِ نوروز سے تقریباً دس بارہ روز قبل جملہ افرادِ خاندان کی طرف سے فی کس ایک مٹھی گندم بھگو دیتے ہیں، وہ دانے پھوٹ آتے ہیں۔ اس سے ایک مراد یہ ہوتی ہے کہ جس طرح یہ دانے سبز ہو گئے اسی طرح یہ عمل کرنے والے سارے سال خوش وخرم رہیں گے۔ سال کے پہلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو تمام اہلِ خانہ سارے مکان کو صاف کرتے، فضول ردّی چیزیں اور پرانے ناکارہ مٹی کے برتن توڑ پھوڑ کر گھر سے نکال پھینکتے ہیں اور فرش، خورونوش اور عیش جیش کے تمام لوازم و سامان اور وہ گندم کا سبزہ، جو اس وقت تک سبز سے زرد ہو جاتا ہے، ساتھ لے کے علی الصبح گھر سے نکل جاتے ہیں، باغوں اور سبزہ زاروں میں ڈیرے جماتے، کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے اور اعالی وادانی، اصاغر واکابر علی العموم نہایت دھوم سے جشن مناتے ہیں۔ اسی دوران میں گندم کا وہ سبزہ بیابان یا کسی نہر میں اس عقیدے کے ساتھ ہر شخص ہاتھ میں لے کے پھینکتا ہے کہ وہ تیرہ کی نحوست پھینک رہا ہے۔ نیز بیاہ کے قابل دوشیزہ لڑکیاں کھیتوں اور باغوں کے سبزے میں اس عقیدے سے گرہ دیتی ہیں کہ ان کا نصیب کھل جائے، یعنی شادی ہو جائے اور گرہ دیتے وقت کہتی ہیں: ''سیزدہ بدر، سالِ دگر بچہ بِبغل، خانۂ شوہر''۔ یہ جشن یک روزہ ہوتا ہے، صرف تیرہ ہی تاریخ کو باہر رہتے ہیں۔ اسی شام کو سب لوگ گھر واپس آجاتے ہیں: چنانچہ مثل ہے؛ تیرہ کو باہر، چودہ کو اندر (=سیزدہ بدر، چہاردہ بِتُو).

مولوی سیّد احمد دہلوی فرہنگِ آصفیہ میں آخری چہار شنبے کے تحت قلعۂ معلّٰی کے آخری چہار شنبے کا جو نظارہ لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفر کی (جسے تیرہ تیزی کا مہینہ کہتے ہیں) تیرھویں تاریخ کو چنے کی سلونی گھنگنیاں لون مرچ ڈال کر اور گیہوں کی پھیکی گھنگنیاں ابال کر اور خشخاش اور کھانڈ چھڑک کر نیاز دینے کے بعد بانٹ دی جاتیں۔ اسی مہینے کے آخری بدھ کو بادشاہ صبح کا دربار کرتے اور بعض رسوم ادا کی جاتیں۔ تیسرے پہر کوری ٹھلیا میں تھوڑا سا پانی اور ایک اشرفی کپڑے میں لپیٹ کے ڈالی جاتی اور بادشاہ کے آگے کھڑے ہو کر اسے سر پر سے پیچھے پھینک دیتے اور ٹھلیا ٹوٹ جاتی۔ تھوڑا سا پھوس جلایا جاتا، بادشاہ اُسے لانگتا۔ تیسرے پہر ہی سبزہ روندنے باغ میں جاتے۔ اسی فرہنگِ آصفیہ میں ''تیرہ تیزی'' کے تحت تحریر ہے: ''ماہِ صفر کے اوّل تیرہ روز، جس میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیمار پڑے تھے؛ اسی وجہ سے یہ مہینہ منحوس خیال کیا جاتا ہے''.

ایرانیوں ہی کے طرز پر نوروز منایا جاتا تھا۔ آخری چہار شنبۂ ماہِ صفر اور چہار شنبۂ سُورِی، میں چہار شنبہ مشترک تھا۔ اس چہار شنبے میں آگ پر سے پھاندنا شامل ہو گیا۔ تیرہ کے عدد کی نحوست رسالتِ مآبؐ کی بیماری کے سبب سے تیرہ دنوں کو مل گئی۔ سیزدہ بدر کا نام تیرہ تیزی ہوا۔ سبزہ روندنے اور سبزہ زار میں جشن منانے کا اشتراک ہوا۔ گھر سے فضول چیزیں خارج کرنا ٹھلیاں توڑنے کی صورت میں ظاہر

ہوا۔ گندم سبز کرنے کے عوض گندم کی گھنگنیاں بنیں۔ اس طرح یہ عید تین عیدوں کا مجموعہ بن کر رواج پا گئی۔

(مرزا ہادی علی بیگ)

---

* **آخِسْخَہ**: [اَخِسْقَہ یا اَخِسْکَہ] (در عالم آرائے) یا اَخِسْکَہ (دیکھیے بذیل آبازہ)]: ایک شہر کا ایرانی و ترکی نام ہے، جسے گرجستانی زبان میں اَخال تْسیخِہ (Akhal Tsikhe)، [=''نیا قلعہ''] کہتے ہیں اور جو دریائے پوسْخوف (Poskhov) پر (جو بالائی دریائے کُر کے بائیں کنارے کا معاون ہے) واقع ہے۔ یہ گرجستان کے صوبۂ سَمْتْسْخِہ [یا مِسْق Meschio] کا مرکز ہے (جو بعد میں Sa-atabago کہلایا) اور جس کا شمار حَبیب بن مَسْلَمَہ کی فتوحات (بعہدِ معاویہؓ) کے ذیل میں [بنام سَمْتْسْخِی] البلاذری، ص [۲۰۲] میں آیا ہے۔ [ان مقامات کے لیے دیکھیے ایلن (Allen) کا نقشۂ جارجیا، اَخال تْسیخِہ اردہان کے عین شمال میں ہے، نیز دیکھیے ایلن، ص ۵۹].

منگولوں کے زمانے میں مقامی فرمانرواؤں نے (جو خانوادۂ جَکِلْعِہ (Djakil'e) سے تعلق رکھتے تھے [ان کے لیے دیکھیے ایلن Allen]) خود اختیاری حاصل کر لی اور انھیں ''اتابیگ'' کا خطاب دیا گیا۔ قُرْقُوْرَہ [Qwarqwaré، در ایلن، ص ۱۴۵، ۱۵۵ وغیرہ] کا نام، جو ایرانی اور ترکی مآخذ میں آیا ہے، انھیں فرمانرواؤں سے متعلّق ہے، اس لیے کہ ان میں سے متعدّد فرمانروا قُوارِہ (Ḳuarḳuare) کہلاتے تھے (ملاحظہ ہو Brosset: *Histoire de la Géorgie*، ج ۲)۔ ۱۹۷۹ء میں آخال تْسیخِہ (Akhal Tsikhe) پر عثمانیوں نے قبضہ کر لیا اور وہ اس علاقے میں اسلام اور عثمانی رسم و رواج پھیلانے میں کامیاب ہوے۔ ۱۶۲۵ء میں ترکی پاشاؤں نے ملکی انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ آخال تْسیخِہ نے ایک خاص جنگی اہمیّت حاصل کر لی اور قفقاز (کاکیشیا) کی بردہ فروشی کی ایک بڑی منڈی بن گیا؛ قپّ حاجی خلیفہ: جِہان نُما، ص ۴۰۸ ببعد۔ [اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، اس کے لیے ملاحظہ ہو ایلن (Allen)، ص ۲۸۳ ببعد]۔ [شاہ طہماسپ اور سلطان سُلیمان دونوں نے گرجستان کو دو طرف سے شکنجۂ قتل و غارت میں جکڑ رکھا تھا۔ ۹۶۱ھ میں ان میں معاہدہ ہوا، جس کی رو سے مِسْق و کارتیل و کاخت ایرانیوں سے اور مشرقی بحر اسود کے متّصلہ علاقے (باشی آچوق، دادیان، گوریان) طرابزُون تک رومیوں سے متعلّق ہوے۔ غرض اَخِسْقہ، جو اعمالِ مِسْق میں سے ہے، قزلباشوں کے سپرد ہوا مگر شاہ طہماسپ اوّل کی وفات (۱۵ صفر ۹۸۴ھ / ۱۴ مئی ۱۵۷۶ء) کے بعد عثمانیوں کے قبضے میں آیا (عالم آرائے عباسی، ص ۶۵، ۷۰۹)۔ اس کے بعد شاہ عبّاس اوّل کے دورِ حکومت میں (۹۹۵ - ۱۰۳۸ھ / ۱۵۸۷ - ۱۶۲۹ء) قلعۂ اَخِسْقہ ۱۰۱۷ھ / ۱۶۰۸-۱۶۰۹ء سے ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ - ۱۶۲۷ء تک قزلباشوں اور ترکان عثمانی کے درمیان بدستور محلّ نزاع بنا رہا۔ ۱۰۱۷-۱۰۱۸ھ میں، جب ترک اس پر قابض تھے، قزلباشوں نے اس نواح کو تاخت و تاراج کیا، ۱۰۲۳ - ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۴ - ۱۶۱۵ء میں قزلباشوں نے اس سے قریب سوران میں قلعہ بنایا (عالم آرائے عباسی، ۵۵۶ و ۶۱۶)۔ ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۲ - ۱۶۲۳ء میں قزلباشوں نے اسے ترکوں سے لے لیا، مگر ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۵ء میں ترک پھر اس پر قابض ہو گئے۔ ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۷ء میں قزلباش اسے واپس لینے میں پھر کامیاب ہو گئے (محلّ مذکور، ص ۷۰۹، ۷۲۵، ۷۴۶)۔ ۱۸۲۹ء میں یہ شہر روسیوں نے اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) کے بعد سے یہ شہر گُرجستان کی جمہوریات شوروی (Georgia S. S. Republics) کا ایک حصّہ ہے۔

مآخذ: علاوہ ان کے جو مقالے میں مذکور ہیں، دیکھیے (۱) اسکندر منشی: عالم آرائے عباسی، ص ۷۰۹ و ۷۲۵ و ۷۴۶؛ ۵۵۶، ۶۱۹؛ (۲) W. E. D. Allen: *A History of the Georgian People*، لنڈن ۱۹۳۲ء بہ امدادِ اشاریہ بذیل Akhalzikhé۔ اس کتاب میں نقشۂ جارجیا بھی ہے].

(V. Minorsky مِنَوْرسکی)

---

* **آخُور**: رک بہ امیر آخور.

---

* **آدامَاوَہ**: رک بہ اَدمَوَہ.

⊗ **آدمؑ**: ابوالبَشَر (یا ابومحمد) ملقّب بہ صَفِیّ اللہ، مُجْتَبٰی اوّل، مسجودِ ملائک، خلیفۃ اللہ فی الارض اور پہلے نبی تھے.

لفظِ ''آدم'' کے اشتقاق کے بارے میں علماے لغت میں اختلاف ہے کہ یہ عربی ہے یا اعجمی۔ ابن دُرید نے ''آدم'' کا اشتقاق دو طرح سے بیان کیا ہے: (۱) اُدْمہ (گندم گون) سے بمعنی بیّن الاُدْمَۃ؛ (۲) آدم (بمعنی سفید) جیسے ظَبْیٌ آدَمُ یا جَمَلٌ آدَمُ یعنی ایسا ہرن یا اونٹ جس کی گردن اور ٹانگیں دراز ہوں، پیٹ سفیدی مائل اور پشت مشکیں ہو۔ ابومنصور الجَوَالیقی کے نزدیک جملہ انبیا علیہم السلام کے نام اعجمی ہیں، باستثناے آدمؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور محمدؐ۔ الجوہری نے بھی آدم کو عربی نام بتلایا ہے اور اسے اَفْعَل کے صیغے پر قیاس کیا ہے۔ بعض علما کے نزدیک آدم کا اشتقاق اَدیم (سطح یا جلد، ادِیم الارض = وجہ الارض) سے ہے، یعنی آدمؑ سطحِ زمین سے پیدا کیے گئے۔ بعض نے اس لفظ کو اَدْم یا اُدْمہ سے ماخوذ قرار دیا ہے، جس کے معنی موافقت اور شرکت کے ہیں؛ چنانچہ اس مفہوم میں آدمؑ کے مختلف قوی اور عناصر کی ترکیب داخل ہے، اس لیے کہ ان کا خمیر مٹی اور پانی سے ملا کر اٹھایا گیا۔ بعض نے لفظ ''آدم'' کو اَدَمہ سے مشتق گردانا ہے یعنی قابلِ اتّباع۔ مگر الزّمخشری نے ''آدم'' کو اعجمی قرار دیا ہے۔ آدم کی جمع اَوَادِم اور اس کی تصغیر اُوَیْدِم ہونا (یعنی دونوں صورتوں میں واو کے ساتھ ہونا) اس امر پر دلالت

کرتا ہے کہ یہ لفظ اعجمی ہے ورنہ جمع اور تصغیر دونوں میں ہمزہ آتا۔

عبرانی میں אָדָם (=آدام) بمعنی آدمی اور جنسِ بشر ہے، فینیقی اور سبائی میں بھی کلمے کی یہی صورت ہے لیکن نولڈیکہ کے نزدیک = اَنام (دیکھیے براؤن۔ ڈرائور برِگز: *Hebrew and English Lexicon*، اوکسفرڈ ۱۹۰۶ء، ص۹)۔ آرامی میں ’ܐܕܡ (عبرانی کلمۂ مذکّر) بمعنی آدم (Adam) اور بشر (Man) ہے؛ Payne Smith: *Syr. Eng. Dic.*، اوکسفرڈ ۱۹۰۲ء۔ انگریزی ادب اور دیگر زبانوں میں ’’آدم‘‘ اور ’’آدم وحوّا‘‘ (Adam, Adam &Eve) کے لفظ انجیل اور تورات کی وساطت سے پہنچے ہیں۔ سِفرُ التکوین (۳:۲۰) میں ہے کہ آدم نے اپنی بیوی کا نام حوّا، חַוָּה، رکھا، اس لیے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے (نیز دیکھیے *Heb. Eng. Lex.*، بذیلِ کلمہ)۔ ’’آدم‘‘ یا ’’آدم وحوّا‘‘ سے مراد کسی فن کا موجد، قبیلہ یا قوم کا بڑا سردار اور مورثِ اعلیٰ بھی ہے، جیسے ’’ولی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم ہوا ہے‘‘، نیز قبؔ W. D. Whitney: *Language and the Study of Languages*، لنڈن ۱۸۸۴ء، ص۳۹۶.

اسی طرح اردو اور فارسی ادب میں آدم سے متعلّق کئی تلمیحات موجود ہیں.

قرآن مجید میں لفظ ’’آدم‘‘ پچیس بار آیا ہے۔ آفرینشِ آدم اور شجرۂ منہیّہ کا قصّہ سورہ ۲۰ [طٰہٰ]: ۱۱۴ بعد میں، جو اوائل دورِ مکّی سے متعلّق ہے، مذکور ہوا ہے۔ دیگر مقامات کے لیے دیکھیے: ۱۵ [الحجر]: ۲۶ بعد؛ ۳۸ [ص]: ۷۱ - ۸۵؛ ۱۷ [بنی اسرآئیل]: ۶۳، بعد؛ ۱۸ [الکہف]: ۵۰؛ ۷ [الاعراف]: ۹ - ۲۵؛ ۲ [البقرۃ]: ۲۸ - ۳۶.

جنّات اور ملائکہ کی تخلیق آدمؑ سے پہلے ہو چکی تھی۔ آدمؑ کا قالب خشک گارے کی کالی مٹّی سے تیّار کیا گیا تھا، جو ہر طرح کی حالت قبول کرنے کی صلاحیّت رکھتی ہے، پھر پختہ ہونے پر اس میں اللہ کی روح سے جان پھونک دی گئی (قبؔ نووی، ۱:۹۶، س ۱۵ بعد)۔ خِلقتِ آدم کی غرض و غایت آدم اور نسلِ آدم کے ذریعے سے جہانبانی اور وظیفۂ خلافت کا ادا کرنا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر (اپنا) خلیفہ یا نائب (یعنی ’’خلیفۃ فی العلم‘‘، محمد عبدہٗ، ۱:۲۶۱) بنا رہا ہوں تو فرشتوں نے (بطریقِ استفادہ) عرض کیا کہ اے اللہ کیا تو دنیا پر ایسی ہستی کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں خون خرابہ کرے گی، حالانکہ ہم تیری حمد و تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں (یعنی ہم تجھی کو ہر قسم کے عیب و نقصان سے پاک و مبرّا سمجھتے ہیں اور تیرے سوا عیب سے کوئی پاک اور منزّہ نہیں، پس یہ مخلوق بھی عیب سے پاک نہ ہوگی اور اس میں ضرور مفسد و خونریز بھی ہوں گے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ فرشتوں نے جنّات کے خون خرابے سے جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے قیاس کیا کہ یہ نئی مخلوق بھی ویسی ہی سفّاکی کرے گی اور فساد برپا کرنے میں مصروف ہو جائے گی۔ بعض کے نزدیک بنی نوع انسان اس خطّۂ زمین پر آدمؑ کے ہبوط سے پہلے بھی موجود تھے اور ان میں خونریزی اور فساد رواج پا چکا تھا؛ (دیکھیے محمد عبدہٗ، ۱:۲۵۷).

تب اللہ نے آدمؑ کو اشیاے عالَم کے نام سکھلا دیے۔ اللہ نے جب فرشتوں سے اشیا کے احوال و اوصاف پوچھے تو انھوں نے اپنی عاجزی کا اعتراف کیا، مگر جب آدمؑ سے پوچھا گیا اور انھوں نے سب امور ملائکہ کو بتلا دیے تو اللہ نے فرمایا: کہو، کیا میں نے نہ کہا تھا کہ میں ارض و سماوات کے جملہ مخفی امور جاننے والا ہوں۔ اس پر فرشتوں کو، جن کے زمرے میں ابلیس بھی جو کہ ناری الاصل تھا شامل ہو چکا تھا، [’’بظاہر جنّ فرشتوں کی صنف تھے، محمد عبدہٗ، ۱:۲۶۵] حکم ملا کہ آدمؑ (بشر) کو سجدہ کریں [سجدۂ عبادت مراد نہیں، السجود = التطامن و الخضوع و الانقیاد، محمد عبدہٗ، ۱:۲۶۵]۔ سب نے تعمیل کی صرف ابلیس نے اطاعت سے سرتابی کی۔ اس نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جملہ خلائق پر فضیلت اور بزرگی دی ہے، آتشِ حسد سے جل اٹھا اور اس نے کہا کہ میں آگ سے بنا ہوں اور آدم خاک سے۔ میں خاکی کے آگے کیونکر جھک سکتا ہوں (آگ پر خاک کی برتری کے اثبات کے لیے دیکھیے [نووی، ۱:۱۶] و ابن القیّم: بدائع الفوائد، ۴:۱۳۹-۱۴۱)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے ابا و استکبار پر جنّت سے نکل جانے کا حکم دیا اور جب سے وہ علانیہ آدمؑ اور ان کی آل و اولاد کا دشمن ہو گیا۔ ابلیس نے روزِ قیامت تک کی مہلت مانگی اور کہا: اے اللہ میں تیرے بندوں کو سبز باغ دکھلا کر گمراہ کرتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دے دی.

آدمؑ اور حوّا جنت میں رہتے تھے، مگر انھیں شجرۂ ممنوعہ کے قریب جانے سے روکا گیا تھا، ابلیس نے وسوسہ اندازی کر کے آدمؑ اور ان کی زوجہ دونوں کو بہکا دیا اور وہ دونوں ابلیس کے داؤ میں آ گئے۔ جوں ہی انھوں نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل چکھ لیا ان پر اپنی برہنگی کھل گئی اور وہ جنّت کے پتوں سے اپنا بدن ڈھانپنے لگے، تب اللہ نے ان سب کو وقتِ معیّن کے لیے زمین پر اتار دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر آدمؑ پر نوازش کی اور انھیں برگزیدہ کیا اور اپنی رحمت سے چند کلمات انھیں القا کیے اور ان کی توبہ قبول کی اور جب سے حضرت آدمؑ نبی ہوے۔ بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ ان کے جسم سے نورانی لباس معًا اتر گیا۔ سیّد احمد خان نے آدمؑ کے سارے قصّے کو ایک تمثیل قرار دیا ہے اور ’’سوأۃ‘‘، یعنی برہنگی کو استعارہ سمجھ کر ’’برائیوں‘‘ سے تعبیر کیا ہے اور ’’لباس‘‘ سے مراد ’’تقوٰی‘‘ لیا ہے؛ (دیکھیے تفسیر، ۳:۱۰۶ بعد حاشیہ)۔ اس قصے کی تمثیلی صورت کی مفصّل تقریر کے لیے دیکھیے محمد عبدہٗ، ۱:۲۸۱ بعد۔ اس میں سے ایک عبارت کا مختصر ترجمہ درج ذیل ہے، قصّے کے ابتدائی امور کی تفسیر کے بعد وہ لکھتے ہیں (۱:۲۸۲) کہ اس سے آگے کی تفسیر اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ: جنت سے مراد آرام و راحت کی حالت لینا صحیح ہے، کیونکہ نعمتوں سے پُر باغات میں انسان کو راحت و سکون ملنا یقینی ہے۔ یا اس سے مراد بےفکری اور خوشی کی کیفیّت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آدم سے ایک شخص نہیں تمام نوعِ انسان مراد لی جائے، جیسے قبیلے کے باپ کے نام سے سارا قبیلہ مراد ہوتا ہے۔ درخت ممنوعہ سے مراد برائی اور ہٹ دھرمی لی جا سکتی ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر کلمۂ طیبہ کو شجرۂ

طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کو شجرۂ خبیثہ کہا گیا ہے (۱۴[ابراہیم]: ۲۴-۲۶)۔ جنّت میں رہنے کے اور وہاں سے نکل جانے کے حکم سے مراد امرِ تکوینی ہوسکتا ہے، یعنی ایسی بات جس کا ہونا مقدّر ہو چکا ہے۔

اس بنا پر جنّت میں رہنے کا اور پھر وہاں سے نکالے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی پیدائش میں بہت سی حالتوں، زمانوں اور کیفیتوں میں سے گزرتا ہے، جن میں سے پہلا زمانہ بچپن کا ہے، اس عمر میں رنج و غم پاس نہیں پھٹکتا اور کھیل کود کے سوا اَور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بچہ گویا ایک ایسے باغ میں ہے جہاں گھنے درخت، پختہ میوے سے لدے ہوے، موجود ہیں، نہریں بہہ رہی ہیں، پرندے گا رہے ہیں۔ زوجہ کا ذکر اس لیے کیا کہ تمام نوعِ انسان اس حکم میں آ جائے اور معلوم ہو جائے کہ بشریّت کے اندر مذکّر و مؤنّث سب برابر ہیں، آدمؑ و حوّا کے جنّت میں رہنے کے حکم کا مطلب یہ ہوا کہ نوعِ انسان میں مذکّر و مؤنّث سب ایک حالت میں ہیں۔ کھانے پینے کی اجازت کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کی گئیں اور فطرۃً ان چیزوں کو پہچان لے گا جو اس کے لیے مفید ہیں۔ ایک خاص درخت سے روکنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں ضرر رساں چیزوں کے پہچاننے کی استعداد ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سے ضرور بچے۔ انسان جب سنِ تمیز کو پہنچ جاتا ہے تو خیر و شر کی معرفت کی استعداد اس میں اپنا کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ شیطان کے وسوسے اور اس کے بہکانے کا مطلب یہ ہے کہ خبیث روح جو انسان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اُسے برائی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اِس میں اشارہ ہے کہ انسان بالطّبع خیر کی طرف مائل ہے، برائی کی طرف جاتا ہے تو دوسروں کے بہکانے سے جاتا ہے۔ جنّت سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کے قاعدے توڑ کر مشقّت اور محنت میں پھنس جاتا ہے۔ آدمؑ کی توبہ اور استغفار سے اشارہ اِس طرف ہے کہ انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کی بابت بُرے کاموں سے بُرے نتیجے پیدا ہونے کا خوف رکھتا ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہ ان بُرے نتائج سے اسے بچا لے۔ اللہ کے توبہ قبول کرنے سے ادھر اشارہ ہے کہ نصاریٰ کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ بنی آدم فطرۃً گنہگار ہیں اور اسے نجات دلانے کے لیے ضروری تھا کہ عیسیٰؑ اپنی جان قربان کریں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ آدمی کی فطری حالتیں تین ہیں: اوّل بچپن کا زمانہ اور یہ خوشی اور راحت اور بےفکری کا زمانہ ہے۔ دوسرے بھلے بُرے میں کسی قدر تمیز کا زمانہ۔ اس زمانے میں وہ شیطان کے وسوسے سے خواہشوں کے جنجال میں پھنس سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک زمانہ عقل اور ہوش کے کامل ہونے کا آتا ہے۔ اس میں وہ اپنے افعال کے نتائج کا خیال کرتا ہے اور بُرے کاموں سے بچنا چاہتا ہے اور جب اپنے آپ کو بےبس پاتا ہے تو عالم الغیب و الشہادہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالتیں ہیں جو فرد پر گزرتی ہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی (تمدّن) بھی انھیں میں سے گزرتی ہے۔ ابتدا میں انسان کی اجتماعی حالت سیدھی سادی تھی؛ اس کا رخ ایک ہی طرف تھا؛ ضرورتوں کے مہیّا کرنے میں اعتدال اور میانہ روی پر عمل تھا؛ مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے انسان کا ہر فرقہ اور گروہ اب تک یاد کرتا ہے۔ اور اس کا نام سنہری زمانہ رکھتا ہے۔ پھر جب انسان کو اپنی یہ مجموعی خوشحالی نہ بھائی تو وہ اپنی حرص و ہوا کی وجہ سے دوسروں کی چیزیں ہتھیانے لگا اور ہر وقت اپنے ہی مزے کی دُھن میں رہنے لگا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ آپس میں کٹا چھنی ہوئی، دنگا فساد ہونے لگا۔ یہ اجتماعی زندگی کا دوسرا دور ہے جس کا ذکر انسان کی تاریخ میں آتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا دور آتا ہے اور انسان عقل و فکر سے کام لے کر خیر و شرّ میں پوری تمیز کرنے لگتا ہے اور ہر کام کی مناسب حدود مقرّر کر دیتا ہے، تاکہ آپس میں تنازع اور فساد نہ ہونے پائے۔ اس دور کی تکمیل دینِ الٰہی اور وحی کے ذریعے ہوسکتی ہے اور انسان اپنے عروج کے کمال تک پہنچ سکتا ہے (تمّ کلامہ)۔

المواقف اور المقاصد میں ہے کہ آدمؑ کو جنت میں پہلے مرتبۂ نبوّت حاصل نہ تھا اور نہ وہاں ان کی امّت ہی تھی مگر بعض کہتے ہیں کہ آدمؑ جنّت میں نبی تھے اور ان کی زوجہ ہی ان کی امّت تھی (دیکھیے التفتازانی: شرح العقائد النّسفیّۃ مع حاشیۂ علاّمہ خیالی و شرح برہامش از عِصام، قاہرہ ۱۳۳۵ھ، ص ۱۳۴ حاشیہ؛ نیز دیکھیے محمد عبدہٗ، ۱:۲۸۰)۔

قصّہ آدم و ابلیس کے متعلّق قرآن کریم میں ''آدم'' کے بجاے ''بشر'' اور ''الانسان'' (یعنی عام انسان) کے لفظ بھی استعمال ہوے ہیں؛ مثلاً ۱۵[الحجر]: ۲۶ بعد، ہم نے ''انسان'' کو خشک گارے کی کالی مٹی سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنّوں کو لَو کی آگ سے بنایا اور (یاد کر) جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں کھنکھناتے سنے ہوے گارے سے ایک ''بشر'' بناؤں گا۔ جب میں اسے ٹھیک کر لوں اور میں اپنی روح سے اس میں (جان) پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ کرتے ہوے گر پڑنا۔

انسان کی پیدائش کی ابتدا کے بارے میں قرآن حکیم سے چند آیات کے حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۹۶ [العلق]: ۲؛ ۸۶ [الطارق]: ۵ بعد؛ ۹۵ [التین]: ۴؛ ۵۵ [الرحمٰن]: ۱۴؛ ۷۷ [المرسلٰت]: ۲۰؛ ۷۵ [القیامۃ]: ۳۴ بعد؛ ۷۶ [الانسان]: ۲؛ ۲۱ [الانبیاء]: ۳۷؛ ۳۰ [الرّوم]: ۲۰؛ ۳ [آل عمران]: ۵۸؛ ۲۲ [الحج]: ۵؛ ۷ [الاعراف] ۱۸۹ بعد، اس مقام پر فرمایا ہے: (اللہ) ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے الخ۔ (بعض مفسّرین نے اس آیت میں ''نفسٍ واحدۃٍ'' سے حضرت آدمؑ مراد لیا ہے۔ لیکن امام فخر الدّین الرازی اور دیگر کثیر ائمّہ نے اسے ''عام انسان'' پر محمول کیا ہے)۔

آدمؑ جنّت سے نکل کر کس ملک میں پہنچے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ خاموش ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ وہ سرندیب (لنکا) میں اتارے گئے اور حضرت حوّا جدّے میں۔ پھر آدمؑ عرب میں آئے اور عرفات میں

حوّا سے ملاقات ہوئی۔ پھر وہ زمین پر ایک مدّت تک رہے۔ ان کے اولاد ہوئی۔ان کے دو بیٹوں (''اِبْنَیْ اٰدَمَ'' ۵[المائدۃ]:۳۰ یعنی ہابیل و قابیل) کا ذکر بلاتصریح قرآن کریم میں آیا ہے۔

تفاسیر اور قصص الانبیاء کی کتابوں میں قصّۂ آدمؑ کے بارے میں جو جزئیات بہم پہنچائے گئے ہیں ان کا بیشتر حصّہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ یہودیوں (اور عیسائیوں) کی ان روایات اور اسلامی روایات میں جو قوی تشابہ پایا جاتا ہے اس کی مفصّل بحث کے لیے دیکھیے (آ)، طبع دوم، مادّۂ آدم۔

تورات: سِفْرُ تَکْوِیْنِ الخلائق کے پہلے پانچ ابواب خلْقتِ آدمؑ کے قصّے کی کئی تفصیلات کے حامل ہیں، انھیں وہاں دیکھنا چاہیے، سِفْرُ تکوین (۹:۲) میں جنّت کے شجرۂ ممنوعہ کو شجرۂ علمِ خیر و شرّ کہا ہے۔

سِفْرِ ایّوب (۳۱:۳۳) میں بھی آدمؑ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

مآخذ: (۱) القرآن (بمواضع کثیرہ)، اور تفاسیر، بالخصوص مفصّلۂ ذیل تفاسیر: (۱) ابن جریر الطبری: تفسیر، قاہرہ؛ (ب) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ۱:۶۹ - ۸۲؛ (ج) فخر الدّین الرازی: مفاتیح الغیب، قاہرہ ۱۳۰۸ھ، ۱:۲۶۱ ببعد؛ ۴:۳۴۱ ببعد؛ (د) الزمخشری: الکشاف، قاہرہ، ۱:۵۱ ببعد؛ (ھ) محمد عبدہٗ: تفسیر المنار، قاہرہ ۱۳۴۶ھ، ۱:۲۵۱ - ۲۸۶؛ (و) سیّد احمد خان: تفسیر احمدیہ، علی گڑھ ۱۸۸۲ - ۱۸۹۵ء؛ (ز) ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، لاہور، ۲:۳ ببعد؛ (۲) البخاری: الجامع الصحیح، (بالخصوص کتاب الانبیاء)؛ (۳) مالک: الموطّا، (بالخصوص کتاب ۴۶: النہی عن القول بالقدر)؛ (۴) ابن سعد: طبقات، لائڈن ۱۹۰۵ء، ۱/۱:۱۲ - ۱۶؛ (۵) وِنسنک (Wensinck): *Handbook of Mohammadan Tradition*، ۱۹۲۷ء، بذیل مادّۂ آدم؛ (۶) ابن درید: الاشتقاق، ص ۴۴؛ (۷) ابو منصور الجوالیقی: المعرّب (طبع زخاؤ)، لائپزگ ۱۸۶۷ء، ص ۸؛ (۸) الجوہری: الصِحاح، (طبع احمد عبدالغفور عطّار) قاہرہ؛ (۹) الراغب الاصفہانی: المفردات؛ (۱۰) ابن فارس: معجم مقاییس اللغۃ، قاہرہ ۱۳۶۶ھ، ۱:۷۱ - ۷۲؛ (۱۱) النَوَوِی: تہذیب الاسماء و اللغات، قاہرہ، ۱:۹۵ - ۹۷؛ (۱۲) الکِسائی: قِصَص الانبیاء، لائڈن ۱۹۲۲ - ۱۹۲۳ء، ۱: ۲۳ - ۴۷؛ (۱۳) ابواسحٰق الثَعْلَبی: قَصَص الانبیاء (=العرائس)، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، ص ۱۹ ببعد و ۳۷؛ (۱۴) الشہرستانی: کتاب المِلَل و النِحَل، لنڈن ۱۸۴۶ء، ص ۴۳۰؛ (۱۵) البغدادی: کتاب الفَرْق، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۱۸۰، ۳۲۳؛ (۱۶) محمد باقر مجلسی: حیات القلوب، لکھنؤ ۱۲۹۵ھ، ص ۴۱ ببعد؛ (۱۷) ابن الأثیر الجزری: النہایۃ فی غریب الحدیث، قاہرہ ۱۳۲۲ھ، ۱:۲۵ - ۲۶؛ (۱۸) بائبل (عربی متن) طبع وِلیَم وَاطْس، لنڈن ۱۸۶۰ء؛ (۱۹) Hastings: *Encyclopaedia of Religion and Ethics*، لنڈن و نیویارک ۱۹۵۹ء، ۱:۸۴ - ۸۷؛ (۲۰) *Jewish Encyclopaedia*، لنڈن و نیویارک ۱۹۰۱ء، ۱:۱۷۳ ببعد؛ (۲۱) سیّد احمد خان: تبیین الکلام تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملّۃ الاسلام، ۲:۹۸ - ۱۳۳؛ (۲۲) حکیم شمس اللہ قادری: قاموس الاعلام، حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ء، ۱:عمود ۱۰ - ۱۲؛ (۲۳) مخزنِ علوم و فنون (از ادارۂ ادبیاتِ اردو)، حیدرآباد ۱۹۵۱ء، ص ۶۱ - ۶۲؛ (۲۴) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لائڈن، طبع دوم؛ (۲۵) النَّسَفی: عقائد (شرح للتفتازانی و حاشیۃ للخَیالی)، قاہرہ ۱۳۳۵ھ، ص ۱۳۴؛ (۲۶) میر غلام علی: شَمَامَۃ العَنْبَر در سُبْحَۃُ الْمَرْجان]۔

(عبدالماجد دریا آبادی، م؛ ن - احسان الٰہی، رانا)

آدم بنّوڑی، شیخ: وہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے اکابر خلفا میں سے تھے۔ ان کا وطن قصبۂ مودہ (؟) تھا لیکن سکونت بنّوڑ میں تھی (تذکرۃ العابدین، دہلی، ۲:۱۲۴؛ خزینۃ الاصفیاء ۵۹۴)۔ بنّوڑ بفتح موحّدہ و تشدید نون ہے (شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی: الانتباہ، مطبع احمدی، دہلی، ص ۱۳)؛ یہ مقام سرہند سے بارہ کوس [تقریباً ۲۰ میل] کے فاصلے پر ہے؛ روضۃ القیّومیّہ (ترجمہ)، رکن اوّل، ص ۳۴۱۔ اسی کتاب میں ہے کہ وہ ماں کی طرف سے سیّد تھے لیکن ان کے اجداد پٹھان تھے، روضۃ القیّومیّہ، (ترجمہ) رکن اوّل، ص ۳۴۲ بحوالۂ ملّا بدرالدّین (''پیر برادر و خواجہ تاشِ شیخ آدم'': حضرات القُدُس) مگر حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی اور سعد اللہ خان وزیرِ شاہجہان نے بوقتِ ملاقات شیخ آدم سے دریافت کیا کہ آپ کا نسب کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ میں سیّد ہوں لیکن چونکہ میری ننھیال افاغنہ میں سے تھی اس لیے عوام کی زبان پر افغانی مشہور ہو گیا ہوں (انفاس العارفین، مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ھ، ص ۱۳ و ۱۴، قب خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۹۵)۔ شروع میں امّی محض تھے، فیضِ ربّانی سے قرآن مجید حفظ کیا اور علم ظاہری بھی حاصل کیا۔ شاہی لشکر میں ملازم ہوے لیکن ایک واقعے سے متأثر ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ طریقت کی تعلیم پہلے (ملتان میں؛ نزھۃ الخواطر) حاجی خضر روغانی سے پائی (حاجی خضر م ۱۰۵۲ھ کے لیے دیکھیے خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۹۴) بعد ازاں حاجی خضرؒ کے ایما سے حضرت مجدّد سرہندیؒ کی خدمتِ اقدس میں پہنچے اور کمال حاصل کیا۔ شیخ آدم نکات الاسرار میں فرماتے ہیں کہ حضرت مجدّدؒ نے اجمیر میں مجھے حقیقتِ قرآنی کی بشارت عنایت فرمائی۔ سرہند میں مجھے خلافت سے مشرّف فرمایا (روضۃ القیّومیّہ (ترجمہ)، رکن اوّل، ص ۳۴۳)۔ اتباعِ سنّت میں ان کو کمال حاصل تھا۔ شریعت و طریقت میں استقامت سے موصوف و معروف تھے۔

شیخ آدم بنّوڑی کے ایک لاہوری مخلص نے [۱۰۵۲ھ میں نزھۃ الخواطر] ان کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ ان دنوں شاہجہان بادشاہ لاہور میں تھا۔ وہ پانچ ہزار پٹھانوں کے ہمراہ لاہور آئے اور وہاں بہت سے لوگ ان کے مرید ہوے۔ ہر روز افغانستان سے تین تین چار چار ہزار پٹھان شیخ کی زیارت کے لیے آتے

تھے۔ اور کثرتِ زائرین سے بازاروں اور کوچوں میں سے گزرنا مشکل تھا۔ بادشاہ نے تعریف سُن کر انھیں دیکھنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے پہلے ملک العلماء ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی اور اپنے وزیر سعد اللہ خان کو بھیجا، انھوں نے خلوت گاہ میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ دونوں خلوت گاہ سے باہر بیٹھے رہے۔ جب وہ خلوت گاہ سے نکلے تو پھر بھی ان دونوں کی چنداں پروا نہیں کی۔ بادشاہ کے پاس جا کر ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تو کچھ شکایت نہیں کی البتہ وزیر نے ان کی بہت زیادہ شکایت کی۔ یہ سن کر ان کی طرف سے بادشاہ کا مزاج منحرف ہو گیا، لیکن چونکہ بادشاہ حضرت مجدّد کا معتقد تھا اس لیے کوئی ایذا نہیں پہنچائی۔ صرف اتنا حکم دیا کہ شیخ صاحب حج کو چلے جائیں۔ ان کی نیّت پہلے ہی سے حجِ بیت اللہ کی تھی۔ بادشاہ کے کہنے سے حج کے لیے روانہ ہو گئے (روضة القیومیّه، (ترجمہ) رکن اوّل، ص ۳۴۷ ببعد؛ نزهة، از روئے التذکرة الاکرامیّة)۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس واقعے کی تفصیل دے کر (دیکھیے انفاس العارفین، ص ۱۳ و ۱۴) فرمایا ہے کہ جب وہ سورت پہنچے تو وہاں کے حاکم کی کوشش سے، جو ان کا معتقد تھا، جہاز کا جلد انتظام ہو گیا۔ جب سوار ہو گئے تو بادشاہ کا حکم حاکمِ سورت کے پاس پہنچا کہ شیخ آدمؒ کو جلد واپس کر دو، کیونکہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری سلطنت کا زوال اس درویش کے اس ملک سے نکل جانے کی وجہ سے ہوگا۔ حاکم نے عذر لکھا کہ آپ کا حکم پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہو چکے تھے۔ اس کے فوراً بعد بادشاہ محبوس ہو گیا، (نیز دیکھیے خزینة الاصفیاء، ص ۵۹۵ از روے تذکرۂ آدمیّه)۔

حافظ سیّد عبداللہ اکبر آبادی خلیفۂ شیخ آدمؒ بنّوڑی اپنے مرید و خلیفہ شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی (والد ماجد شاہ ولی اللہؒ) سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ بھی حضرت شیخ آدمؒ کے ہمراہ حج کے لیے جانا چاہتے تھے مگر حضرت شیخؒ نے انھیں اس ارادے سے باز رکھا اور پوچھنے پر فرمایا کہ ان کا ہندوستان میں رہنا ایک حکمت کے ماتحت ہے اور حکمت آگے چل کر معلوم ہوگی۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں: ”اب وہ مصلحت معلوم ہوئی کہ تمھاری تربیّت کرنا تھی“ (انفاس العارفین، ص ۱۱)۔

وہ بعد از فراغتِ حج مدینۂ منوّرہ گئے۔ وہاں ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ [۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء] میں انتقال فرمایا۔ ان کا مزار حضرت عثمان غنیؓ کی قبر مبارک کے نزدیک ہے (تذکرة العابدین، ۲: ۱۲۴، دہلی)۔

جب حضرت خواجہ محمد معصوم حج کے لیے تشریف لے گئے اس وقت حضرت شیخ آدمؒ فوت ہو چکے تھے۔ جب حضرت خواجہ جنّت البقیع حاضر ہوتے حضرت شیخ آدمؒ کی قبر کے نزدیک دیر تک کھڑے رہتے اور فاتحہ پڑھتے (روضة القیومیّه (ترجمہ)، رکن اوّل، ص ۳۵۰)۔

انھوں نے ہزاروں طالبانِ خدا کو خدا رسیدہ کیا۔ ان کی خانقاہ میں ہزار سے زیادہ طالبانِ طریقت [ہر روز] جمع رہتے تھے۔ اور لنگر خانے سے انھیں دونوں وقت کھانا ملتا تھا۔ ان کے ایک سو خلیفہ اور ایک لاکھ مرید تھے (تذکرة العابدین، محلِّ مذکور؛ نزهة الخواطر، ۵: ۲)۔

ان کے چند مشہور خلفا حسبِ ذیل ہیں:

(۱) سیّد علم اللہ رائے بریلوی: وہ نہایت متورّع اور سنّتِ نبوی کے اتّباع میں ضرب المثل تھے۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ انھیں کی اولاد میں تھے؛ (۲) حافظ سیّد عبداللہ اکبر آبادی۔ وہ شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی کے پیر و مرشد تھے؛ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا سلسلۂ طریقت اپنے والد ماجد کے واسطے سے ان سے مل جاتا ہے؛ (۳) شیخ محمد سلطان بلیاوی؛ (۴) شیخ سعدی لاہوری؛ (۵) حافظ سعداللہ وزیر آبادی؛ (۶) شیخ عثمان شاہ جہان پوری؛ (۷) خواجہ محمد امین، مؤخر الذّکر نے بیس سال تک حضرت شیخ آدمؒ کی خدمت کی۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں حضرت مجدّدؒ، ان کے خلفا اور فرزندوں کے حالات خصوصًا اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ آدمؒ کے حالات و سوانح، نہایت شرح و بسط سے لکھے ہیں، بلکہ اس کتاب کی تالیف کا مقصد ہی تذکرۂ شیخ آدمؒ تھا (روضة القیومیّه، (ترجمہ) رکن اوّل، ص ۳۵۰-۳۵۶)۔

تصنیفات: شیخ آدم کی تصنیفات و رسائل میں سے دو خاص طور پر قابلِ ذکر اور مضامینِ عالیہ اور علومِ دقیقہ پر مشتمل ہیں۔

۱- خلاصة المعارف [۲ جلد، بزبانِ فارسی]؛ ۲- نِکات الاَسرار [دیکھیے نزهة الخواطر، ۵: ۲؛ اس کتاب کے دو مخطوطے کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں موجود ہیں، دیکھیے مجموعۂ آزر کی فہرست، ص ۸۳، شمارہ ۳۹ و ص ۸۶، شمارہ ۸۱؛ اسی مجموعے میں (فہرست مذکور، ص ۳) ان کا رسالہ (۳) وضوح المذاہب بھی ہے؛ (۴) نتائج الحرمین: ان کے اقوال و مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ اس کے نسخے کے لیے دیکھیے فہرست مکتبۂ دارالعلوم الاسلامیہ، پشاور، ص ۱۸۴، شمارہ ۹۹۰ ب]۔

مآخذ: مندرجۂ بالا کے علاوہ ملاحظہ ہو: [(۱) محمد احسان، کمال الدّین، ابو الفیض: روضة القیومیّه، ترجمۂ اردو، طبع لاہور؛ (۲) مفتی غلام سرور: خزینة الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ھ، ص ۵۹۴ ببعد]؛ [۳] حکیم سیّد عبدالحی: نزهة الخواطر، ۵: ۱؛ [۴] سیّد ابوالحسن علی ندوی: سیرت سیّد احمد شہید، طبع سوم، لکھنؤ، ۱: ۵۰، ۵۱، ۵۳؛ [(۵) محمد حسن نقشبندی: حالات مشایخ نقشبندیه مجدّدیّه، مرادآباد ۱۳۲۲ھ]؛ [۶] الفرقان (لکھنؤ)، مجدّد الف ثانی نمبر برائے شعبان و رمضان و شوال ۱۳۵۷ھ؛ [۷] مرزا محمد اختر دہلوی: تذکرۂ اولیاء ہند، دہلی ۱۹۲۸ء، ۳: ۱۰۳ و ۱۰۴؛ [(۸) C. A. Storey: *Persian Literature*، ۱/۲، اشاریّہ]۔

(نسیم احمد زیدی امروہی)

آدِیَمان: شمال مشرقی اناطولیہ کا ایک چھوٹا سا شہر، جو پہلے * حِصْنِ مَنْصُور یا حِصْنِ مَنْصُور کے نام سے معروف تھا (آج کل ترکی میں

Hüsnümansur) [گویا حُصن مَنْصُور] لکھا جاتا ہے)۔ کِینِے (Cuinet) کے بیان کے مطابق یہ کوزکُن (Körkün) بھی کہلاتا تھا۔ یہ شہر مَلْطِیّہ کی "سَنْجَق" میں، جو اب "ولایت" مَلْطِیّہ ہے، اسی نام کی "قضا" کا صدر مقام ہے (قبل ازیں یہ شہر ولایتِ معمورۂ العزیز سے متعلّق تھا)۔ ۳۷ درجے ۴۵ دقیقے طول بلد شمالی اور ۳۸ درجے ۱۵ دقیقے عرض بلد مشرقی پر واقع ہے۔ سنینِ ماضیہ میں یہاں کی جو آبادی بتائی گئی ہے اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، طبع اوّل کے مطابق آبادی ۱۰,۰۰۰ نفوس کی تھی، جس کا بڑا حصّہ ارمنوں پر مشتمل تھا، سامی کے بیان کی رو سے آبادی ۲۵,۰۰۰ تھی، جن میں صرف ۱,۲۵۵ عیسائی تھے؛ علی جوّاد ایک جگہ کہتا ہے کہ آبادی ۱,۱۵۰ ہے اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ ۲۵,۰۰۰ سے زیادہ ہے، جن میں آدھے سے زیادہ کُرد ہیں۔ [سامی، ۳: ۱۹۶۲ نے بھی آبادی ۲۵ ہزار بتائی ہے]۔ کِینِے (Cuinet) کے بیان کے مطابق آبادی ۲,۰۰۰ تھی (اور حصن منصور کی ساری "قضا" میں ۴۲,۱۳۴) ۱۹۴۵ء میں آبادی ۱۰,۱۹۲ تھی۔ [۱۹۵۵ء کی مردم شماری کے مطابق اِیلِ آدِیَامان کی آبادی (موقّتی اعداد کے مطابق) ۲,۱۱,۰۰۲ نفوس کی ہے۔ ۱۹۲۱ء کے قانونِ اساسی (کونسٹی ٹیوشن) کے مطابق 'اِیل' وہ اداری علاقہ ہے جس کا حاکم والی کہلاتا ہے۔ ترکیّہ کا سارا علاقہ ۶۷ اِیل میں منقسم ہے۔ *Statesman's Year-Book 1960*، ص ۱۴۳۴ ببعد].

حِصْن منصور کا نام اموی امیر منصور بن جَعْوَنَہ کے نام پر رکھا گیا، جو ۱۴۱ھ/ ۷۵۸ء میں عبّاسی خلیفہ المنصور کے حکم سے قتل کیا گیا۔ بعد ازاں خلیفہ ہارون الرشید نے اس شہر کو مستحکم کیا اور وہاں ایک محافظ فوج مقرّر کی۔ اس طرح حِصْن منصور یا آدِیامَان اپنے قرب وجوار کے قدیم شہر پیرہ (Perre) کا قائم مقام بن گیا، جس کا محلِّ وقوع اب بھی آب گزروں سے اور ان قبروں سے جو چٹانوں کے اندر بنی ہوئی ہیں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ بعد کے زمانے میں حصن منصور کا ذکر شاذ و نادر ہی کہیں آیا ہے، چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی میں یہ شہر خاندان اُرْتُقیّہ (Artuḳids) کے قبضے میں تھا۔

مآخذ (۱) بلاذری: فتوح، ص ۱۹۲؛ (۲) یاقوت، ۲: ۲۷۸؛ (۳) حاجی خلیفہ: جِہان نُما، ص ۱۰۶؛ (۴) اِوْلِیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۳: ۱۶۹؛ (۵) سامی: قاموس الاعلام، ۳: ۱۹۶۲؛ (۶) علی جواد: تاریخ و جغرافیہ لُغَتِی، ص ۶، ۳۳۱؛ (۷) C. Ritter: *Erdkunde*، ۱۰: ۸۸۵؛ (۸) Humann و Puchstein: *Reisen in Kleinasien und Nordsyrien*، ۱۳۹ ببعد؛ (۹) Le Strange: *Palestine under the Muslims*، ص ۱۲۳؛ (۱۰) وہی مصنّف: ص ۴۵۴؛ [۱۱] *Statesman's Year Book 1960*، اشاریہ].

(F. TAESCHNER)

⊗ **آدینہ بیگ خان:** اٹھارویں صدی عیسوی میں پنجاب کا ایک گورنر؛ اس زمانے میں آدینہ بیگ خان نے اہمیّت حاصل کی اور گورنری کے درجے تک پہنچا۔ اس کی ایک قلمی تصویر سنٹرل میوزیم لاہور میں ہے۔ معاصر کتبِ تاریخ ابتدائی حالات کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس کے حال سے متعلّق قدیم ترین رسالہ احوال دینا بیک خان ہے (ریو: فہرستِ مخطوطات، ۳: ۱۰۴۴)۔ مجہول الاسم مصنّف کا یہ رسالہ آدینہ بیگ کی وفات کے پچاس برس بعد مرتّب ہوا اور گو بیشتر واقعات اور سنین کا اندراج اس رسالے میں غلط ہوا ہے لیکن ابتدائی حالات کا واحد ماخذ یہی رسالہ ہے۔ احوال دینا بیک خان کے مصنّف کے بیان کے مطابق آدینہ بیگ خان ذات کا آرائیں تھا (صاحبِ عماد السعادت نے اسے تورانی مغل قرار دیا ہے؛ دیکھیے ص ۶۹)۔ اس کے باپ کا نام چَنُّو تھا۔ پیدائش "موضع سرک پور پٹی" [کذا، یعنی شرقپور] متّصل لاہور میں ہوئی۔

ابتدائی تربیّت مغلوں کے گھروں میں ہوئی اور اس کا وقت زیادہ تر جلال آباد، خان پور (ہُوشیار پور سے شمال مغرب کی طرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر) اور بجواڑے میں (ہُوشیار پور سے جنوب مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر) گزرا؛ وہ مفلس آدمی تھا (قب عماد السعادت، ص ۶۹ کے مطابق، 'مردمے بود کم بغل، تہی دست')۔ کچھ مدّت سپاہیانہ زندگی بسر کی، پھر موضع جیووال ("معروف باسم کَنگ در علاقۂ لوہیاں" قریب از سلطان پور) میں محصّل مقرّر ہوا۔ ایک ساہو کار کی ضمانت پر علاقۂ کَنگ کے پانچ چھے گاؤں اور اگلے سال سارا علاقہ کَنگ اجارے پر لیا۔ پھر نوّاب خان بہادر (زکریا خان) نے اُسے سلطان پور کا حاکم بنا دیا ("بعہدۂ علاقۂ سلطان پور سرفراز گشتہ")۔ حملۂ نادری کے وقت وہ سلطان پور ہی کا حاکم تھا۔ اس زمانے میں پنجاب کا گورنر خان بہادر (زکریا خان) تھا۔

حملۂ نادری (۱۱۵۰-۱۱۵۱ھ) کے بعد پنجاب میں افراتفری پھیل گئی۔ (نادر ۲۶ شوال ۱۱۵۱ھ/ [۲۶ دسمبر] ۱۷۳۹ء کو لاہور سے نکلا تھا، لاک ہارٹ: *Nadir Shah*، ص ۱۳۱) اور سکّھوں نے زور کیا تو ان کی سرکوبی کے خیال سے زکریا خان نے آدینہ بیگ کو جالندھر دوآبے کا ناظم بنا دیا (گپتا: آدینہ بیگ خان، ص ۵)۔ اس نے چالاکی سے سکّھوں کو دبانے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کر کے قوّت حاصل کی؛ مگر بالآخر زکریا خان کے دباؤ سے مجبور ہو کر اسے سکّھوں کو اپنے علاقے سے نکالنا پڑا۔ جب صوبۂ لاہور کے گورنر (زکریا خان) کو آدینہ بیگ نے سرکاری روپیہ ادا نہ کیا تو اسے گرفتار کیا گیا (گپتا، ص ۶)، اور اسے بعض سختیاں بھگتنا پڑیں ("نواب" یعنی زکریا خان" کے عہدِ دولت میں وہ عُمّال میں داخل ہو گیا تھا، ان دنوں میں موردِ عتاب ہوا تو ضرب وشلّاق تک نوبت پہنچی۔ بدن پر اس کے نشان باقی تھے"؛ عماد السعادت، ص ۶۹)۔ آخر ایک سال بعد رہائی ملی اور شاہنواز خان کے ماتحت اسے نائب ناظم مقرّر کیا گیا۔ آئندہ سرکاری روپیہ ادا کرنے میں محتاط ہو گیا۔ نواب زکریا خان یکم جولائی ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء (درمآثر الامراء، ۲: ۱۰۷) میں انتقال کر گئے۔ ان کے لڑکوں یحییٰ خان اور شاہنواز خان میں گورنری کے سلسلے میں رسّہ کشی ہوئی۔ آدینہ بیگ نے دونوں سے

تعلّقات استوار رکھے۔ شاہنواز خاں نے مرکزی حکومت کی مرضی کے خلاف لاہور پر قبضہ کرلیا (۲۱ مارچ) اور کوڑا مل کو اپنا دیوان بنایا اور آدینہ بیگ کو جالندھر دوآبے کا حاکم بنادیا۔ اس زمانے میں نادرشاہ نے انتقال کیا (۱۹ جون ۱۷۴۷ء؛ لاک ہارٹ، ص ۲۶۱) اور احمد شاہ ابدالی قندھار اور کابل کا فرمانروا ہوا۔ شاہنواز خان نے مرکزی حکومت سے ڈر کر آدینہ بیگ کے مشورے سے ابدالی سے ساز باز کی اور اسے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی دعوت دی۔ دوسری طرف آدینہ بیگ خان نے ان حالات سے مرکزی حکومت کو بھی خبردار کردیا۔ احمد شاہ ابدالی پنجاب کی طرف بڑھا لیکن شاہنواز نے ارادہ بدل دیا۔ ابدالی سے لڑنے کے بعد شاہنواز کو دلّی کی طرف بھاگنا پڑا۔ ابدالی آگے بڑھا اور شاہی فوجوں سے نبرد آزما ہوا۔ قمرالدّین خان وزیر سرہند سے دس میل شمال مغرب میں مَنّو پور کے مقام پر گولی لگنے سے مر گیا لیکن معین الملک روک تھام میں کامیاب ہوا، آدینہ بیگ نے معین الملک کا ساتھ دیا اور دو بار زخمی بھی ہوا (گپتا، ص ۱۵، بحوالۂ احوال دینا بیک خان، تذکرۂ آنند رام مخلص و ظفر نامہ از غلام محی الدّین، نسخۂ دانش گاہ پنجاب شمارہ ۷۵۰)۔ اب پنجاب کا گورنر معین الملک عرف میر مَنّو ہوا۔ کوڑا مل دیوان رہا اور آدینہ بیگ حسبِ سابق جالندھر دوآبے کا فوجدار۔ سکھوں نے دوآبے میں پھر لوٹ مار شروع کردی تھی۔ معین الملک نے اس کی روک تھام کی۔ اس کے زمانے میں آدینہ بیگ کے بجائے زیادہ اقتدار کوڑا مل کو حاصل ہوگیا۔ اسی زمانے میں ابدالی نے پنجاب پر تیسرا حملہ کیا (دسمبر ۱۷۵۱ء) اور لاہور کا محاصرہ کرلیا۔ فرحۃ الناظرین کے بیان کے مطابق آدینہ بیگ خان نے ایسی تدبیر کی کہ کوڑا مل مارا گیا (ایلیٹ اور ڈوسن، ۸: ۱۶۷) (۶ مارچ ۱۷۵۲ء) اور معین الملک کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اب وہ ابدالی کی طرف سے پنجاب کا صوبے دار مقرر ہوا (گپتا، ص ۲۰)۔ معین اور آدینہ بیگ دونوں سکھوں کو کچلنے میں مصروف رہے۔ معین الملک نے ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو انتقال کیا۔ اب مراد بیگم (مغلانی بیگم) کا دورِ حکومت شروع ہوا اور ملک میں بدنظمی کا دور دورہ ہوگیا۔ چنانچہ آدینہ بیگ اپنے علاقے میں آزادی سے حکومت کرنے لگا اور وہاں امن بحال رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اب پاؤں پھیلانا شروع کیے اور سرہند کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کرلیا (۱۱ مارچ ۱۷۵۵ء)۔ فرمانروائے دہلی نے اسے ظفر جنگ خان کا خطاب بھی عطا کردیا۔ کانگڑے کا حاکم بھی اس کی اطاعت میں آ گیا (گپتا، ص ۲۵)۔ ان علاقوں میں اپنا موقف مضبوط کرنے کے بعد آدینہ بیگ نے لاہور کی طرف توجہ کی جہاں مغلانی بیگم نے سارا اقتدار خواجہ عبداللہ کے ہاتھوں میں دے رکھا تھا۔ لاہور پر قبضہ کرکے آدینہ بیگ خان نے صادق بیگ خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرّر کیا اور اپنے علاقے کی طرف لوٹ گیا۔ مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی سے امداد لے کر دسمبر ۱۷۵۵ء میں دوبارہ لاہور پر قبضہ کرلیا اور خواجہ عبداللہ پھر مغلانی بیگم کا نائب مقرّر ہوا۔ لیکن اب اس نے مغلانی بیگم کو بے دست و پا کردیا۔ مغلانی بیگم نے دہلی کی مرکزی حکومت سے امداد طلب کی۔

اس زمانے میں وزیر اعظم دہلی، عمادالملک، نے شہزادۂ عالی گوہر کو لے کر شکار کے بہانے ادھر کا رخ کیا۔ اس موقعے پر آدینہ بیگ نے وزیر کا ساتھ دیا۔ مغلانی بیگم کو بھی آخر کار وزیر نے گرفتار کرلیا اور لاہور و ملتان کی حکومت آدینہ بیگ کو عطا ہوئی (گپتا، ص ۲۸)۔ ابدالی مغلانی بیگم کی امداد کو آیا (نومبر ۱۷۵۶-فروری ۱۷۵۸ء) اور آدینہ بیگ کو بھاگ کر شوالک کی پہاڑیوں میں پناہ لینا پڑی۔ افغانوں نے اسے دوآبہ جالندھر کا حاکم مقرّر کردیا۔ ابدالی کے بعد تیمور شاہ کی گورنری کا دور شروع ہوا تو پنجاب کی حالت خاصی خراب ہوچکی تھی۔ ان حالات میں آدینہ بیگ اپنے علاقے پر قابض ہوکر افغانوں کو پنجاب سے نکالنے کے لیے کوئی مضبوط ساتھی ڈھونڈنے لگا۔ انھیں دنوں مرہٹے شمالی ہند کی طرف آ چکے تھے؛ آدینہ بیگ نے اب ان سے ساز باز شروع کی (گپتا، ص ۳۵) اور مرہٹے پنجاب کی طرف متوجّہ ہوے (شاہ عالم نامہ، ص ۳۴)۔ افغانوں کو بھاگتے ہی بنی۔ راگھو ناتھ راؤ مرہٹے نے آدینہ بیگ کے ساتھ مل کر یہ کامیابی حاصل کی۔ مرہٹوں نے آدینہ بیگ سے اپنی رقم وصول کی، اسے نوّاب کا خطاب دیا اور ۷۵ لاکھ روپے سالانہ کے عوض پنجاب اُس کے حوالے کر کے دلّی کی طرف لوٹ گئے (گپتا، ص ۳۹)۔ آدینہ بیگ نے اپنے داماد خواجہ مرزا خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرّر کیا اور خود اپنے علاقے کی طرف چلا گیا (گپتا: *Studies in Later Mughal History* etc.، ص ۹۸؛ سرکار: *Fall of the Mughal Empire*، ۲: ۵۵)۔ اس کی گورنری کا یہ دور صرف پانچ ماہ رہا۔ لیکن آدینہ بیگ خان نے اس مختصر دورِ عروج میں انتظامِ ملکی کے سلسلے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ پنجاب میں امن و امان نایاب تھا آدینہ بیگ خان کا حیلہ و تدبیر، طاقت و ہمّت، بصیرت و دانش سے دوآبہ بست جالندھر میں امن و امان کو بحال کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے آنکھیں بند کرتے ہی لامرکز عناصر چاروں طرف سے ہجوم بن کر آئے اور اس کے بسائے ہوے شہر آدینہ نگر (دینا نگر) کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ آدینہ بیگ نے بڑی ہمّت سے حالات کا مقابلہ کیا اور اُس زوال کو اپنی زندگی تک روکنے میں کامیاب رہا جس کا شکار اس کی زندگی ہی میں سلطنتِ دہلی کے مختلف حصّے ہو چکے تھے۔

احوال دینا بیک خان میں لکھا ہے کہ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی، سوائے آخر عمر کے جس میں ایک عورت سے نکاح تو کیا مگر فوراً بعد اسے طلاق دے دی (احوال، ورق ۶۱ ب) لیکن یہ صحیح نہیں کہ وہ بے اولاد رہا۔ مرہٹوں کے مکتوبات کے حوالے سے (جو معاصر دستاویزات ہیں) سرجادوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ آدینہ بیگ نے اپنے داماد خواجہ مرزا خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرّر کیا (سرکار، *Fall of Mughal Empire*، ۲: ۵۴ ببعد) اور سِیَر المتأخِرین میں لکھا ہے کہ آدینہ بیگ نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ایک لڑکا بھی چھوڑا۔ یہ لوگ احمد شاہ ابدالی کے حملے سے خائف ہوکر دہلی چلے گئے تھے (گپتا: *Studies in Later Mughal History of the Panjab*،

ص ۱۰۸؛ بحوالہ سِیَر المتأخِرین)۔

اکثر مؤرّخین یہ اطلاع دیتے ہیں کہ آدینہ بیگ قونلج کے مرض میں مبتلا ہوا۔ احوال دینا بیک خان میں ہے کہ ''ادھرنگ یعنی کانج'' (کذا) میں بیمار ہوا، حالانکہ دونوں امراض مختلف ہیں۔ قونلج سے بیمار ہوکر اس نے ۱۲ محرّم ۱۱۷۲ھ/ ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء میں بٹالے میں انتقال کیا۔ اُس کی وصیّت کے مطابق اس کی لاش خان پور لے جا کر دفن کی گئی (وہی کتاب، ص ۱۰۲؛ بحوالہ مسکین، مسکین اس زمانے میں خود بٹالے میں موجود تھا)، سرکار، ۲: ۵۵ میں ۱۳/ اکتوبر ۱۷۵۸ء تاریخِ وفات دی ہے مگر ۱۲ محرم مذکور زیادہ قابلِ اعتماد ہے)۔

مآخذ: (۱) غلام علی خان: شاہ عالم نامہ، کلکتہ ۱۹۱۴ء، ص ۳۴؛ (۲) غلام علی: عماد السعادت، نول کشور پریس ۱۸۹۷ء، ص ۶۹، ۷۰؛ (۳) غلام حسین: سِیَر المتأخّرین، نول کشور پریس ۱۸۶۶ء، ۳: ۸۹۷، ۹۰۸ ببعد؛ (۴) صمصام الدولہ شاہنواز: مآثر الامراء، کلکتہ ۱۸۹۰-۱۸۹۱ء، ۲: ۳۵۶؛ ۳: ۸۹۰ ببعد؛ (۵) عبدالکریم: بیان واقع، نسخۂ کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب، مجموعۂ آزاد؛ (۶) آنند رام مخلص: تذکرہ، نسخۂ کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب؛ (۷): احوال دینا بیک خان، نسخۂ خطّی موزۂ برطانیہ، عکس در کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب، عدد ۱۷؛ (۸) Elliot و Dowson: *History of India*، لنڈن ۱۸۷۷ء، ۸: ۱۶۷، ۱۶۸؛ (۹) *Proceedings of the Idara-i Ma'arif-i-Islamia*، لاہور ۱۹۳۸ء، ص ۲۵۳ - ۲۷۸؛ (۱۰) J. D. Pearson: *Index Islamicus 1906-1955*، کیمبرج ۱۹۵۸ء، ص ۶۵۲؛ (۱۱) *Islamic Culture*، ۱۳، (۱۹۳۹ء): ۳۲۳-۳۳۸، مقالہ از ڈاکٹر ہری رام گپتا، بعنوان *Adina Beg, The last Mughal Viceroy of the Panjab* (وہی مقالہ در *Journal of the Punjab University Historical Society*، ۶: ۲۳-۷۷)؛ علیٰحدہ کتابچے کی شکل میں، ص ۱-۵۵ فہرست مصادر از ص ۴۹-۵۵؛ متنِ مقالہ میں ''گپتا'' سے مراد یہی کتابچہ ہے)؛ وہی مقالہ بادنیٰ اضافہ در Dr. Hari Ram Gupta: *Studies in Later Mughal History of the Panjab, 1707-1793*، لاہور ۱۹۴۴ء، ۵۶-۱۰۸؛ (۱۲) Syed Muhammad Latif: *Lahore, its History, Architectural Remains and Antiquities* طبع ثانی، لاہور ۱۹۵۶-۱۹۵۷ء، ص ۷۵؛ (۱۳) وہی مصنّف: *History of the Panjab*، کلکتہ ۱۸۹۱ء، اشاریہ؛ (۱۴) J. N. Sarkar: *Fall of the Mughal Empire*، ج ۱ (۱۷۳۹-۱۷۵۴ء)، کلکتہ ۱۹۴۹ء: ۲۴۲ ببعد؛ ج ۲ (۱۷۵۴-۱۷۷۱ء)، کلکتہ ۱۹۵۰ء: ۴۶-۵۸؛ (۱۵) J. D. Cunningham: *History of the Sikhs*، طبع دوم، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۹۲ ببعد؛ (۱۶) Storey: *Persian Literature*، ۲/۳: ۶۶۴-۶۶۵.

(وحید قریشی)

آذر : 'لطف علی' حاجی 'اصفہانی بیگدِلی' آقاخان بیگدِلی کے فرزند ⊗ اور شعرائے فارسی کے تذکرے آتش کدے کے مؤلّف تھے۔ ترکمانوں کے قبیلۂ بیگدِلی سے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب بیگدِلی خان سے ملتا ہے، جو الِدِگزْ خان کے چار بیٹوں میں سے تیسرا تھا اور خود الِدِگزْ خان اوغوز خان کے چھے بیٹوں میں سے تیسرا تھا۔ غرض لطف علی اسی نسبت سے بیگدِلی کہلائے (آتش کدہ، تہران ۱۳۳۷ ش، ص ۳۶۳)۔ آباواجداد کا وطن ترکستان تھا؛ سلطان محمود کے زمانے میں یا چنگیز خان کے خروج کے وقت بیگدلی اور دیگر ترکستانی قبائل ایران آئے اور بعض شام کی طرف بھی نکل گئے۔ امیر تیموران شامی بیگدلیوں کو ایران لے آیا اور جب اَرْدَبیل پہنچا تو شیخ سلطان [خواجہ] علی صفوی کی سفارش سے انھیں اردوے تیموری سے رہائی دے دی۔ یہ شیخ کے مرید ہوگئے (قب عالم آرای عبّاسی، ص ۱۲) اور بیگدِلی قبیلے کی دو شاخیں ہوگئیں۔ شام سے لوٹنے والے ''بیگدِلی شاملو'' اور جو شام کی طرف نہیں گئے تھے وہ صرف ''بیگدلی'' کہلائے۔ صفوی فرمانرواؤں کے دور میں اس قزلباش قبیلے کے افراد مناصبِ جلیلہ پر فائز اور کہن خدمتی اور جان سپاری میں سب پر فائق رہے (تاریخ عالم آرای عبّاسی، ص ۱۰۴، ۶۲۷ وغیرہ)۔ اس سلسلے میں آذر نے اپنے اعزّہ کی خدمات تفصیل سے دی ہیں، مثلاً دیکھیے آتش کدہ، ص ۳۶۴، س ۳؛ ص ۳۶۵، س ۷ و ۲۲؛ ص ۳۶۶، س ۱؛ ص ۳۶۷، س ۲ (والدِ آذر)؛ ص ۳۶۸، س ۱۳ و ۱۵ (قب ص ۳۷۳، س ۱۷)؛ ص ۳۷۶، س ۱ (قب ص ۴۱۵، س ۲۴) و ص ۴۱۶؛ ان میں سے بعض کی شاعری اور شاعروں کی قدردانی کا بھی ذکر کیا ہے؛ مثلاً دیکھیے ص ۳۷۶، س ۱ و ص ۴۲۱، س ۶۔ آذر (آتش کدہ، ص ۳۶۴، س ۷ میں) اپنی پیدائش کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ بعہدِ شاہ سلطان حسین صفوی (۱۱۰۵-۱۱۳۵ھ/ ۱۶۹۴-۱۷۲۲ء) ربیع الثّانی ۱۱۲۴ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا، مگر ص ۴۳۳، س ۱۲ پر ۱۱۲۴ھ کے بجائے ۱۳۴[۱] ھ دیا ہے۔ [آتش کدہ، طبع بمبئی ۱۲۷۷ھ، میں آذر کی پیدائش ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۲۳ھ درج ہے۔ اسے تسلیم کیا جائے تو ''قریبی زمانے'' کی مدت کی تاویل یوں کرنا پڑے گی کہ آذر نے ''مقارن'' کا لفظ غیر محتاط انداز میں استعمال کیا ہے، اس لیے کہ ۱۱۲۳ھ اور ۱۱۳۴ھ کے درمیان بہت فاصلہ ہوجاتا ہے (سید مرتضیٰ حسین فاضل)]۔ سیّد جعفر شہیدی آتش کدہ کی طباعت مذکورہ کا ناشر اپنے دیباچے (ص ۷) میں ۱۱۲۴ھ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ سلطان حسین کا دَورۂ امن اس سنہ کے قریب پڑتا ہے، لیکن آذر دونوں مذکورہ مقامات پر پیدائش کے قریبی زمانے میں محمود افغان کے فتنے کا ذکر کرتا ہے جس سے ناچار ان کا تمام گھرانا قُم میں ہجرت کر گیا اور لطف علی (آذر) نے عمر کے چودہ سال وہیں پورے کیے۔ محمود خاں افغان نے ۹ ماہ کے محاصرے کے بعد اواسطِ محرّم ۱۱۳۵ھ میں اصفہان پر قبضہ کیا تھا (آتش کدہ، ص ۳۶۴)، اس لیے ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء ہی کو آذر کا سنۂ پیدائش سمجھنا چاہیے (دیکھیے نیز لغت نامۂ دہخدا ذیلِ آذر، نیز

شمع انجمن، ص ۶۵)۔ نادر شاہ کی حکومت کے پہلے سال میں ان کے والد آقا خان لار اور سواحلِ فارس کی حکومت پر سربلند ہوے (جلوسِ نادر در ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۶ء؛ سائیکس، ۲: ۲۵۴؛ نیز دیکھیے لاک ہارٹ: *Nadir Shah*، ص ۹۶ ببعد، جہاں سنۂ جلوس ۲۴ شوّال ۱۱۴۸ھ/ مارچ ۱۷۳۶ء درج ہے)۔ اس زمانے میں لطف علی شیراز آئے۔ دو سال بعد (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۸ء) بندر عبّاسی کے قریب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنے چچا حاجی محمد بیگ کے ہمراہ حج کے لیے راہِ عراقِ عرب سے روانہ ہوے؛ واپسی پر عراق میں مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت بھی کی۔ ایک سال بعد روضۂ امامِ رضا (''ثامن الائمّۃ وضامن الامّۃ''؛ آتش کدہ، ص ۴۳۳) کی زیارت کا شوق پورا کیا۔ اسی زمانے میں نادری لشکر ہندوستان و ترکستان کی تسخیر سے فارغ ہو کر جبالِ لَگزِیّہ (یعنی لگزیوں یا لزگیوں) کی طرف جا رہا تھا کہ مشہد میں وارد ہوا اور لطف علی آذر اس کے ہمراہ مازندران کے راستے آذربیجان گیا (نادر مشہد میں آخر شوّال ۱۱۵۳ھ/ اواسط جنوری ۱۷۴۱ء کو داخل ہوا اور ۲۶ ذوالحجّہ ۱۱۵۳ھ/ ۱۴ مارچ ۱۷۴۱ء کو وہاں سے نکلا تھا؛ لاک ہارٹ، ص ۱۹۷ ببعد)۔ لطف علی عراقِ عجم میں واپس آیا اور اپنے آبائی وطن اصفہان میں فروکش ہوا۔ نادر کے انتقال (جُمادی الاخرٰی ۱۱۶۰ھ/ ۱۹، ۲۰ جون ۱۷۴۷ء) کے بعد وہ علی شاہ، ابراہیم شاہ، شاہ اسمٰعیل اور شاہ سلیمان کے ملازمانِ رکاب میں رہا؛ آخر اُس نے جامۂ فقر پہنا اور گوشہ گیر ہو گیا۔

آذر کی تعلیم کا مفصّل حال معلوم نہیں۔ آتش کدے میں ص ۳۶۷، س ۸ پر اس نے نادر شاہ کے مؤرّخ میرزا مہدی خان کو (جو ۱۱۴۶ھ میں اصفہان میں تھا؛ ریو، ۱: ۱۹۳) ''استاذی'' کے لقب سے یاد کیا ہے، اس طرح ص ۴۳۳ پر لکھتا ہے کہ افاضلِ علما و عرفا و اعاظمِ شعرا کی خدمت میں پہنچا اور استفاضہ کیا اور اپنے فطری ذوق اور طبعی شوق کی وجہ سے شعر کہنے لگا۔ نظم کے قاعدے اکثر میر سیّد علی متخلّص بہ مشتاق سے سیکھے، سات ہزار شعر مدوّن کیے، مگر اصفہان لُٹا تو یہ کلام بھی ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد کا کلام بھی مرتّب کیا ہو گا، مگر دیوانِ آذر کے نسخے اب بہت کمیاب ہیں۔ کتاب خانۂ ریاست رام پور میں ایک دیوان ۶۴ ورق کا ہے، جس میں تقریباً دو سو سے زائد غزلیں ہیں (اورینٹل کالج میگزین، لاہور، بابت اگست ۱۹۳۰ء، ص ۶۷ و فہرست خطّی رضا لائبریری، رام پور، شمارہ ۳۴۷۳) اور بانکی پور (فہرست مخطوطات فارسیہ، ۳: ۲۱۹) میں تفصیلات مذکور ہیں۔

مثنوی یوسف زلیخا (تالیف ۱۱۷۶ھ) کا طویل انتخاب اور قصائد و غزلیات و رباعیات جو داخلِ تذکرہ ہیں ان سے وہ کوئی اعلیٰ درجے کا شاعر ثابت نہیں ہوتا (نوّاب صدّیق حسن خان: شمع انجمن میں لکھتے ہیں: ''خوش گوست، ترکیبِ دلنشین و معنیِ تازہ کمتر دارد'')۔ لے دے کر اس کی اہمیّت تذکرہ نگاری کی وجہ سے ہے اور اسی کو اس کا اصل کارنامہ خیال کرنا چاہیے۔

تالیف تذکرہ: دیباچے میں لکھتا ہے کہ جب میری عمر کے سنین کا شمار ۳۰ سے ۴۰ تک پہنچا تو میں اساتذہ کے کلام سے قصائد و غزلیات جمع کر چکا تھا اور جب ''زندگی کے دنوں کا کام ''سنِ نمَا'' سے ''حدِّ وقوف'' کو پہنچا متقدّمین کے دواوین ہاتھ لگے، انھیں دیکھا۔ معروف و غیر معروف تذکروں سے بھی مواد جمع کیا، معاصرین ہم صحبت کی چیزوں کا انتخاب کیا؛ جن سے ملاقات نہ ہوئی اَوروں سے اُن کا کلام لیا اور انتخاب کیا؛ شعرا کا مولد و منشأ بھی مطالعے سے معلوم کیا، ہر علاقے کے شاعروں کو الگ الگ ترتیبِ تہجّی سے درج کیا (ص ۴)۔ بانکی پور کی فہرستِ مخطوطات میں ہے کہ آغازِ تذکرہ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء (ص ۱۳۵) میں ہوا۔ کل تراجم کی تعداد تقریباً ۸۴۲ ہے (ریو)۔

معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے کی ترتیب و اضافے کا کام مدّتوں چلتا رہا؛ ۱۱۹۳ھ تک تاریخیں ملتی ہیں۔ ص ۴۲۰، س ۱۳ پر محمد صادق مہدی موسوی، نامی تخلّص، کی تاریخِ زندیّہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ابھی لکھی جا رہی ہے (سنۂ تکمیل ۱۲۰۹ھ)۔ اسی طرح ص ۴۱۵، س ۹ پر سالِ وفات درویش مجید ۱۱۸۵ھ، نیز ص ۴۲۲، س ۴ پر مرزا محمد نصیر کا سالِ وفات ۱۱۹۲ھ دیا ہے۔ بعض نسخوں میں مرزا حبیب اللہ فریبی کا حال بھی درج ہے (آتش کدہ، طبع کلکتہ ۱۲۴۹ء، ص ۵۳۵)؛ اس میں آذر نے فریبی کی تاریخِ وفات کا مادّہ دیا ہے، جس سے ۱۱۹۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ [عبداللطیف: تحفۃ العالم، حیدرآباد دکن ۱۲۹۴ھ، ص ۲۲۷ پر ہے کہ ''حاجی لطف علی بیگ آذر..... از احفادِ عمادالدّولہ محمد مومن خان شاملوی بیگدلی..... در ۱۱۹۵ھ وفات نمود۔'' (سیّد مرتضٰی حسین فاضل)] اِیتے (Éthé) کے بیان کے مطابق آذر ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء تک زندہ تھا (فہرست بادلی، شمارۂ ۳۸۴)۔

آتش کدہ کئی بار طبع اور شائع ہُوا۔ کتاب کا پورا حال بلانڈ (Bland) نے *JRAS*، ۷: ۳۴۵-۳۹۲؛ ۹: ۵۱ میں دیا ہے۔

مآخذ: لاک ہارٹ (Lockhart): *Nadir Shah*، لنڈن ۱۹۳۸ء؛ (۲) ریو (Rieu): *Catalogue of Persian Mss. in the British Museum*، ص ۳۷۴؛ (۳) Pertsch: *Verzeichniss der Persischen Handschriften der Königlichen Bibliothek zu Berlin*، برلن ۱۸۸۸ء، ص ۶۲۴؛ (۴) آذر: آتش کدہ، بمبئی ۱۲۹۹ھ؛ وہی کتاب کلکتہ ۱۲۴۹ھ؛ وہی کتاب بتصحیح حسن سادات ناصری، تہران، جلد اوّل، بہمن ماہ ۱۳۳۶ ش، جلد دوم ۱۳۳۸ ش؛ وہی کتاب بتصحیحِ سیّد جعفر شہیدی، تہران ۱۳۳۷ھ شمسی؛ (۵) شپرنگر: *Uudh Catalogue*، ص ۱۶۱؛ (۶) عبدالمقتدر: *Catalogue of the Arabic and Persian Mss. in the Oriental Public Library Bankipur*، جلد ہشتم، پٹنہ ۱۹۲۵ء، ص ۱۳۸؛ (۷) اِیتے (Éthe): *Bodl. Library Cat.*، ۱: ۲۶۱ (شمارہ ۳۸۴)؛ (۸) وہی مصنّف: *Catalogue of Persian Mss. in the India Office Library*، شمارہ ۶۹۳، ۶۹۴؛ (۹) نوّاب محمد صدّیق حسن خان: شمع انجمن، طبع ۱۲۹۳ھ، ص ۶۵؛ (۱۰) سائیکس

A History of Persia: (Sykes)، جلد دوم؛ (۱۱) سٹوری: Persian Literature، ج ۱/ ۲: ۸۷۱ ببعد.

(وحید قریشی)

⊗ **آذر:** (یا آذر ماہ = پہلوی: ۱۱۴۲ ۵۸۰ یزدگردی یعنی قدیم ایرانی شمسی سال کا نواں مہینہ۔ ایرانی سال کا آغاز ۱۶ جون ۶۳۲ء سے ہوا اور ۱۰۷۹ء تک قدیم مصری سال کی طرح اس سال کے بھی ۳۶۵ دن ہی رہے اور کبیسے کا رواج اس میں نہ ہوا۔ جلال الدّین ملک شاہ سلطانِ خراسان نے تقویم کی اصلاح کی اور کبیسے کو رواج دیا۔ یہ اصلاح شدہ ''جلالی'' سال ایک زمانے میں ایران میں بہت مقبول ہوا (مثلاً دیکھیے سیّد جلال الدّین طہرانی: گاہ نامہ، ۱۳۱۲ ش/ مارچ ۱۹۳۳ - فروری ۱۹۳۴ء، تہران ۱۹۳۳ء)، بلکہ ہندوستان کے پارسیوں کے ہاں یہ اب تک مروّج ہے۔

آذر ماہ کے پہلے دن رُکُوب الکَوکَبْ کا تہوار ہوتا ہے (مُروج)۔ آذر ماہ کے (یا چوتھے ماہ یعنی تیر ماہ کے) نویں دن کو ''آذر روز'' (یا آذرگان'') کہتے ہیں۔ قدیم ایرانیوں کے ہاں یہ دن خوشی اور جشن کا دن تھا۔

آذر ماہ کی وجہ تسمیہ کے متعلّق اقوال مختلف ہیں: (۱) پہلوی میں آذر بمعنی ''آتش'' ہے، اس مہینے میں آفتاب برج قوس میں ہوتا ہے، ہوا سرد ہو جاتی ہے اور آگ کی ضرورت محسوس ہونے لگ جاتی ہے، اس لیے اس ماہ کو آذر ماہ کہتے ہیں؛ (۲) ایرانی دیو مالا میں ''آذر ایزد'' آگ کے نگہبان فرشتے کا نام ہے۔ آذر ماہ اس کے نام پر موسوم ہوا (مینوی)۔

''آذر'' سے مراد ''آتش کدہ'' بھی ہے۔ چنانچہ سات سیّاروں کی مناسبت سے ''ہفت آذر'' (ایران کے سات بڑے بڑے آتش کدے) مشہور ہیں: آذر مہر، آذر نُوش، آذرِ بَہرام، آذر آیین، آذرِ خُرداد (یا آذر خُرین)، آذرِ بُرزین (آذر بُرزِین، دیکھیے یُوسٹی Justi، ۳)، آذر زردہُشت۔

''آذر'' (یا ''آدر'') یہودیوں کے سلیوقسی سال کے چھٹے ماہ کا نام بھی ہے اور بالعموم اس ماہ کے ۲۹ دن ہوتے ہیں۔ یہود اس ماہ کی ساتویں تاریخ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یومِ وفات مناتے ہیں اور نو تاریخ ان کے لیے روزے کا دن ہے۔

مآخذ: علاوہ کتبِ لغتِ فارسی مثلاً، برہان قاطع، لغت نامۂ دہخدا و شائن گاس دیکھیے: (۱) المسعودی: مروج الذہب، پیرس ۱۸۱۷ء، ۳: ۱۳۴ ببعد؛ (۲) عمر خیّام: نوروز نامہ، بتصحیح مجتبیٰ مینوی، تہران ۱۹۳۳ء، ۶: ۸۳؛ (۳) البیرونی: الآثار الباقیۃ، لائپزگ ۱۸۷۸ء، ص ۴۲؛ (۴) حسن تقی زادہ: گاہ شماری در ایران قدیم، تہران ۱۳۱۶ھ (شمسی)؛ (۵) وہی مصنّف: Old Iranian Calendars، لنڈن ۱۹۳۸ء، ص ۵۲؛ (۶) B. Vincent: Haydn's Dictionary of Dates، لنڈن ۱۸۹۵ء، ص ۵۸۳، ۹۳۳؛ (۷) R. Schram: Kalendariographische und Chronologische Tafeln، لائپزگ ۱۹۰۸ء، ص ۱۳۷-۱۸۱؛ (۸) Jewish Encyclopaedia، لنڈن و نیویارک ۱۹۰۱ء، ۱: ۱۸۴-۱۸۵؛ (۹) Encyclopaedia Britannica، طبع نہم، ۴: ۶۶۷؛ ۵: ۷۱۷؛ (۱۰) S. B. Burnaby: The Jewish and Muhammadan Calendars، لنڈن ۱۹۰۱ء، ص ۱۹۴؛ (۱۱) وُسٹنفلڈ: Vergleichungs - tabellen، Wiesbaden ۱۹۶۱ء، ص ۴۶، ۸۵.

(احسان الٰہی رانا)

آذربَیجان: (Azarbāydjān) (۱) ایران کا ایک صوبہ؛ * (۲) جمہوریۂ اشتراکیۂ شوروی۔

(۱) ایران کا بڑا صوبہ، جو [پہلوی یعنی] (ازمنۂ وسطیٰ کی فارسی) میں اتُر پاتا کان اور جدید فارسی کے دَورِ قدیم تر میں آذَرباذَگان یا آذَربایگان کہلاتا تھا اور اب آذَربایجان کے نام سے موسوم ہے۔ یونانی میں یہ Ατοοπατήνη، اَتُروپاتینے اور بوزنطی یونانی میں اذرابیگانون Αδραβιγάνων، ارمنی میں اَتُرا پاتاکان (Atrapatkan) اور سریانی میں آذَربایغان تھا۔ یہ صوبہ جنرل [سرتیپ] اَتُروپاتس (Atropates) (= ''در پناہ آتش'') کے نام پر موسوم ہے، جس نے اسکندرِ اعظم کے حملے کے وقت (۳۲۸ ق-م میں) اپنی آزادی کا اعلان کر کے اپنی مملکت (مادۂ خرد Media Minor، سٹرابو (Strabo)، ۱۱: ۱۳، س ۱) بچالی۔ یہ مملکت زمانۂ بعد کے ایران کے شمال مغربی کونے میں واقع تھی (قب ابن المقفع، دریاقوت، ۱: ۱۷۲ اور المَقدِسی، ص ۳۷۵: آذرباذ بن بیُوراسف)۔ خاندان اَتُروپات نے اَرشکیون [اَشکانیوں] کے عہد میں عروج حاصل کیا اور اس کے افراد نے شاہی خاندان میں شادیاں کیں۔ اس خاندان کے آخری رکن گائی اَسْ جُولیَس اَرتَوَزْد (Gaius Julius Artawazd) نے ۳۸ء میں روما میں وفات پائی، اس وقت ایران کے اَرشکی حکمران اس خاندان کی مملکت کو اپنی سلطنت میں شامل کر چکے تھے (زمانۂ قدیم کی تاریخ کے لیے قب Pauly- Wissowa، بذیل مادّہ Atropatene)۔ ساسانیوں کے عہد میں آذربیجان کا حاکم ایک مَرزُبان ہوا کرتا تھا اور اس عہد کے اواخر میں یہ صوبہ فرُّخ ہُورمزْد کے خاندان کے قبضے میں تھا (دیکھیے مارکار (Marquart): Eranšahr، ص ۱۰۸ - ۱۱۴)۔ آذربیجان کا صدرِ مقام شِنُیز (یا گَنزَک) تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں (جھیل اُرمیَہ کے جنوب مشرق میں) اب لَیلان کے کھنڈر موجود ہیں۔ اس شہر میں ایک مشہور آتش کدہ تھا، جس کی زیارت کے لیے ساسانی بادشاہ تخت نشینی کے وقت آیا کرتے تھے۔ آگے چل کر یہ آتش کدہ اَرشکیوں [اَشکانیوں] کے قلعے Βιθχρμαϊς, Ξηβαρμαϊς (حالیہ تخت سلیمان) میں، جہاں رسائی نسبتۂ زیادہ مشکل تھی، منتقل کر دیا گیا۔

عربوں کی فتحِ آذَربَیجان کا حال بذیل سنین ۱۸ - ۲۲ھ/ ۶۳۹ - ۶۴۳ء مختلف طرح پر بیان ہوا ہے۔ روایت ہے کہ [حضرت] عمرؓ کے عہد میں حُذَیفہؓ

بن الیمان نے نہاوند سے چل کر آذربیجان کو فتح کیا تھا؛ دوسری مہموں کی ابتدا شہرزور سے ہوئی۔ حذیفہؓ نے مرزبان سے، جس کا صدر مقام اردبیل میں تھا، معاہدہ کیا تھا، جس کی رو سے ایرانی حاکم نے [وزن معیّن کے] آٹھ لاکھ درہم دینا منظور کیا اور [حذیفہؓ] نے وعدہ کیا کہ وہ [ان میں سے] کسی کو نہ قتل کرے گا، نہ اسے غلام بنائے گا، آتش کدوں کو مسمار نہیں کرے گا اور بالخصوص اہلِ شیز کو ان رسوم کی ادائیگی سے جوان میں رائج تھیں نہ روکے گا اور بلاسگان، سکلان اور شاتر وذان کے کُردوں سے متعرّض نہ ہوگا [بلاذری، ص ۳۲۶= یاقوت، ۱: ۱۷۳].

آذربیجان کی (ایرانی الاصل) آبادی کثیر التعداد بولیاں بولتی تھی (المقدسی، ص ۳۷۵: [کہتے ہیں کہ] اردبیل کے نزدیک ستّر زبانیں بولی جاتی ہیں)۔ عرب سردار مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے، مثلاً رَوّاد الأزدی تبریز کے علاقے میں، بَعِیثُ الربیعہ مَرند میں، مُرّ بن علی الرُّدَینی بحیرۂ اُرمیہ کے جنوب میں وغیرہ وغیرہ۔ آہستہ آہستہ مقامی آبادی نے انھیں اپنے اندر جذب کر لیا؛ چنانچہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے وسط میں رَوّادیوں کو کُرد سمجھا جاتا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے سیّد احمد کَسرَوِی: پادشاہانِ گمنام، ج ۱-۳، تہران ۱۹۲۸-۱۹۲۹ء).

بابَک [رک بآن] کی بغاوت کے بعد آذربیجان پر خلافت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس صوبے کے آخری مستعد والی (از ۲۷۶-۳۱۷ھ/ ۸۸۹-۹۲۹ء) ساجی [رک بہ ساجیہ] تھے [قب زامباور، ص ۱۷۹]۔ انھوں نے بھی بالآخر بغاوت کر دی۔ ان کے زوال پر آذربیجان میں ملکی حکمران خاندان ابھر آئے۔ دَیسَم خارجی کے بعد (جو نیم عرب، نیم کُرد تھا) مَرزُبان بن محمد دَیلَمی نے، جو مذہبًا باطنی تھا، آذربیجان پر قبضہ جما لیا (دیکھیے مادّۂ (بنو) مُسافر)۔ دَیلَمیوں کے بعد کُردی رَوّادیوں نے [رک بہ RAWWĀDĪDS] [؟قب زامباور، ۱۸۴] (۳۷۳-۴۶۳ھ/ ۹۸۳-۱۰۷۰ء) اس ملک کی حکومت سنبھالی.

پانچویں صدی ہجری کے آغاز/گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کے عہد میں غُزّوں کے گروہوں نے، شروع شروع میں چھوٹے چھوٹے جتھّوں کی شکل میں اور بعد میں بڑی جمعیتوں کی صورت میں، آذربیجان پر حملے کیے اور بالآخر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آذربیجان اور ماوراے قفقاز کے متّصلہ علاقوں کی ایرانی آبادی ترکی زبان بولنے لگی۔ ۵۳۱ھ/ ۱۱۳۶ء میں آذربیجان اتابک ایلدِگز [رک بآن] (اصوب: *الدِگوز) کے قبضے میں آ گیا، جس کی اولاد نے احمدیلیوں [رک بہ احمدیلیہ] سے لڑتے بھڑتے اس ولایت پر حکومت کی تا آنکہ خوارزم شاہ جلال الدّین کا قلیل المدّت قبضہ (۶۲۲-۶۲۸ھ/ ۱۲۲۵-۱۲۳۱ء) یہاں ہوا، مگر اس کے تعاقب میں منگول یہاں آ پہنچے۔ اِیلخان ہُولاگُو کی آمد (۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء) نے آذربیجان کو ایک وسیع سلطنت کا مرکز بنا دیا، جو دریاے جیحون سے لے کر شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ مغلوں کا صدر مقام پہلے مَراغہ [رک بآن] تھا، اس کے بعد تبریز [رک بآن] ہوا، جو تجارت اور ثقافتی زندگی کا بڑا مرکز بن گیا۔ منگولوں اور ان کے جانشین جلائروں [رک بہ جلائر] کے بعد آذربیجان مغرب سے لَوٹ کر آنے والے ترکمانوں (قَرہ قویُونلُو [رک بآن]) اور آق قویُونلُو [رک بآن] کے قبضے میں چلا گیا، جن کا دارالحکومت تبریز تھا ۷۸۰-۹۰۸ھ/ ۱۳۷۸-۱۵۰۲ء).

۹۰۷ھ/ ۱۵۰۲ء کے بعد آذربیجان صفویوں کی پناہ گاہ اور ان کا نقطۂ اجتماع بن گیا، وہ خود اردبیل کے رہنے والے تھے اور اصلًا مقامی ایرانی بولی بولتے تھے۔ اس اثنا میں ۱۵۱۴ اور ۱۶۰۳ء کے درمیان تبریز اور اس صوبے کے بعض دوسرے حصّوں پر کئی بار عثمانی ترکوں کا قبضہ رہا۔ شاہ عبّاس نے ایرانی اقتدار بحال کیا، لیکن ایران پر افغانوں کے حملے کے دنوں میں (۱۱۳۵-۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۲-[۱۷۲۹ء]) عثمانیوں نے پھر آذربیجان اور ایران کے دوسرے مغربی صوبوں پر قبضہ جما لیا، یہاں تک کہ نادر شاہ نے انھیں یہاں سے باہر نکالا.

کریم خان زَند کے عہد کے ابتدائی دنوں میں آزاد خان افغان نے آذربیجان میں بغاوت کی اور آگے چل کر خُوئی [خُوَیّ] کے دُمبُلی کرد اور دوسرے قبائلی سردار آذربیجان کے مختلف حِصّوں کے مالک بنے رہے.

قاچاریوں کا دورِ حکومت شروع ہوا تو آذربیجان تخت کے ورثاے مسلّم (heirs-apparent) کا روایتی مسکن بن گیا۔ شمال میں روس کے ساتھ خط سرحدی کی آخری تعیین (دریاے اَرَس کے ساتھ ساتھ) ۱۹۲۸ء میں ہوئی (معاہدۂ ترکمان چای)۔ ترکی کے ساتھ مغربی سرحد کی تحدید کہیں ۱۹۱۴ء میں جا کر ہوئی۔ رضا شاہ کے عہد میں ایران نے آرارات [عبرانی تورات میں: اَرارَاط] کے شمال میں ایک چھوٹا سا علاقہ ترکیہ کے لیے واگزار کر دیا.

۱۹۰۵ء کے بعد آذربیجان کے نمائندوں نے انقلابِ ایران کی تحریک میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ ۳/اپریل ۱۹۰۸ء کو برطانیہ کی رضامندی سے روسی فوجیں تبریز کی غیر ملکی نوآبادیوں کی حفاظت کے لیے آذربیجان میں داخل ہوئیں، لیکن بعد ازاں مختلف بہانوں سے اپنے قیام کو طول دیتی رہیں اور ۱۹۱۴-۱۹۱۷ء کے درمیان ترکوں سے لڑائیاں لڑتی رہیں، جن میں کبھی فتح ایک کی ہوئی کبھی دوسرے کی۔ بالآخر روسی انقلاب کے بعد (۱۹۱۷ء میں) ان فوجوں نے آذربیجان خالی کر دیا۔ اور ۸ جون کو ترکی فوجیں ملک میں داخل ہوئیں اور تبریز میں ایک ترک دوست حکومت قائم کر دی۔ یہی زمانہ ہے جب آذربیجانیوں میں پہلے پہل خود شعوری کے اوّلین آثار نمودار ہوے۔ رضا خان نے، جو آگے چل کر رضا شاہ بنا، ۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ایرانی اقتدار بحال کیا۔ ۱۹۴۱ء کے واقعات کے بعد (ملاحظہ ہو مادّۂ ایران) سوویتی فوجوں نے ایران کے شمالی علاقوں پر، جس میں آذربیجان بھی شامل تھا، قبضہ جما لیا۔ اس فوجی قبضے کے پردے میں آذربیجان کے اندر داخلی استقلال کی تحریک نے زور پکڑا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ صوبہ جزوِ ایران رہے۔ روسیوں نے آذربیجان کو (مارچ ۱۹۴۶ء کے بجاے جس پر فریقین نے پہلے اتّفاق کیا تھا) مئی ۱۹۴۶ء کے آغاز میں خالی کر دیا۔ روسیوں کی اس

تاخیر پر مجلسِ ملکِ متحدہ (United Nations) میں زبردست بحث وتمحیص ہوئی اور یہ اتحادیوں کے درمیان پہلے مسلّم شقاق و افتراق کا موجب بنی۔ تخلیے کے بعد ایران کے وزیراعظم قوام [السلطنت] نے ۱۳ جون ۱۹۴۶ء کے معاہدے میں آذربیجان کا داخلی استقلال تسلیم کر لیا۔ اس معاہدے کی رُو سے آذربیجان کو مقامی خود اختیار حکومت (لوکل سِلف گورنمنٹ) کا اور مقامی ترکی بولی کے استعمال کا حق سرکاری طور پر مل گیا، لیکن ۴ نومبر کو ایرانی فوجیں آذربیجان میں داخل ہوگئیں اور وضعِ سابقہ (*status quo ante*) پھر بحال ہوگئی۔

جغرافیہ: فتوحاتِ اسلامی کے فوراً بعد اور ممکن ہے ساسانیوں کے عہد میں بھی صوبے (’کُورۃ‘) کی تشکیل کا اندازہ لگانے کے لیے آذربیجان کے شہروں اور رُستاقوں (districts) کی اُس فہرست کا مطالعہ بہت اہمّ ہے جو ابن خُرّداذبہ، ص ۱۱۹ پر درج ہے [سطور ذیل میں اسی کا تتبع کیا گیا ہے، اور نقشے کا: (۱) (مَراغہ)؛ (۲)[مَیانج]؛ (۳)اَرْدَبیل؛ [۴]وَرْثان]؛ [(۵)سِیسَر (=سِنّہ)]؛[۶] بَرْزَۃ (سَقِز؟)؛ [۷]سابُذ خاست؛ (۸)تَبْریز؛ [۹]مَرَند؛ [۱۰]خْوَیْ [خُوَیّ]؛ [۱۱] گُولْ سَرَہ؛ [۱۲]مُوقان؛ [۱۳]بَرْزَند؛ [۱۴]جَنْزَہ (گَنْزَک)؛[(۱۵)]جابُروان؛ (۱۶)نَرِیز]؛ [۱۷]اُرمِیَہ؛ [۱۸]سَلماس؛ [۱۹]شِیز؛(۲۰)باجَرْوان؛[۲۱]رُستاق السَّلَق؛[۲۲]رُستان سِنْدَ بایا؛(*سِنْد پایہ)؛[۲۳]البَذّ؛[۲۴]رُستاق اُرْم؛[۲۵]بَلْوَان کَرَج (=قَرَاجہ داغ؟)؛ [۲۶]رُستاق سَراہ (سَراب)؛[۲۷]دَسْکِیَا وَر(؟)[۲۸]رُستاق مائُ پَہْرَج۔ ان میں سے شمارہ[۵]، [۶]، [۷]، [۱۴]، [۱۵]، [۱۶]، [۱۹]، [۲۱]، [۲۸] بحیرۂ اُرمِیَہ کے جنوب میں (دَیْنَوَر کی سمت میں) واقع ہیں؛ شمارہ[۸]، [۹]، [۱۰]، [۱۷]، [۱۸] شمال مغربی، [شمالی اور شمال مشرقی] گوشے میں؛ شمارہ ۱، ۲، ۳، [۴]، [۱۱]، [۱۲]، [۱۳]، [۲۰]، [۲۳]، [۲۴]، [۲۵] اور [۲۶] تبریز کے خطِ طول بلد کے مشرق میں؛ شمارہ[۲۲]، [۲۷] کا محلِّ وقوع معلوم نہیں ہو سکا۔ جنوب میں سرحد شمارہ[۲۸] مائُ پَہْرَج ’’مَاذہ Media کی چوکی‘‘ پر تھی (جو ممکن ہے عصر حاضر کا سُنقُّر [رَتّ بآن] ہو۔ مشرق میں سرحدی خط میانہ [رَتّ بآن] اور زَنْجان [رَتّ بآن] کے درمیان سے گزرتا تھا۔ شمال مشرق میں بقول ابن خُرّداذبہ، ص ۱۲۱ ’’آخرُ عملِ آذربیجان‘‘ وَرْثان تھا (جسے اب اَلْتَن (Altan) کہتے ہیں اور جو دریاے اَرَس کے جنوبی کنارے پر واقع ہے)۔ گویا اس زمانے کے آذربیجان کی حدّیں تقریباً وہی تھیں جو عہدِ حاضر کے آذربیجان کی ہیں، لیکن چونکہ اداری اغراض کے لیے آذربیجان کے ساتھ عموماً متّصلہ علاقۂ اَرْمِنْستان اور اَرّان کو ملا لیا جاتا تھا (دیکھیے المَقْدِسی، ص ۳۷۴: اقلیم الرِّحاب، مشتمل برسہ کُورَہ): اس لیے اداری سرحدوں میں، خاص کر بعد کے ادوار میں، عارضی ردّوبدل ہوتا رہتا تھا۔ المَقْدِسی، ص ۳۷۴ میں خُوَیّ، اُرمِیَہ بلکہ داخرّ قان [دہخوارقان؛ درمسعود گیہان] کو بھی (جو تبریز کے جنوب میں ہے) اَرْمِنْستان کا حصّہ بتایا گیا ہے۔ یاقُوت کے بیان کے مطابق (تیرھویں صدی عیسوی میں) آذربیجان [کی شمالی حد] بَرْذَعَہ (Parthav) تک اتری ہوئی تھی۔ نُزْھۃ القلوب (تالیف ۷۴۰ / ۱۳۴۰ء)، ص ۸۹ میں نَخْجَوان [نَخْجُوان، در فرہنگِ جغرافیای ایران، ۴: ۵۲۵] اور اُرُدُوباد کو، جو دریاے اَرَس کے بائیں کنارے پر واقع ہیں، آذربیجان کا حصّہ بیان کیا گیا ہے۔

آذربیجان کی نمایاں طبعی خصوصیت وہ بلند پہاڑی چوٹیاں ہیں جو اس علاقے کے مختلف حصّوں میں نظر آتی ہیں اور کوہستانی سلسلے جوان چوٹیوں کو آپس میں ملاتے ہیں: اَرْدَبیل کے مغرب میں کوہِ سَوَلان [سَبَلان، جو ایک مردہ آتش فشاں پہاڑ ہے] (بلندی ۱۵،۷۹۲ فٹ)، تبریز کے جنوب میں کوہ سَہَنْد ہے (بلندی ۱۲،۰۰۰ فٹ) اور کوہِ آرارات صغیر (بلندی ۱۲،۸۴۰ فٹ) [انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۶۱ء) میں ۱۷ ہزار فٹ]، جس کے جنوب میں وہ طویل سلسلۂ کوہستان ہے جو ترکی اور عراق کے درمیان حدِّ فاصل ہے اور جس کے جنوبی حصّے میں بہت سی اونچی اونچی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ آذربیجان کا وسطی علاقہ خاصے بڑے بڑے میدانوں (تبریز، مَرَند، خْوَیْ، سَلماس) اور بلند پہاڑی میدانوں [فلات ہاے مرتفع] کا ملا جلا علاقہ ہے، جن میں عمیق آبکندوں نے راستہ بنا لیا ہے۔

آذربیجان کا علاقہ بحیرۂ خَزَر، جھیل اُرمِیَہ اور دریاے دجلہ کے طاسوں پر مشتمل ہے۔ بحیرۂ خَزَر کی طرف آذربیجان کے حسبِ ذیل دریا بہتے ہیں: (۱) سَفِید رُود کے معاون، جو کوہ سَہَنْد کے جنوب مشرقی پہلو سے نکلتے ہیں؛ (۲) دریاے اَرَس کے جنوبی معاون (اَرْدَبیل کا دریا، قَرَہ سُو؛ قراجہ داغ کے دریا؛ خْوَیْ کا دریا اور ماکُو کا دریا، زنگی چاے)۔ اندرونی جھیل اُرمِیَہ [رَتّ بآن] میں [جس کا طاس ایران کا وسیع ترین طاس ہے] ۵۲،۵۰۰ مربّع کیلومیٹر کے رقبے کا پانی آ کر گرتا ہے (یعنی مراغہ کے دریا: صوفی چاے وغیرہ کا؛ تبریز کے دریا: اَجی چاے کا؛ سَلماس اور اُرمِیَہ کے بے شمار دریاؤں کا اور کُردی اضلاع کے اہمّ دریاؤں، جَغَتُو، تاتائُو [تغتو-مستوفی]، اور گادِرکا)۔ زابِ اصغر سرحدی سلسلۂ کوہ کی ایرانی طرف سے نکلتا ہے اور رخنۂ آلان میں سے گزر کر شمالی عراق کے میدانوں میں پہنچتا ہے اور دریاے دجلہ میں جا گرتا ہے۔ [آذربیجان کا علاقہ صرف زرخیز ہی نہیں ایران کے اکثر صوبوں سے زیادہ زرخیز ہے۔ اُس میں لکڑی کم ہے، مگر معدنیات کی خاصی افراط ہے۔ آب وہوا گرمیوں میں زیادہ گرم اور سردیوں میں زیادہ سرد ہے، آب پاشی کے لیے دریاؤں کا پانی آسانی سے میسّر آتا ہے۔ حالیہ دَور میں شمال مشرقی آذربیجان کو، جو ایران کے دس اُستانوں میں سے ایک ہے، اُستان سوم کہتے ہیں اور اس کا دارالحکومت تبریز ہے۔ اس اُستان کی آبادی ۱۹۵۶ء کی سرشماری کے مطابق بیس لاکھ چالیس ہزار ہے].

آذربیجان کے لوگ اکثر دیہات میں رہتے ہیں۔ وہاں کے بڑے بڑے شہر حسبِ ذیل ہیں [آبادی ۱۹۵۶ء کے اعداد وشمار کے مطابق درج کی گئی ہے]:

تبریز (آبادی [۲،۹۰،۱۹۵]؛ اَرْدَبیل (آبادی [۶۵،۷۲۰]: اُرْمِیَہ [۶۷،۵۸۰])؛ خُویّ (کل آبادی تقریباً پچاس ہزار، مگر شہر کی فصیل کے اندر کی آبادی ۳۴،۵۰۹)؛ مَرَاغَہ (آبادی [۳۶،۵۵۶])۔ مُوغان کے نیم خانہ بدوش لوگ بے درخت میدانوں میں (ترکی شاہ سِوَن [رَکْ بآن]) اور ترکی سرحد سے ملے ہوے کُردی اضلاع میں اور جھیل اُرْمِیَہ کے جنوب میں پائے جاتے ہیں۔ آبادی کی بڑی اکثریت مقامی بولی ''آذربیجانی ترکی'' بولتی ہے (دیکھیے مادّۂ آذَرِی)۔ ایرانی تلحین (intonations) اور صوتی ہم آہنگی (vocalic harmony) کی طرف سے بے نیازی اس بولی کی نمایاں خصوصیات ہیں اور یہ چیزیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ مستترک (Turkicised) آبادی غیر ترکی الاصل ہے۔ پرانی ایرانی (آذری) بول چال کی بچی کھچی نشانیاں قراجہ داغ میں سَہَنْد کے قریب اور جُلْفا وغیرہ کے قریب بسنے والے بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں کی بول چال میں ملتی ہیں۔ فارسی سرکاری طور پر مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ ارمنی اور اثوری ("Aysor") ان اضلاع میں پائے جاتے ہیں جو جھیل اُرْمِیَہ کے مغرب میں ہیں۔ کُردی زبان مغربی سرحد سے ملے ہوے علاقوں میں اور جنوبی اضلاع میں بولی جاتی ہے جو دریاے تاتائُو کے مغرب میں واقع ہیں۔ [مواصلات کا نظام صوبے کے اندر اچھا ہے۔ تبریز اور جُلْفا کے درمیان ریل بھی ہے اور سڑک بھی۔ اسی ریلوے لائن کی ایک شاخ بحیرۂ اُرْمِیَہ کے کنارے تک پہنچتی ہے۔ انتہائی شمال مغرب میں بھی ریل کی لائن ہے۔ تبریز اور ساحلِ بحیرۂ خزر کے بعض شہروں کے درمیان بلکہ قزوین تک بھی سڑک سے سفر کر سکتے ہیں].

مآخذ: (۱) مارکار (J. Marquart): *Ērānšahr*، ۱۹۰۱ء، ص ۱۰۸-۱۱۴؛ (۲) P. Schwarz: *Iran im Mittelalter*، ج ۸، ۱۹۳۲-۱۹۳۴ء، ص ۹۵۹-۱۶۰۰ (عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات کا نہایت مفصّل خلاصہ)؛ (۳) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۱۵۹ ببعد؛ (۴) مِنَوْرْسْکِی (V. Minorsky): *Roman and Byzantine Campaigns in Atropatene*، در *BSOAS*، ۱۹۴۴ء، ص ۲۴۵-۲۶۵ (قبؔ E. Honigmann: *Byzantion*، ۱۹۴۴-۱۹۴۵ء، ص ۳۸۹-۳۹۳)؛ (۵) وُلَاۃِ عرب کی فہرست کے لیے قبؔ R.Vasmer: *Chronologie der arabischen Statthalter von Armenien* etc.، ص ۷۵۰-۸۸۷، وی انّا ۱۹۳۱ء؛ (۶) Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۷۶۳-۱۰۴۸؛ (۷) Khanikoff & Kiepert: *Map of Aderbaijan*، در *Z. f. allgem. Erd.*، ۱۸۶۲ء؛ (۸) J. de Morgan: *Mission scientifique*، ۱: ۲۹۰-۳۵۸؛ (۹) فرہنگِ جغرافیای ایران، ج ۴، ۱۹۵۱ء (فہرست دیہات، نقشہ جات)؛ (۱۰) A. Monaco: *L'Azerbeigian persiano, Soc. geogr. italiana*، ۱۹۲۸ء؛ [(۱۱) محمد علی تربیت: دانش مندانِ آذربایجان، تہران ۱۳۱۴ھ؛ (۱۲) مہدی مجتہدی: رجال آذربیجان (درعصر مشروطیت)، تہران ۱۳۲۶ھ] نیز دیکھیے مادّہ ہاے اَرْدَبیل، بَرْزَنْد، گَنْزَہ، خُویْ، مَرَاغَہ، مَرَنْد، مُوقان، Nirīz، [سَلَماسْ]، سأُوْج بُلاغ (مَہاباد)، شِیز، سِیْسَر، سُلْدُوز، تَبْرِیز، اُرْمِیَہ اور اُشْنُو.

(مِنَوْرْسْکِی V. MINORSKY)

---

(۲) آذربَیْجان: (جمہوریۂ اشتراکیّۂ شوروی Az. SSR)، یہ مملکت ماوراے قفقاز کے مشرقی حصّے میں کوہ قاف کی جنوب مشرقی شاخوں، بحیرۂ خَزَر کے ساحل اور دریاے اَرَس کے درمیان واقع ہے [شمال اور مغرب میں یہ علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور اس کے مشرق اور جنوب میں بحیرۂ خَزَر ہے۔ ملک کا وسطی حصّہ پست ہے، جسے دریاے کُر (Kura) سیراب کرتا ہے] (اور اس کا ایک معاون دریاے اَرَس اس ملک کو آذربَیجان نام کے ایرانی صوبے سے جدا کرتا ہے [اور ''مرزِ ایران وشوروی'' ہے])۔ شمال مشرق میں یہ مملکت جمہوریۂ داغستان یا استقلالِ داخلی (اشتراکی وفاقی شوروی جمہوریّۂ روس (The Russian Socialist Federal Soviet Republic,(RSFSR)) کی سرحد پر ہے اور شمال مغرب میں یہ جمہوریّۂ اشتراکیۂ شوروی گرجستان کی سرحد پر ہے اور دریاے اَلَزَن (Alazan) سرحد کا خط [خطِ مَرْز] ہے]، مغرب میں یہ جمہوریّۂ اشتراکیۂ اَرمینیہ کی سرحد پر ہے۔ (خطِ فاصل جھیل سِوَن = گو/کُچِہ کے مشرق میں واقع ہے)۔ جنوب مغرب میں جمہوریّۂ نَخْچُوان بااستقلالِ داخلی (ASSR)، جو چار طرف سے اَرمینیہ کے علاقے میں گھری ہوئی ہے، جمہوریّۂ آذربیجان کا ایک حصّہ ہے اور [قَرَا باغ] کا پہاڑی علاقہ (جن میں ارمنی لوگ خاصی تعداد میں آباد ہیں) آذربیجان کے اندر داخلی استقلال والے علاقے (oblast) کی حیثیت رکھتا ہے.

تاریخی اعتبار سے اس جمہوریّہ کا علاقہ وہی علاقہ ہے جس کا نام کلاسیکی مصنّفین نے اَلبانیا (Albania) لکھا ہے (مثلاً Strabo، ۱۱: ۴؛ Ptolemy، ۵: ۱۱) اور جسے ارمنی میں اَلْوَان کَعْ، (Alvan-k') اور عربی میں [الرَّان یا] اَرّان [رَکْ بآن] لکھا جاتا تھا۔ اس جمہوریہ کا اُس حصّے سے جو دریاے کُر (کُرَہ) کے شمال میں واقع ہے مملکتِ شَرْوان (بعد کے زمانے کا شِرْوان [رَکْ بہ Shirwān]) شکل پذیر ہوتی تھی.

[زارِ] روس کی شہنشاہی فوجوں کی شکستِ فاش کے بعد اتّحادیوں نے ([بقیادتِ] جنرل دَنْسْتِرْوِل (General Dunsterville)، ۱۷/ اگست ۱۹۱۸ء سے ۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء تک) روس کی طرف سے باکو پر تحفّظ کے خیال سے قبضہ کرلیا۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ترکی فوجوں نے نوری پاشا کے زیرِ قیادت باکو پر قبضہ کرلیا اور سابقہ صوبے کو آذربَیْجان کا نام دے کر اس کا نظم ونسق نئے سرے سے قائم کیا۔ صوبے کو یہ نام دینے کی توجیہ یہ کی گئی کہ اس کی ترکی زبان بولنے والی آبادی ایرانی صوبے آذربیجان کی ترکی زبان بولنے والی آبادی کے مماثل ہے،

اس لیے اس کا نام بھی وہی ہونا چاہیے۔ متارکۂ مُدرُوس (Mudros) کے بعد جب اتحادیوں نے باکو پر دوبارہ قبضہ کرلیا (۱۷/اکتوبر ۱۹۱۸ء) تو جنرل ٹامسن (Thomson) نے (۲۸ دسمبر ۱۹۱۸ء کو) [تاتاریوں کے] حزبِ ''مُساوات'' [حامیانِ استقلالِ ملّی یا نیشنلسٹ پارٹی] کی اسی حکومت کو جو آذربیجان میں پہلے سے موجود تھی واحد حکمران جماعت تسلیم کرلیا۔ اتحادیوں نے علاقہ خالی کر دیا تو ۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء کو کسی قسم کے مسلّح مقابلے کے بغیر باکو میں سوویتی حکومت کے قیام کا اعلان ہوگیا اور ماورائے قفقاز کی تین وفاقی جمہوریتوں [اَرمینیہ، گُرجستان اور آذربیجان] میں ایک جمہوریت آذربیجان کی بنی۔ ۱۹۳۶ء میں وفاق کا خاتمہ ہوگیا اور ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو جمہوریۂ آذربیجان کو اتحادِ شوروی [کے اجزاے ترکیبی یعنی] ۱۶ ریاستوں میں سے ایک کی حیثیت میں اتحادِ جمہیرِ اشتراکیۂ شوروی (U.S.S.R) میں شامل کرلیا گیا۔

[ترکی زبان یہاں بالکل متروک ہے۔ ۱۹۲۹ء میں عربی رسمِ خط کے بجاے لاطینی رسمِ خط رائج کیا گیا اور ۱۹۳۸ء سے روسی زبان کی تعلیم ہر بچے کے لیے لازمی قرار دی گئی]۔

جمہوریۂ آذربیجان کا موجودہ رقبہ [۳۳،۰۰۰ مربّع میل] اور آبادی [سرشماری ۱۹۵۹ء کے مطابق سینتیس لاکھ] ہے۔ کل آبادی کا ۳۸ فی صد شہروں میں آباد ہے۔ آبادی میں آذربیجانی ترک اکثریت میں، تقریباً چھیاسٹھ فی صد ہیں۔ [گُرجی ۷ء۲ فی صد]، ارمنی ۱۲ فی صد اور روسی [۱۴] فی صد ہیں۔ جمہوریّہ کے دارالحکومت باکو [رَک بآن] کی آبادی آٹھ لاکھ نو ہزار اور گنجہ [رَک بآن] (سابقاً Elizavetpol اور کیرُوف آباد Kirovābād) کی آبادی [ایک لاکھ سولہ ہزار] نفوس پر مشتمل ہے۔ دوسرے بڑے شہر شماخی، قُبا، سالیان، نُخی اور منگے چُور (Mingečawr) وغیرہ ہیں۔

[باکو میں دانش گاہِ سلطنتی موجود ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اَکادمیِ علومِ آذربیجان کے ساتھ کئی تحقیقی ادارے ملحق ہیں۔ چند سالوں سے اَکادمیِ زراعت بھی وجود میں آگئی ہے۔

آب و ہوا اقلیمی ہے۔ گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں بہت سرد۔ اناج، ترکاریاں، تمباکو، پھل اور چاے کی پیداوار خوب ہے۔ روئی کی کاشت پر خصوصاً زور دیا جارہا ہے۔ معدنی پیداوار، خاص کر تیل کی پیداوار کے لحاظ سے، یہ ملک بہت حاصل خیز ہے۔ قیمتی دھاتیں، لوہا، چونے کا پتھر اور نمک پایا جاتا ہے۔

ریل کے نظام کا مرکز باکو ہے۔ بحرِ خزر کے کنارے کنارے باکو-ـو- مُخاچ قلعے کی لائن ہے، نیز باکو-ـو- دربند؛ باکو-ـو- جُلفا-ـو- نخجوان-ـو- اریوان کی لائن جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ جاتی ہے؛ باکو-ـو- کیروف آباد-ـو- تفلس والی لائن آذربیجان کو جارجیا سے ملاتی ہے۔

سڑکیں بھی ہیں (۱۹۵۸ء میں ان کا طول بارہ ہزار میل تھا)]۔

مآخذ: (۱) *Bolshaye Sovietskaye Entsik*، ۱۹۵۱ء؛ (۲) *Chambers's Encyclopaedia*، ۱۹۵۰ء؛ (۳) L. C. Dunsterville: *The Adventures of Dunsterforce*، لنڈن ۱۹۲۰ء؛ [(۴) سٹوری، جلد اوّل، بہ اِمدادِ فہرست بذیل آذربیجان؛ (۵) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۶۱ء، ۲:۸۲۸ ببعد].

(V. MINORSKY مِنوُرسکی)

آذری: (Ādharī, Azerī) ایک ترکی بولی۔ *

(۱) زبان؛ (۲) ادب۔

(۱) زبان:

لفظ ''آذری'' جو ''آذربیجان'' کا اسم منسوب ہے، دسویں صدی ہجری میں اور اس کے بعد سے مختلف نسلی گروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ کلمہ جمہوریۂ آذربیجان کے لیے، جو ۱۹۱۸ء میں قفقاز میں قائم ہوئی استعمال کیا گیا تھا۔ اب اس لفظ کا اطلاق نہ صرف روسی جمہوریۂ آذربیجان اور ایرانی آذربیجان پر، بلکہ اُس ترکی آبادی پر بھی ہوتا ہے جو خراسان، اَسْتَر آباد، ہَمدان، ایران کے دیگر اضلاع، داغستان اور گرجستان میں سکونت پذیر ہے۔

''آذری ترکی'' نے مدّت ہاے دراز سے ایک ادبی زبان ہونے کی حیثیّت سے اپنی انفرادیّت برقرار رکھی ہے۔ تاریخ و تصریف کے اعتبار سے ترکی بولیوں کی جدید ترین طبقہ بندی کے مطابق جو دو زبان شناسوں (راڈلوف اور سموئیلو ویچ)، نے کی ہے آذری ترکی ''جنوبی ترکی'' طبقے میں شامل ہے یعنی اس طبقے میں جس میں اناضول، ترکمنستان، جزیرہ نماے بلقان اور کریمیا کے ساحلی علاقوں کی ترکی بھی شامل ہے۔ اگرچہ اب تک اس بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ حرفِ آخر کا حکم نہیں رکھتا تاہم کہہ سکتے ہیں کہ تکلّمی آذری بولیوں کی تقسیم حسبِ ذیل ہے:

(۱) باکو اور شِروان کی بولیاں؛ (۲) گنجہ اور قراباغ کی بولیاں؛ (۳) تبریز کی بولی؛ (۴) اُرمیہ کی بولی۔

مآخذ: ۱۹۳۳ء تک شائع شدہ مصادر کی طویل و عریض فہرست کے لیے دیکھیے اے۔ جعفر اوغلو: شرق ده و غرب ده آذری لهجه سی تدقیقلری، آذربیجان یورت بلگیسی، ج ۳، استانبول ۱۹۳۳ و ۱۹۳۴ء۔ بڑے تحقیقی اور علمی مطالعات حسبِ ذیل ہیں: J. Zenker: *Allegemeine Grammatik der Türkisch-Tatarischen Sprachen*، لائپزگ ۱۸۴۸ء؛ (۲) K. Foy: *Azerbajğanische Studien mit einer Charakteristik des Südtürkischen*، در *MSOS*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۶-۱۹۳؛ ۱۹۰۴ء، ص ۱۹۷-۲۶۵؛ (۳) H. Ritter: *Azerbeidschanische Texte zur nordpersischen Volkskunde*، در *Isl.*، ۱۹۲۱ء، ص ۱۸۱-۲۱۲؛ ۱۹۳۹ء، ص ۲۳۴-۲۶۸؛ (۴) اے۔ جعفر اوغلو: *75 Azärbajğanische lieder*

"Bajaty" in der Mundart von Gängä nebst einer sprachlichen Erklärung، بریسلاؤ (Breslau) ۱۹۳۰ء؛ (۵) ایس۔ طالپ خان بک لی (Talîp hanbeyli): قراباغ۔ استنبول شِیوہ لرینک صَوْتیات جِہَتْلَرِین مقایسہ سی، آذربیجان یورت بیلگیسی، ج ۳؛ (۶) شیر علیف (M. A. Shiraliev): Izsledovanie narechiy azerbaydjanskovo yazika، ماسکو ۱۹۴۷ء؛ (۷) H. Seraja Szapszal: Proben der Volksliteratur der Türken aus dem Persischen Azerbaidschan، کُراکاؤ (Cracow) ۱۹۳۵ء؛ (۸) مُحَرَّم اِرْگین: قاضی برھان الدّین دیوانی اوزرِنده بر گرامر دِنمه سی، تورک دِلی ولِهْ جیاتی دِرْ گیسی، ج ۴، استانبول ۱۹۵۱ء، ص ۲۸۷ ـ ۳۲۷؛ (۹) T. Kowalski: Sir Aurel Stein's Sprachaufzeichnunge n in Äinallu- Dialekt aus Südpersien، کُراکاؤ (Cracow) ۱۹۳۷ء؛ (۱۰) K. Dmitriev و O.Chatskaya: Quatrains papulaires de l'Azerbaïdjan، در JA، ۱۹۲۸ء، ص ۲۲۸ ـ ۲۶۵؛ (۱۱) جیحون بک حاجی بک لی: Le dialecte et le folklore du Karabagh، در JA، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱ ـ ۱۴۴؛ دیکھیے نیز ایم۔ ایف۔ کورپُرُولو کا مقالہ "Âzerî" در IA.

(۲) ادب: اگر ہم کتابِ دِدِهْ قُوْرقُد [رک بہ Kitāb-î-Dede Korḳud] کو نظر انداز کر دیں، جس کی تصنیف گیارھویں صدی سے منسوب کی جاتی ہے گو اس کا متن غالباً چودھویں صدی سے پہلے متعیّن نہیں ہوا تھا، تو آذری ترکی ادب میں پہلا بڑا نام شیخ عزّ الدّین [اِسْفَرایینی] کا ہے، جو تیرھویں صدی کا مشہور شاعر تھا اور جس کا تخلّص حسن اوغلو یا پُورِ حسن تھا۔

چودھویں صدی کے دو بڑے شاعر جنھوں نے آذری ادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا، قاضی برہان الدّین [رک بآن] اور نسیمی [رک بآن] تھے۔ نسیمی، جو بعض اوقات حُسَینی بھی [تخلّص] کرتا تھا، امیر تیمور کا ہم عصر تھا۔ وہ نہ صرف عربی و فارسی، بلکہ آذری میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا اور اُس نے اپنی شاعرانہ قابلیت کو حروفی عقیدے کی ترویج و اشاعت میں صرف کیا۔ اس کے سادہ اور دلکش طرزِ بیان نے اُسے اپنے زمانے کا مقبول ترین شاعر بنا دیا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ آذری ادب کا وسطی دَور اُس پر ختم ہوا، لیکن اس کی شاعری کے موضوعات اور تغزّلانہ رنگ نئے دور کے ارتقا پر بھی اثر انداز ہوئے۔

اُس سادہ ترکی اسلوب کو جس کی ابتدا نسیمی نے کی تھی حَبیبی، شاہ اسمٰعیل صفوی اور فضولی نے معراجِ کمال کو پہنچا دیا۔ حبیبی، شاعر، غزل گو اور عالم، جو کچھ عرصے تک شاہ اسمٰعیل صفوی کی سرپرستی سے مستفیض رہا، نسیمی، شاہ اسمٰعیل اور فضولی کے درمیان ایک منزل کی تشکیل کرتا ہے۔ اُس کی بے مثال صوفیانہ غزلوں کی زبان اُس کے پیشروؤں کی زبان سے بہت کم اختلاف رکھتی ہے، لیکن اُس کے ہم عصر شاہ اسمٰعیل [رک بآن] (''خطائی''، ۱۴۸۵ ـ ۱۵۲۵ء) نے عوام کی حقیقی آذری ترکی کو ادبی زبان بنا دیا۔ کلاسیکی ادبی زبان سے اس اختلاف کا سبب محض یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ اسمٰعیل اپنے سیاسی اور مذہبی خیالات کو بہت سے لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ بہرحال اُس نے آذری ادب میں ایک نئے دَور کا آغاز کیا، کچھ تو اس طرح کہ اُس نے عربی آمیز فارسی زبان سے احتراز کرنے کی کوشش کی، جسے فُضُولِی [رک بآن] استعمال کرتا تھا اور کچھ اپنی نمایاں تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت۔ اس کے بعد کے مصنّفین نے جو راستہ اختیار کیا وہ وہی تھا جس کا میلان عوام کی زبان اور ادب کی جانب تھا۔

اس نئے ارتقا میں جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں جاری رہا اُن سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تحریکوں کا بھی اہم حصّہ تھا جو اُس وقت آذربیجان میں چل رہی تھیں۔ اُن نیم آزاد خانی ریاستوں میں جو اس وقت وجود میں آ رہی تھیں کلاسیکی ادب عوامی ادب کے پہلو بہ پہلو نشوونما پانے لگا۔ اس عوامی ادب کی تخلیقات میں رومانی نظمیں شامل ہیں، مثلاً قورراوغلو، عاشق غریب، شاہ اسمٰعیل اور اَصْلِی و کِرَم۔ اس نوعِ ادب نے، جو ادبِ ''عاشِق'' (''عاشِق'') کہلاتا ہے، آذربیجان میں بہت ترقّی کی اور کلاسیکی ادبی زبان اور مقامی بولیوں کے مابین ایک واسطہ بن گیا۔

عوامی ادب کی ترقّی کا اثر کلاسیکی ادب کے ارتقا پر بھی ہوا، جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے شعرا، مسیحی، صائب تبریزی [رک بآن]، قُدْسی، آغا مسیح شِرْوانی، نِشاط، وِدادی اور واقف کی زبان میں خصوصیّت سے نمایاں ہے۔ اِن میں قُدْسی اور مسیحی اپنی قادرالکلامی کی وجہ سے خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ سب سے بڑھ کر، تخلیقی مصنّفین، وِدادی اور واقف نے (اٹھارھویں صدی)، جو 'عاشِق' ادب کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے، اپنی نظموں سے عوام النّاس کے ایک بڑے طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وِدادی نے، جو پُرگو مُتَغَزِّل شاعر تھا، آذری ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس کے ہم عصر، ملّا پناہ واقف (۱۷۱۷ ـ ۱۷۹۷ء) کو دبستانِ جدید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے موضوع مظاہرِ حیات سے انتخاب کرتا ہے اور اپنی نظموں میں مؤرّخ اور حقیقت نگار کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ اپنی محبوبہ اور دوسرے حسینوں کی تعریف میں اُس نے جو شیریں اور عوامی تغزّل سے بھرے ہوئے گیت لکھے ہیں، اُن کی سادگی، خلوص اور خوش آہنگی کی بدولت اسے آذری بولنے والوں میں عظیم اور پائدار شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ اسی قسم کا شاعر ذاکر (۱۷۷۴ ـ ۱۸۵۷ء) بھی ہے، جو انیسویں صدی میں آذری مزاحیہ شاعری کا سب سے بڑا استاد ہو گزرا ہے۔ وہ آذری ادب کا مقدّم ترین صاحبِ اسلوب شاعر تھا؛ اُس نے چبھتے ہوئے اشعار میں اپنے زمانے کی بے انصافیوں اور کوتاہیوں کی ہجو بھی کی ہے۔

واقف کے بعد نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ آذری ادب میں عملاً انقلاب رونما ہوا اور شعر کی بہت سی نئی قسمیں پیدا ہوگئیں، جو آخوندزادہ [رک بآن] کی کامل عبقریت (genius) کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ اب پہلی بار ہمیں تاریخی تصانیف، تمثیلی روایات (ڈراما) اور نثر کی کتابیں نظر آتی ہیں۔ عبّاس قُلی آغا قُدْسی (باقی

خانْلی: ۱۷۹۴-۱۸۴۷ء) شاعر، ادیب اور محبِّ علم، اپنی غزلیہ اور ہجویہ تصانیف کے لیے مشہور ہے۔ ان ادبی مجالس نے، جنھیں اِدھر مرزا شفیع ''واضح'' نِباتی اور ناتَوان خانیم (۱۸۳۷-۱۸۹۷ء) نے قائم کیا اور اُدھر قراباغ اور شَماخی میں بھی وہ قائم کی گئیں اور جنھیں سیّد عظیم، عاصی، نِوْرِس، قُدْسی، صَفا اور سالک ایسے شعرا نے جاری رکھا، اپنی باہمی رقابتوں کی بدولت آذری ادب کو مالا مال کرنے میں بہت حصّہ لیا۔ سیّد عظیم (۱۸۳۵ - ۱۸۸۸ء)، جسے غزل اور قصیدے کا استاد مانا جاتا تھا، ترقّی پسند اخبار اِیکِنْجی سے وابستہ ہو گیا، جسے ۱۸۷۵ء میں حسن بِک زِرْدابی (۱۸۴۱-۱۹۰۷ء) نے جاری کیا تھا اور اُس نے اپنی شاعرانہ مہارت کو لوگوں کے مذہبی تعصّبات پر طعن و تشنیع میں صرف کیا۔

انیسویں صدی کے اواخر کو آذری اخبار نویسی کے ارتقا کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ پہلے آذری اخبار اِیْکِنْجی کے ظہور کے بعد اَور متعدّد اخبار جاری ہو گئے: ضیاء اور ضیاء قفقاز تِفْلِس میں (۱۸۷۹ - ۱۸۸۴ء)، کِشْکوْل (۱۸۸۳ - ۱۸۹۱ء)، شَرْقِ رُوس (۱۹۰۳- ۱۹۰۵ء)۔ یہ سب کے سب ترقی پسند ادیبوں کے لیے نقاطِ اجتماع بن گئے۔ اس نئے رجحان کو روس کے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے باعث قابلِ ذکر فروغ نصیب ہوا۔ اس لیے کہ اس وقت حالات زیادہ موافق ہو گئے اور نئے نئے موضوعات، تصوّرات اور اشخاص سامنے آنے لگے۔ نئے رسائل کی ایک رَو چل پڑی: حیات، اِرشاد، تِرَقّی، کَیْسْپِیّ (*Kaspiy*)، اَچِیْق سو/ز۔ ان کے شائع کرنے والے احمد آغا اوغلو، علی بک حُسین زادِہ، علی مِرْدان توپچی-باشی اور مُحمّد اِمین رِسُول زادِہ تھے، جو سب قوم پرست اور جدّت پسند تھے اور عثمانلی، روسی اور ایرانی ادبی اور سیاسی زندگی سے باخبر تھے۔ اُن کی اور اُن جیسے اَور لوگوں کی مساعی حسنہ کی بدولت عوام النّاس اس نئی ثقافتی تحریک سے مانوس ہو گئے۔ اس معرکے میں آذری ہجونگاری کا بے نظیر استاد، اَلْکِپر صابِر (م ۱۹۱۱ء) پیش پیش تھا، جس نے اپنا زورِ قلم تمام تر رجعت پسندی، تعصّبِ مذہبی اور جہالت کی کھال ادھیڑنے میں صرف کر دیا۔ اس بارے میں اسے مشہور شاعر جِلِیل مَمِت [محمد] قُلی زادِہ سے، جو ترقّی پسند عوامی مجلّہ ملّا نصر الدّین کا مدیر تھا اور اسی طرح عبّاس صِحّت (۱۸۷۴-۱۹۱۸ء) سے بھی مدد ملی۔

مُحمّد ہادی اور حُسین جاوِید ترکی ادب سے متأثّر ہوے تھے اور وہ نامِیق کِمال، فِکْرِت اور حامِد کا تتبّع کرتے رہے؛ احمد جِواد پر بھی ترکی کی قوم پرست ادبی تحریک کا اثر نمایاں تھا۔ نِجف بِک وِزِیرلی اور عبدالرحیم بِک حق وِیردی برابر اور مسلسل تمثیلی روایات لکھتے رہے۔ اُدھر مَگُوما (Magoma) اور خانوادۂ حاجی بِک لِی کے افراد آذری تھیٹر کے لیے ایک ایکٹ کی مزاحیہ اور دیگر غنائی تمثیلیں (operettas and operas) تصنیف کرتے رہے اور اس طرح انھوں نے قومی موسیقی کی بنیاد قائم کر دی۔

مؤخّر ترین دَور یعنی آذربیجان کی آزاد جمہوریّت کے سقوط سے لے کر اب تک کی سرکردہ شخصیتیں یہ ہیں: جِلِیل مَمِت [محمد] قُلی زادِہ، آقْ ویردی، عبداللہ شائق، جعفر جَبّار لی اور نئی نسل کے لوگوں میں سے شعراے ذیل: سُلیمان رُسْتِم، صِمدوُرْگُن رفیع بِک لِی نِگار، میر وَرِی دِلْبَازِی۔

مآخذ: آذری ادب کی تاریخ کے اہم ترین مطالعات *IA* میں درج ہیں، بذیل مادّۂ Āzerī (از ایم-ایف-کو/پُرْوْلو)؛ ان کے علاوہ قابلِ ذکر تصانیف یہ ہیں: (۱) ب-چوبان زادِہ: آذری ادبیاتینیڭ یکٹی دِوْری، باکو ۱۹۳۰ء؛ (۲) ایم-علی ناظم: *Azerbaydjanskaya khudojestvennaya literatura, Trudi Azerbaydjanskovo filial'a*، ج ۳۰، باکو ۱۹۳۶ء؛ (۳) مختصر آذربیجان اِدبیّاتی تاریخی، باکو ۱۹۴۳ء؛ (۴) *Antologiya azerbay-djanskoy poezii*، مُوْسْکو ۱۹۳۹ء؛ (۵) B.Nikitin: *La littérature des Musulmans en U.S.S.R*، در *REI*، ۱۹۳۴ء، حصّہ (cahier) ۳؛ (۶) ایم-ای-رِسُول زادِہ؛ چَغْدَش آذربیجان اِدبیّاتی، انقرہ ۱۹۵۰ء؛ (۷) اے-وہاپ (Vahap) یُوْرت سِوِر: صابِرِڭ آذربَیجان اِدبیّاتِندہ کی یِرِی، انقرہ ۱۹۵۱ء [سب بحروفِ رومن]۔

(اے. جعفر اوغلو)

آذری: حمزہ بن علی ملک (یا عبدالملک) طوسی، بیہقی، برہان الدّین (در تقی کاشی مگر ''جلال الدّین'' در خزینۂ گنج الٰہی، ''نور الدّین'' در مجمع الفصحاء)، شیخ، صوفی شعرا کے مشاہیر میں سے تھے، عارفِ مجرّد و فاضلِ موحّد۔

ان کا والد سربدارانِ سبزوار میں سے تھا (سربداروں کے لیے دیکھیے حافظ ابرو: ''تاریخ امرای سربداریّہ و عاقبت ایشان''، در پنج رسالۂ تاریخی از مؤلّفاتِ حافظ ابرو، طبع فِلِکس تاوَر (Felix Tauer)، پرگ ۱۹۵۸ء) اور ان کا نسب معین صاحب الدعوۃ احمد بن محمد الزَّمَجِی الہاشمی المروزی (؟) تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد اسفرایین میں صاحبِ اقتدار و اختیار تھے۔ آذری کی ولادت آذر ماہ میں ۷۷۸ھ اور ۷۸۶ھ کے درمیان (باختلاف اقوال) اسفرایین یا مرو (ریو) میں ہوئی۔ ان کا ماموں امیر تیمور کا قصّہ خوان تھا؛ (دیکھیے دولت شاہ، ص ۳۶۳)۔ ۸۰۰ھ (۸۰۲ھ؟ قب یزدی، ۲: ۲۲۲) میں حمزہ کا لڑکپن کا زمانہ تھا؛ وہ بمقام قراباغ اپنے ماموں کے ہمراہ الغ بیگ میرزا کی خدمت میں پہنچا اور چند سال تک اس شہزادے کا مصاحب اور جلیس رہا۔ تقریباً نصف صدی کے بعد ۸۵۲ھ میں یہی شہزادہ اسفرایین میں پہنچا (قب مطلع سعدین، ۲/ ۳: ۹۴۸) اور آذری درویشوں کے لباس میں اُسے ملے تو میرزا نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ آذری نے علوم ظاہری و باطنی کے حاصل کرنے میں بہت محنت کی۔ جوانی میں شعر شاعری میں مشغول و مشہور ہوے اور ان کی رسائی سلطان شاہ رخ کے دربار میں ہوئی اور اُس کی اور دیگر اکابر کی مدح میں انھوں نے کئی پسندیدہ قصیدے لکھے۔ شاہ رخ نے انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیا یا دینا چاہا (دولت

شاہ و ریو؛ مگر مطلع سعدین، جلد دوم میں آذری کا ذکر کہیں نہیں ملا)۔ شیخ کی ولادت چونکہ آذر ماہ میں ہوئی تھی اس لیے وہ آذری تخلّص کرتے تھے۔ لطافتِ شعری کی وجہ سے انھوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ کہولت میں شیوۂ فقر و فنا اختیار کیا اور ریاضت و عبادت میں مشغول ہو گئے، پھر سیاحت کی، بہت سے اکابر و مشائخ سے ملے اور شیخ محی الدّین حسین رافعی طوسی کے مرید ہوے (شیخ رافعی امام غزالیؒ کی اولاد سے تھے اور علی رافعی، خلیفۂ سید علی ہمدانیؒ م ۷۸۶ھ کے مرید، جوانی میں قزوین میں واعظ تھے پھر تبریز میں رہے۔ شاعر بھی تھے، انھوں نے غزلیات مولانا ے روم کا جواب لکھا، ''محیی''، تخلّص تھا۔ ان کے حال اور نمونۂ کلام کے لیے دیکھیے تقی کاشی: خلاصۃ الاشعار، ج ۳)۔ آذری نے پانچ سال کتبِ حدیث و تفسیر ان سے پڑھیں اور جب وہ حج کو گئے تو ان کے ساتھ حج کیا۔ حج کے بعد رافعی حلب میں تعلیم و ارشاد میں مشغول رہے؛ تا آنکہ ۸۲۵ھ (بقولی ۸۳۰ھ) میں ان کا انتقال ہوا۔ آذری، ان کے اپنے بیان کے مطابق، ۸۳۰ھ میں شام سے واپس ہوے، (دیکھیے سطور آئندہ، بذیل جواہر الاسرار) اور اپنے پیر و مرشد کے اشارے کے مطابق سید نعمت اللہ ولی (م ۸۳۴ھ) کی خدمت میں پہنچے، جو علاوہ اَور کمالات کے مصنّف اور شاعر بھی تھے (تقی کاشی کا بیان ہے کہ ان کا دیوان پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے؛ یہ دیوان ۱۳۱۶ھ ش میں تہران میں (کسی مغشوش) نسخے سے چھپا بھی ہے۔ سید نعمت اللہ ماہان میں مدفون ہیں، جو اعمالِ کرمان سے ہے)۔ آذری نے مشغولِ مجاہدہ رہنے کے بعد ان سے اجازتِ ارشاد پائی اور خرقۂ تجرید و ترک پہنا اور دوبارہ حج کو پیادہ پا متوجّہ ہوے اور ایک سال (دولت شاہ؛ تقی کاشی: دو سال) بیت الحرام میں مجاور رہے اور وہیں کتاب سعی الصفا لکھی۔ حج سے واپسی پر وہ سیر کے لیے ہندوستان آئے اور دہلی سے دکن گئے اور سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵-۸۳۸ھ) کے دربار میں پہنچے۔ قصائد غرّاء کہے اور ملک الشعراء بنائے گئے۔ جب ۸۳۲ھ کے حدود میں حصارِ بیدر کے پاس سلطان نے احمد آباد بیدر آباد کیا تو آذری نے سلطان کی مدح اور شہر و عمارات کی تعریف میں قصائد کہے اور بہت انعام پایا (دیکھیے طبقاتِ اکبری، بربان مآثر، تاریخ فرشتہ، نیز دیکھیے ہفت اقلیم مگر قب دولت شاہ: مجالس النفائس، ص ۱۰ و آتش کدہ و ریاض العارفین)۔ بعد مدّت خراسان واپس گئے اور گوشہ نشین ہو کر لباس فقر اوصلحا اختیار کیا۔ سال ہاے دراز سجّادۂ اطاعت پر بیٹھے رہے، اکابر ان کی زیارت کو آئے؛ مثلاً سلطان محمد بن بایسنغر (۸۵۵ھ میں) عزیمتِ عراق کے وقت آیا؛ دیکھیے دولت شاہ، ص ۴۰۰۔

آذری کی تاریخ وفات ۸۶۶ھ/ ۱۴۶۲ء ہے (خواجہ اوحد مستوفی عہدِ سلطان حسین بایقرا نے ''خسرو'' سے تاریخ وفات نکالی۔ پورے قطعۂ تاریخ کے لیے دیکھیے دولت شاہ، ص ۴۰۵۔ یہی سال وفات طوطی ترشیزی کا ہے؛ مجالس النفائس)۔ ۸۲ سال (ریو، بقول امینِ رازی ۸۰ و بقول تقی کاشی ۸۸ سال) عمر پائی۔ قبر اسفرایین میں ہے۔ جس بقعے میں وہ دفن ہیں اس پر انھوں نے اسباب و املاک وقف کیے تھے۔ دولت شاہ کے زمانے میں (بحدود ۸۹۲ھ) وہاں درس و افادہ کی رونق اور فرش و روشنائی مرتّب تھی اور سلاطین و حکّام مجاوروں کی رعایت کرتے تھے اور تکالیف معاف تھیں (دولت شاہ، ص ۴۰۴) مگر تقی کاشی (بحدود ۹۹۳ھ) لکھتا ہے کہ وہاں ''آج کل کچھ ایسی رونق نہیں ہے''۔ ۱۳۱۱ھ/ ش کے قریب کے حالات کے لیے دیکھیے آتش کدہ، طبع حسن سادات ناصری، ۲: ۴۴۵، جس میں لکھا ہے کہ قبر کی چھت گر گئی ہے، اوقاف پر کوئی شخص قابض ہے، باغ میں صرف تیس چالیس درخت رہ گئے ہیں، گرمیوں میں ہر بدھ کی رات کو لوگ زیارت کو آتے اور گاتے بجاتے ہیں.

آذری اپنے دَور کے متصوّف شعرا میں سے ہیں۔ معانی خوب کو غزل، مثنوی، قصیدے، رباعی، معمّے کی شکل میں ترکی اور فارسی میں بیان کرتے ہیں (مجالس العُشّاق)۔ اوحد مستوفی نے انھیں ''مانند خسرو'' کہا (دولت شاہ، ص ۴۰۵) اس لیے کہ امیر خسرو اور حسن دہلوی کا تتبّع کرتے تھے۔ حقائق و معارف، معانی باریک، مضامین نازک لاتے تھے اور کلام میں سوز اور شور تھا۔ ان کی غزل میں حکیمانہ اور پند آمیز باتیں اور اخلاقی اشارات ملتے ہیں۔ اس دَور کے اَور شعرا کی طرح وحدتِ وجود کے مضامین ان کے ہاں بہت ہیں۔ ان کا ایک ترجیع بند، جو ۷۸ بیت (۱۳ بند) پر مشتمل ہے، گویا منظوم عرفانی رسالہ ہے (دیکھیے یار شاطر، ۱۶۸، ۱۷۲) مگر کلام میں بعض عیوب بھی ہیں؛ مثلاً گاہے بیان مضطرب یا مملّ یا سخیف ہے اور مضمون کم اور لفظ بہت ہیں اور عیوب لفظی و صوری بھی ہیں (مثالوں کے لیے دیکھیے یار شاطر، ص ۱۰۸ ببعد، ۱۴۱ ببعد، ۱۴۸، و حسن سادات ناصری، ۲: ۴۴۸ ببعد)۔ دولت شاہ (ص ۴۲۵) نے طالب جاجرمی کو ان کے شاگردوں میں شمار کیا ہے.

مصنّفات: دیوان کے علاوہ آذری نے نظم و نثر کے کئی رسالے لکھے:-

(۱) دیوان، جو قصائد (توحید، نعت، منقبت و مدحِ سلاطین)، غزلیات، مقطّعات وغیرہ پر مشتمل ہے، بقول تقی کاشی حقائق و معارف سے لبریز ہے۔ اُس کا اندازہ ہے کہ اس میں تقریباً تیس ہزار بیت ہیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ آذری کا دیوان اقالیم میں مشہور ہے (قب مجالس النفائس، ص ۱۰ و ۱۸۶)۔ فہرست پیٹرزبرگ (S. Petersburgh Catal)، ص ۳۹۹ و فہرست کوپن ہیگن (Copenhagen Catal.)، ص ۴۰ پر اس کا ذکر ہے (ریو)۔ دیوان کے نسخوں کے لیے دیکھیے یار شاطر، مقدّمہ، ص ۱۵ اور شپرنگر، ص ۳۱۵، کتاب خانۂ ملّی ملک (تہران) میں شمارہ ۵۹۳۸ پر بھی ایک نسخہ ہے۔ ہفت اقلیم میں چوالیس شعر کا ''جیفہ وجیپال'' والا قصیدہ دیا ہے، تقی کاشی نے بھی حسبِ عادت انتخاب اشعار دیا ہوگا مگر اتّفاق سے اس وقت خلاصۃ الاشعار کا یہ حصّہ موجود نہیں۔ دولت شاہ نے (ص ۴۰۰-۴۰۴) ان کے قصیدوں، غزل اور مقطّعات کے نمونے دیے ہیں۔ صاحب خزانۂ عامرہ نے دیوان سے

سینتالیس اشعار نقل کیے ہیں۔ اسی طرح اَور تذکروں میں بھی اشعار دیے ہیں، ان کی غزلیات کا ایک مرتّب انتخاب کتاب خانۂ بادلی اوکسفرڈ میں ہے؛ دیکھیے فہرست، شمارہ ۸۸۴۔ کتاب خانۂ ملک (تہران) میں بھی مجموعہ شمارہ ۵۳۰۷ میں ان کی بہت سی غزلیں ہیں (ناصری)۔

(۲) مرآت، صاحبِ خزانۂ عامرہ (ص ۲۴) کے پیشِ نظر یہ مثنوی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ مرآت میں چار کتابیں ہیں (نیز دیکھیے ایتے (Éthé): فہرست مخطوطاتِ فارسیہ در مکتبۂ دیوان ہند، عمود ۳۶۲، اس کتاب خانے میں مرآت کی صرف پہلی دو کتابیں ہیں۔ ان کا مواد فی الجملہ قزوین کی عجائب المخلوقات کے حصّۂ اوّل اور بعض اور کتابوں سے ماخوذ ہے۔ دیوانِ ہند ہی میں اس دوسری کتاب کے اور بھی دو نسخے ہیں۔ مرآت کی چار کتابوں کی تفصیل خزانۂ عامرہ میں یوں دی ہے:-

(ا) طامّۃ الکبریٰ (اس کتاب کے فصول کی فہرست ایتے، عمود ۳۶۷ میں دی ہے)؛

(ب) عجائب الدنیا (کذا، در کشف الظنون و مجالس النفائس و خلاصۃ الاشعار و مجمع الفصحاء) (ہدایت نے یہ کتاب خود دیکھی تھی)۔ فہرست پیٹرز برگ و فہرست کوپن ہیگن محلِّ مذکور میں اس کا نام غرائب الدنیا ہے۔ اسے عجائب الغرائب بھی کہتے ہیں (دیکھیے ریاض العارفین وسامی بک)۔ کتاب کے نام کے متعلّق بحث کے لیے دیکھیے حسن سادات ناصری: آتش کدہ، ۲:۴۴۶۔ رضا لائبریری رام پور (ہندوستان) میں عجائب المخلوقات کے نام سے اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہیں (فہرست، قلمی، شمارہ ۴۱۴۴ و ۴۱۴۵)۔ یہ کتاب من حیث المجموع قزوینی کی عجائب المخلوقات کے ''مقدّمہ'' اَور ''فی السَّفلِیّات'' [طبع وُسٹنفِلڈ، ص ۱۲ ببعد] کے مطابق ہے، گو اَور مآخذ بھی مصنّف کے سامنے ہیں۔ اس کتاب کے دو نسخے فہرست بادلی، شمارہ ۴۰۲، ۴۰۳ میں بھی موجود ہیں.

(ج) عجائب الاعلیٰ، قزوینی کی ''فی العُلوِیّات'' [طبع مذکور، ص ۱۳]، مقالۂ اوّل کے فی الجملہ مطابق ہے).

(د) سعی الصفا، اس میں مناسکِ حج کی کیفیت اور تاریخ کعبۂ معظّمہ دی ہے (دولت شاہ)۔ صاحبِ خزانۂ عامرہ نے مرآت سے آٹھ بیت نقل کیے ہیں.

(۳) بہمن نامہ، ''بہمن نامۂ منظوم شیخ آذری'' تاریخ فرشتہ کے مآخذ کی فہرست (۱:۶) میں شامل ہے۔ اسی تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ بہمن (۸۲۵ - ۸۳۸ھ) کے حکم سے آذری نے بہمنیوں کے حالات میں بہمن نامۂ دکنی نظم کرنا شروع کیا لیکن کتاب ابھی داستان احمد شاہ تک ہی پہنچی تھی کہ آذری خراسان واپس چلے گئے اور وہاں جب تک زندہ رہے فرصت میں تتمّۂ بہمن نامہ لکھتے رہے۔ جتنا لکھتے ہر چند سال بعد دارالخلافۂ دکن میں بھیج دیتے۔ غرض بقول فرشتہ بہمن نامہ داستان سلطان ہمایون شاہ بہمن (۸۶۲ - ۸۶۵ھ) تک آذری کی تصنیف ہے؛ اس کے بعد کا حصّہ دولتِ بہمنیّہ کے خاتمے یعنی ۱۹۳۴ء تک نظیری، سامعی وغیرہ نے نظم کر کے ملحق کیا، گو بعد میں بعض نے خطبۂ کتاب بدل کر پوری کتاب ہی اپنے نام کر لی (تاریخ فرشتہ، ۱:۶۲۷ ببعد) مگر اس بیان سے پہلے (دیکھیے تاریخ، ۱:۵۳۴) فرشتہ نے آذری کی طرف کتاب کے انتساب کو صرف افواہی بات قرار دے کر اُس پر شک کا اظہار کیا ہے؛ کچھ تو اس بنا پر کہ بہمنیوں کا نسب نامہ جو اس میں درج ہے وہ تحقیقی نہیں، کچھ اس بنا پر کہ شاعر کا تخلّص کتاب میں کہیں درج نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ کلام میں، جس کے اقتباسات فرشتہ نے دیے ہیں، استادانہ متانتِ سخن موجود نہیں ہے؛ اس کے باوجود بہمن نامے کے کچھ شعر حجّت کے طور پر فرشتہ نے کتاب میں دیے ہیں۔ اس سے فی الجملہ معلوم ہوا کہ شاہنامے کے وزن کے جو اشعار بہمنیوں کے حالات میں تاریخ فرشتہ میں دیے گئے ہیں ان میں سے اقلًّا کچھ بہمن نامہ کے ضرور ہیں فرشتہ نے ۱:۵۶۴ پر صراحۃً کہا ہے: ''ناظم بہمن نامہ می گوید'' اور یہی حال اسی قسم کے ان اشعار کا معلوم ہوتا ہے جو برہان مآثر میں دیے ہیں، گو اُس کتاب میں بہمن نامہ کا نام نہیں ملا (ان اشعار میں سے بعض دونوں کتابوں میں مشترک ہیں (مثلًا، ۱:۵۸۷، قب برہان مآثر، ص ۴۱ ببعد)۔ فرشتہ نے بعض اوقات (مثلًا ۱:۵۸۷، ۶۸۴ پر) بہمن نامہ سے واقعات کا بیان لے کر نثر میں بھی دیا ہے۔ بہمن نامہ کا کوئی نسخہ معلوم نہیں.

(۴) طغرای ہمایون، اس کے کوائف معلوم نہ ہوے۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون میں اس کا نام طغرای غرای ہمایون دیا ہے (ناصری).

(۵) جواہر الاسرار، ''مشتمل بر چندین علوم ہے'' (شیر خان لودی)؛ یہ مجموعۂ نوادر و امثال ہے اور مشکل ابیات کی شرح وغیر ذلک (دولت شاہ، ص ۴۰۴)۔ نسخۂ موزۂ برطانیہ (کتابت ذوالحجّہ ۱۰۳۴ھ) میں کتاب دیباچے اور چار باب پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں ۸۴۰ھ تاریخ دی ہے۔ چار باب یہ ہیں:

(ا) حروفِ مقطّعات کے اَسرار؛ (۲) بعض احادیثِ نبویؐ کے اسرار؛ (۳) اقوالِ مشائخ، منظوم و منثور؛ (۴) اقوال شعرا کے اسرار (ابواب کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے ایتے: فہرست مخطوطات فارسیہ در دیوان ہند، شمارہ ۲۰۳۶، نیز فہرست بادلی، شمارہ ۱۲۶۹)۔ دیباچے میں مصنّف نے لکھا ہے کہ ۸۳۰ھ میں شام سے واپس ہونے پر اس نے پہلے مفتاح الاسرار لکھی۔ احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ - ۸۳۸ھ) کے دارالحکومت میں قیام کے اثنا میں وہ دوسرے حجّ کے لیے تیار ہوا تو احباب نے نسخے طلب کیے۔ وطن واپس ہو کر اس نے کتاب کو پھر سے تالیف کیا۔ بیان کو موجز رکھا اور بعض مشائخ کے تراجم کا، جو اس نے سفر میں جمع کیے، اضافہ کیا (ریو، ص ۴۳)۔ کتاب رجب ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۷ء میں ختم ہوئی۔ باب ۳ سب سے مطوّل ہے، پھر باب ۴ و ۲؛ بابِ اوّل سب سے مختصر

ہے۔ دولت شاہ نے اس کتاب کے آٹھ حوالے دیے ہیں (دیکھیے فہرست الکتب)، خصوصاً دیکھیے ص ۷۹، ۲۳۹ (قبؔ مَے خانہ، طبع لاہور، ص ۶۲)، یہ سب حوالے جواہر الاسرار کے باب چہارم سے ہیں۔ آذر (آتش کدہ، ص ۸۵) کے نزدیک ابیات مشکلہ کی شرح ماہرانہ نہیں (''صنعتی ندارد'')۔ کشف الظنون میں کتاب کا صرف نام ہی آیا ہے، حاجی خلیفہ نے اسے دیکھا نہ تھا۔ البتہ صاحبِ مجمع الفصحاء نے اسے دیکھا تھا۔ شپرنگر ص ۳۱۶ پر بھی ایک نسخے کا حال دیا ہے۔ اس کتاب کا انتخاب طباعت سنگی سے ۱۳۰۳ھ میں تہران میں چھپا تھا (حسن سادات ناصری).

مآخذ: (دولت شاہ): تذکرۃ الشعراء، لائڈن ۱۳۱۸ھ، ص ۳۹۸ - ۴۱۲ و مواضعِ دیگر بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۲) علی شیر نوائی؛ مجالس النفائس، نشر علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۲۳ھ ش، بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۳) سلطان حسین بایقرا: مجالس العشّاق، طبع دوم، نول کشور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء، ص ۲۴۳ ببعد؛ (۴) خواند امیر: حبیب السّیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳/۳: ۱۷۳؛ (۵) تقی الدّین محمد کاشی: خلاصۃ الاشعار (تالیف ۹۹۶ھ)، نسخۂ خطّی در کتاب خانۂ کپورتھلہ، ورق ۳۰۶ و ۲۷۷ب و ملخّص ترجمۂ آذری در حواشیِ مَے خانہ، ص ۹؛ (۶) امین احمد رازی: ہفت اقلیم، نسخۂ خطی در کتاب خانۂ محمد شفیع لاہوری، بدون تاریخ (۱۲۴۶ھ کی ایک مہر)، ورق ۳۴۵ب؛ (۷) سید علی طباطبا: برہان مآثر، نشر سید ہاشمی فرید آبادی، حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء، ص ۷۱، ۷۳؛ (۸) خواجہ نظام الدّین احمد: طبقاتِ اکبری، کلکتہ ۱۹۳۵ء، ۳: ۲۴ ببعد؛ (۹) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ، بمبئی ۱۸۳۲ء، ۱: ۶۲۷ ببعد، ۵۳۴ وغیرہ (دیکھیے سطورِ بالا بذیلِ بہمن نامہ، ص ۵۲ ببعد)؛ (۱۰) عبدالنّبی فخر الزّمانی قزوینی: مَے خانہ، لاہور ۱۹۲۶ء، ص ۶۳ و حواشی؛ (۱۱) شیر خان لودی: مرآۃ الخیال، بمبئی ۱۳۲۴ھ، ص ۶۸؛ (۱۲) لطف علی بیگ آذر: آتش کدہ، بمبئی ۱۲۷۷ھ، ص ۸۴ ببعد؛ (۱۳) میر غلام علی آزاد: خزانۂ عامرہ، کان پور ۱۸۷۱ء، ص ۲۱؛ (۱۴) رضا قلی خان ہدایت: مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۹۵ھ، ۲: ۶؛ (۱۵) وہی مصنّف: ریاض العارفین، طبع دوم، تہران ۱۳۱۶ ش، ص ۶۱ ببعد؛ (۱۶) نوّاب صدّیق حسن خان: شمع انجمن، بھوپال ۱۲۹۳ھ، ص ۲۹؛ (۱۷) احسان یار شاطر: شعر فارسی در عہد شاہرخ، تہران ۱۳۳۴ ش، بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۱۸) Sprenger: *A Cat. of the Ar., per.,and Hind.MSS* etc، کلکتہ ۱۸۵۴ء، ص ۱۹، ۷۰، ۳۱۵؛ (۱۹) ریو (Rieu): فہرست مخطوطات فارسیہ در موزۂ برطانیہ، ص ۴۳، ۶۴۲؛ (۲۰) Beale: *Oriental Biographical Dictionary*، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۶۱، بذیلِ Azari(Shaikh) و ص ۳۸ (بذیلِ علی حمزہ)؛ (۲۱) سامی بک: قاموس الاعلام، ۱: ۶۸؛ (۲۲) حسن سادات ناصری: تعلیقہ در آتش کدۂ آذر، تہران ۱۳۳۷ - ۱۳۳۸ ش، ۲: ۴۴۳ - ۴۵۷ (و فہرست مآخذ، ص ۴۵۷).

(محمد شفیع)

آراراط (Ararat): رکؔ بہ جبل الحارث. *

آرال: قدرے کھاری پانی کی ایک بڑی جھیل، جو مغربی ترکستان میں واقع ہے ۴۶ درجے ۴۵ دقیقے سے ۴۳ درجے ۴۳ دقیقے تک عرض بلد شمالی اور ۷۶ سے ۷۹ درجے ۲۷ دقیقے تک طول بلد مشرقی۔ اس کی سطح کا رقبہ (۱۹۴۲ء) ۶۶,۴۵۸ مربّع کیلومیٹر ہے۔ اس رقبے میں ۲,۳۴۵ مربّع کیلومیٹر [۲۴,۴۰۰ مربع میل، وِٹکَر، ۱۹۷، ۶۱] کے جزیرے بھی شامل ہیں (ان میں بڑے بڑے جزیرے حسبِ ذیل ہیں: (۱) توقماق آطہ، جو آمو دریا [=جیحون] کے دہانے کے عین بالمقابل واقع ہے؛ (۲) اوستروف وُوْزْ رَوْژْ دِنِیْہ (Ostrov Vozroždeniya)، ''جزیرۂ حشر''، اس کا سابق نام جزیرۂ نِکْوْلَس (Nicholas) تھا۔ اس جزیرے کا پتا ۱۸۴۸ء میں چلا تھا۔ رقبہ ۲۱۶ مربّع کیلومیٹر؛ (۳) بارسَہ گیلمِزْ، بمعنی ''ورود بلا رجوع''، رقبہ ۱۳۳ مربّع کیلومیٹر اور (۴) کُگْ آرال، جو شمال میں جزیرہ نماے قرہ تُوْپ کے بالمقابل مشرق کی طرف واقع ہے، رقبہ ۲۷۳ مربّع کیلومیٹر۔ اس جھیل کی زیادہ سے زیادہ لمبائی، شمال مشرق سے جنوب مغرب تک، ۴۲۸ کیلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ عرض ۴۵ درجے عرض بلد شمالی پر ۲۸۴ کیلومیٹر ہے۔ اس کی اوسط گہرائی ۱۶ میٹر ہے۔ بیچ میں یہ گہرائی ۲۰ سے ۲۵ میٹر تک اور مغرب میں ۶۸ میٹر تک ہے۔ آج کل اس جھیل کے شمال مشرق اور جنوب میں بے شمار کھاڑیاں ہیں اور خاص کر جنوب مشرق میں ساحل کے پرے چٹانی جزیرے ہیں۔ صرف مغربی ساحل، جو میدان اوْست یورت (Üst Yart) سے ملحق ہے اور جس کے بعض حصّوں میں ۱۹۰ میٹر تک اونچی کھڑی چٹانیں ہیں، کھاڑیوں سے خالی ہے۔ مشرقی ساحل سپاٹ اور ریتلا ہے.

ازمنۂ قبل از تاریخ (عالم گیر طوفان اور دورۂ یخ میں جھیل آرال کی آبی سطح اس کی موجودہ سطح سے ۴ میٹر اونچی تھی۔ اس لیے جھیل کا پھیلاؤ (بالخصوص شمال مشرقی اور شمال مغربی کھاڑیوں میں) مقابلۃً بہت زیادہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ جھیل (اوْزبوی Özboy [قبؔ آمودریا] کی راہ سے) بحیرۂ خَزَر کے ساتھ اور اس کی وساطت سے اس زمانے میں سمندر کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ طبقات ارض کی موجودہ کیفیت پیدا ہو جانے کے بعد سے اس میں سے پانی کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں رہا (قبؔ بروک ہاؤس - اِیفرون (Brockhaus-Efron): *Êntsiklopedičeskiy Slovar*، طبع اوّل، (۲: ۱۰ - ۱۲): *Aralo-Kaspiyskaya nizmennost'* اور *Bol'shaya Sovetskaya Êntsi-klopediya*، طبع ثانی، ۲۰: ۳۲۶)۔ تاریخی زمانے میں بھی اس جھیل کے پانی کی سطح میں کئی کئی میٹر کا اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے اور اس لیے اس کے سواحل، خاص کر مشرق اور شمال مشرق میں، بدلتے رہے ہیں، لیکن زمانۂ حال میں نمایاں تبدیلیوں کے واقع ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ آمودریا کے دالیّہ (ڈیلٹا) کے کوائف جو المَقْدِسی (ص ۲۸۸) نے دیے ہیں: (مِزْدَاخْکان

سے کُرْ درتک دودن کی مسافت، پَرَاتگین (بَرَاتگین یا فَرَاتگین) تک ایک دن کی مسافت اور چار فرسخ، وہاں سے جھیل کے کنارے تک ایک دن کی مسافت) آج کل کے حالات اور ابن حَوقَل کے بیان (طبع [ثانی] کُرامَرز (Kramers)، ص ۵۱۲) سے پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ موضعِ دِہِ نَو (عربی: القریۃ الحدیثۃ، =ترکی: ینی (یکی) کِنْت (المسعودی کا نو کُرْدَہ؟)) بحیرۂ [آرال] کے ساحل سے دودن کی مسافت پر واقع ہے (دونوں بیانات دسویں صدی عیسوی کے ہیں؛ بارٹولڈ (Barthold): *Turkestan*، ص ۱۷۸)۔ دِہِ نَو وہی مقام ہے جس کے کھنڈر عصرِ حاضر میں جان کِنْت میں موجود ہیں۔ جو موجودہ قَزَ اِلنسک سے کوئی ۲۲ کیلومیٹر جنوب مغرب میں ہے (تصویر در S. A. Tolstov: *Auf den Spuren der alt-choresmischen Kultur*، برلن ۱۹۵۳ء، ص ۲۵۴؛ مزید تفصیلات اُسی کتاب میں ص ۲۶۶ پر ملیں گی)۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں پانی کی سطح پہلے نیچی اور پھر اونچی ہوئی: ۱۸۶۰ سے ۱۸۸۰ء تک پانی کی سطح نیچی ہوتی گئی، پھر سطح اونچی ہوتی گئی اور ۱۹۱۵ء تک دو میٹر اونچی ہوگئی، ۱۸۷۴ سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کی مدّت میں یہ سطح زیادہ سے زیادہ ۳ء۱ میٹر تک اوپر نیچے ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ سطحِ بحر سے اس کی سطح کی بلندی مختلف اوقات میں مختلف بتائی گئی ہے؛ مثلاً ۴۹ میٹر (بحساب اوسط، در *Bol'shaya Sovetskaya Entsiklopediya*، اور ۵۲ میٹر (در Leimbach) اور ۱۹۳۱ء میں اس کی انتہائی بلندی ۵۴ میٹر۔ بلندی کی اس تبدیلی کی وجہ سے اس بحیرے کی گہرائی کے اندازے بھی اسی کے مطابق بدلتے رہے ہیں۔ اس بحیرے میں نمک کی آمیزش (۳ء۱ سے ۸ء۱ فی صد تک) سمندر کے پانی کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ اس کا پانی کاملاً شاذّ ہی کبھی منجمد ہوتا ہے؛ عام طور پر شمال کی کھاڑیاں یا بحیرے کا سارا شمالی حصّہ (جزیرہ بارسہ گیلمز تک) جم کر ٹھوس ہو جاتا ہے۔ اس شمالی حصّے (تقریباً ۵,۵۰۰ مربّع کیلو میٹر) کا نام قَزَاخْوں (قازاقوں) نے کِچِک دِنگِز (بحیرۂ خورد) رکھا ہوا ہے؛ اسی طرح بڑے جنوبی حصّے کو اُلُو دِنگِز (بحیرۂ کلاں) کہتے ہیں۔

آمو دریا ([رک بآں] اس کی گزرگاہ کی ممکنہ تبدیلی کے متعلّق) اور سِیر دریا بحیرۂ آرال میں گرتے ہیں۔ سِیر دریا کے بارے میں العُمَری (۱۳۰۱ - ۱۳۴۹ء؛ تکملۂ براکلمان، ۲:۱۷۵] نے اپنی کتاب مسالک الابصار (منقول در تیزن ہاؤزن (W. von Tiesenhausen): *Materialy otnosyashčiesya k istorii Zolotoy Ordy*، ۱۸۸۴ء، ۱:۲۱۵؛ ترجمہ، ص ۲۳۷) میں بحوالۂ بدرالدّین الرومی تاجر لکھا ہے کہ اس دریا نے جَنْد کے نیچے تین منزل کی مسافت پر اپنا رخ بدل لیا ہے۔ حافظ ابرو (۱۴۲۴ - ۱۴۲۵ء)، جو بحیرۂ آرال کے وجود سے انکاری ہے، کہتا ہے کہ سیر دریا آمو دریا میں جا ملتا ہے۔ بالآخر ہندوستان کا فاتحِ اعظم بابُر (م ۱۵۳۰ء) اپنی کتاب بابُر نامہ میں لکھتا ہے کہ سِیر دریا مغرب کے ریگستانوں میں پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے، لیکن ان بیانات کو چنداں وقعت نہیں دینی چاہیے۔ ان بیانوں میں حافظ ابرو کے بیان کو محض داستان سرائی کہا جا سکتا ہے، العُمَری کے بیان سے کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکلتا؛ ابوالغازی کو بھی سِیر دریا کے بارے میں یہ بات بالکل معلوم نہیں کہ وہ ایک زمانے میں بحیرۂ آرال تک نہیں پہنچتا تھا۔ [قب نیز سِیر دریا].

یہ بات یقینی نہیں کہ قدما کو بحیرۂ آرال کا حال معلوم تھا۔ جو اطلاعات اوکیسانے لِمنے (Οξειανήλιμνη) پالُس اوکسیانا (palus Oxiana) [جیحونی دلدل] کی نسبت ملتی ہیں انھیں ہرمان (A. Hermann) بحیرۂ آرال کے متعلّق نہیں سمجھتا؛ اس کے برعکس وہ اَمِیانُس مارسِلِی نُس (Ammianus Marcellinus، ۲۳:۶، ۵۹ کے palus Oxia کو بحیرۂ آرال سمجھتا ہے (Pauly-Wissowa، ۱۸/۲، ۱۹۴۲ء: ۲۰۰۴ - ۲۰۰۵)۔ اسی طرح چینیوں کے عام بیانات اور بوزنطی سفیر زِمارْکُس (Zemarchos)، ۵۶۸ء (مِنَنْدَر پروٹیکٹر (Menander Protector): *Corp. Script. His. Byz.*، ۱۸:۲۳۸ ببعد؛ مُلّر (C. Müller): *Fragm.Hist.Graec.*، ۴:۲۲۹) کے 'لِمنے' کی تشریح یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی.

اسلامی زمانے میں ابن رُستہ (ص ۹۲) پہلا شخص ہے جس نے ایک بحیرے کا حال اس کا نام لیے بغیر لکھا ہے۔ اس نے اس کا محیط ۸۰ فرسخ بتایا ہے؛ الاِصْطَخْرِی (ص ۳۰۴) اسے ایک سو فرسخ بتاتا ہے۔ حدود العالم (ص ۵۳) میں اس کا محیط ۳۰۰ فرسخ لکھا ہے۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ ان سے قبل ابن خُرّدَاذْبِہ (ص ۱۷۳) نے بحیرۂ کُرْدِر (کُرْدَر کے بجائے کُرْدِر پڑھنے کے لیے قب احمد زکی ولیدی طوغان (A. Zeki Velidî Togan)، در *Türkiyat Mecmuasi*، (تورکیات مجموعہ سی)، ۲:۳۴۰) کا جو ذکر کیا ہے اسے بحیرۂ آرال پر منطبق کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس زمانے میں اُوغُوز (غُزّ) اور پیچنگ خانہ بدوش قبائل نے جھیل کے اردگرد ڈیرے ڈال رکھے تھے؛ صرف جنوبی ساحل (خوارِزْم) میں یہ خانہ بدوش نہیں تھے۔ الاِصْطَخْرِی حدود [العالم] اور بعد کے جغرافیہ دان بحیرۂ آرال کو بحیرۂ خوارزم کہتے ہیں اور بجا طور پر لکھتے ہیں کہ اس کا پانی شور ہے، اس کا کوئی مخرج نہیں اور گُرْگانْج (سابق اُرگانْج) سے پیچنگ کی طرف جائیں تو دائیں ہاتھ کو واقع ہے (گردیزی نے پیچنگ ہی لکھا ہے اور بارٹولڈ (W. Barthold) نے بھی، جس نے *Otčët o komandirovkě v Srednyuyu Aziyu*، ۱۸۹۷ء، ص ۹۵ میں اسے نقل کیا ہے)، لہٰذا ساری قِمْیش کے ساتھ اس کا کوئی تعلّق نہیں [دیکھیے آمو دریا]۔ اس کے برخلاف المسعودی (تنبیہ میں، ص ۶۵ پر: اور عام تر انداز میں مُرُوج، ۱:۲۱۱ میں بھی) لکھتا ہے کہ بحیرۂ جُرْجانیّہ بحیرۂ خَزَر سے ملا ہوا ہے۔ الجُرْجانی (م ۸۶۱ھ/ [۱۴۵۶ - ۱۴۵۷ء] جہان نامہ (تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھا گیا) کے تتبّع میں اسے بحیرۂ جَنْد کا نام دیتا ہے اور اسے اُس نام کے شہر سے منسوب کرتا ہے جو سِیر دریا کی زیریں گزرگاہ پر واقع ہے۔ ان سب کے بعد حافظ ابرو (۸۲۰ھ/

۱۴۱۷ء میں) دعوی کرتا ہے کہ یہ بحیرہ غائب ہو چکا ہے (اس طرح وہ اس بات کا نیا ثبوت فراہم کر دیتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمان جغرافیہ نویسوں کے منفرد بیانات کو آنکھیں بند کر کے صحیح تسلیم کر لینا درست نہیں).

تیرھویں اور سولھویں صدی عیسوی تک کے عرصے میں بحیرۂ آرال کے متعلّق کوئی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی۔ سب سے پہلے ابوالغازی بہادر خان نے شجرۃ الاتراک (طبع Desmaisons)، ص ۳۳۸ میں آرال (''جزیرہ'') کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں آمودریا بحیرے میں جا گرتا ہے۔ یہ جزیرہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایک منفرد ریاست تھا اور اس کا صدر مقام قُنغرات تھا اور وہ محمد رحیم خان کے عہد (۱۸۰۶-۱۸۲۶ء) تک دوبارہ خِیوَہ کی سلطنت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس ''جزیرے'' کے نام پر آگے چل کر قازاقوں کے درمیان اس جھیل کا نام آرال دِنگزی (بحیرۂ آرال) پڑ گیا۔ اس کے تتبّع میں روسی اسے Aral'skoe More یعنی ''بحیرۂ آرال'' کہنے لگے (یہ نام سب سے پہلے ۱۶۹۷ء میں استعمال ہوا)۔ اس سے پہلے روسی زبان کی کتاب Kniga bol'shogo čerteža میں (جو ۱۶۲۶ء میں تمام ہوئی) اسے Sinee More یعنی بحیرۂ ازرق ''Blue Sea'' کا نام دیا گیا ہے۔ فی الواقع اس جھیل کا پانی ازرق یعنی گہرا نیلا ہے۔ یہی نام ولندیزی نقشہ در Witsen: *Noord-en Oost-Tartarye*، طبع اوّل، ۱۶۸۷ء، میں بھی آیا ہے اور *J. N. de l'Isle*، مطبوعۂ ۱۷۲۳ء میں اس زمانے کا مروّج نام لکھا ہے (بارٹولڈ Barthold: *Aral*، ص ۷۷ ببعد).

روسیوں نے ۱۸۴۷ء میں پہلے پہل سیرِ دریا کے زیریں حصّے کے دائیں کنارے پر، اس کے دہانے سے ۶۰-۶۵ کیلومیٹر ورے، قلعۂ Raïmskoe (یہ نام غالباً ''رحیم'' سے ماخوذ ہے) تعمیر کیا۔ اس سے قبل، ۱۸۱۹ء سے شروع کر کے، اس بحیرے کے حالات کی زیادہ مفصّل تحقیق و تفتیش کے لیے متعدّد مہمّیں روانہ ہوئیں اور اس کے متعلّق کوائف مہیا کر چکی تھیں۔ (۱۸۱۹ء میں N. N. Murav'ëv.؛ ۱۸۲۰-۱۸۲۱ء میں A. F. Negri اور A. K. Baron؛ ۱۸۲۵-۱۸۲۶ء میں F. W. R. Berg؛ ۱۸۳۳-۱۸۳۵ء میں G. von Helmersen؛ ۱۸۳۹ء میں V. A. Count Perovskiy؛ ۱۸۴۰ء میں M. M. Žemčužnikov؛ ۱۸۴۰-۱۸۴۱ء میں I. P. Blaramberg اور D. I. Romanov؛ ۱۸۴۱ء میں Antov؛ ۱۸۴۲-۱۸۴۳ء میں Danilevskiy؛ ۱۸۴۳ء میں Schulz اور Lemm اور پھر ۱۸۴۸ء میں A. I. Butakov اور A. I. Maksheyev)۔ ۱۸۵۳ اور ۱۸۸۳ء کے درمیان بحیرۂ آرال میں ایک روسی بیڑا رکھا گیا تھا، جس کا مستقرّ پہلے آرالسک (Aral'sk) میں تھا اور پھر کزالِنسک (Kazalinsk) میں بنا (جو زیریں سیرِ دریا پر واقع ہے)۔ ۱۸۷۳ء میں جب خانِ خِیوہ کی مملکت فتح کر لی گئی اور یہ بحیرہ روسی سلطنت کا ایک اندرونی بحیرہ بن گیا تو بیڑا توڑ دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء سے اس بحیرے تک اورِن برگ-تاشقند ریلوے لائن کے ذریعے پہنچا جاتا ہے جو آرالسک کے قریب اس بحیرے کے شمال مشرقی کونے کے پاس سے گزرتی ہے۔ ریل نہ ہو تو اس جھیل کا محلِّ وقوع آمد و رفت کے نقطۂ نظر سے آج کل بھی تکلیف دہ ہے۔ ۱۹۱۸-۱۹۲۱ء کی خانہ جنگی میں بحیرۂ آرال میں پھر جنگی بیڑا رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۶ء میں جو نئی علاقہ بندی ہوئی اس کی رُو سے بحیرے کا جنوبی حصّہ قارا قالپاقوں کی استقلالیّہ جمہوریت میں شامل کر دیا گیا، جو جمہوریت شوروی ازبکستان کی ایک رکن ہے؛ وہ شوروی جمہوریت بجائے خود قازاقستان کا شمالی حصّہ ہے۔ یہ بحیرہ اپنی نواحی آبادیوں کے لیے اور بحیثیت مجموعی اتّحاد جماہیر شوروی (U.S.S.R) کے لیے ماہی گیری کے باعث اہمیّت رکھتا ہے.

مآخذ: (۱) Brockhaus-Efron: *Entsiklopedičeskiy Slovar*، طبع اوّل، ۱۲:۲-۱۴؛ (۲) *Bol'shaya Sovetskaya Entsiklopediya*، طبع ثانی، ۲:۶۰۹-۶۱۱ (اس میں رنگین نقشے بھی ہیں)؛ (۳) A. I. Maksheyev: *Opisanie Aral'skago Morya*، ۱۸۵۱ء؛ در *Zap. Russk. Geogr. Ob-va*، ۱۸۵۱ء؛ (۴) W. Leimbach: *Die Sowjetunion*، شُٹُٹ گارٹ ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۰-۱۲۲ (مع نقشہ)، ص ۲۸۵ ببعد، نیز اتّحادِ جماہیر شورویّہ (U.S.S.R) کے آبی راستوں کے متعلّق عمومی کتابیں جو اس کتاب میں مذکور ہیں، ص ۴۹۵، شمارہ ۱۲۳-۱۲۵؛ (۵) T. Shabad: *Geography of the USSR*، نیو یارک ۱۹۵۱ء، بہ امدادِ اشاریّہ؛ (۶) W. Barthold: *Nachrichten über den Aral-See* etc.، لائپزگ ۱۹۱۰ء؛ (۷) وہی مصنّف: در انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، طبع اوّل، بذیل مادّہ؛ (۸) وہی مصنّف: *Turkestan*، اشاریہ؛ (۹) R. Roesler: *Die Aralsee-Frage*، در *SBAK. Wien*، ۱۸۷۳ء، ص ۱۷۳-۲۶۰؛ (۱۰) L. S. Berg: *Aral'skoe More*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۸ء اور بطور عمومی *The Naučnye rezul'taty Arals'koy Ekspeditsii*، VYP، ۱-۱۴، تاشقند ۱۹۰۲-۱۹۱۵ء *Izvěstiya Turkestansago = otděla Imp. Russk. Geogr.*) *Der Ara-lsee und sein Gebiet, Petersmanns Mitteilungen*، [ج ۵۵] ۱۹۰۹ء: ص ۸۲-۸۶؛ (۱۲) وہی مصنّف (Woeikof): *Le Tukestan russe*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۱۳) I. V. Mushketov: *Turkestan*، ۱۸۸۶-۱۹۰۶ء؛ [(۱۴) سکائلر (Eugene Schuyler): *Turkistan*، طبع پنجم، دو جلد، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۱۵) ترکستان، ترجمۂ سیّد رضا علی زادہ (نشریات شیر محمد پسر محمد گل خان افغان)، لاہور ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۰ ببعد]؛ قب نیز مآخذِ مادّۂ ''آمو دریا''، ''خوارِزم''، ''خِیوہ''، ''سیرِ دریا''.

(B. Spuler شپُولَر)

---

* **آرپالیق:** رک بہ اَرپالیق.

---

* **آرپہ:** رک بہ اَرپا.

---

* **آرتوین:** [اَرتوِین] ترکیہ کے شمال مشرقِ بعید کا ایک شہر، جو ۴۱ درجے ۱۰ دقیقے شمال اور ۴۱ درجے ۵۰ دقیقے مشرق کی جانب دریاے چورُوک (Çoruk) [ایلن، نقشہ: Chorakhi] [کے بائیں کنارے] پر واقع ہے۔ یہ شہر اور اس کے ساتھ قَرْص اور اَرْدَھان ۱۸۷۸ء میں سان سٹیفانو کے معاہدے کی رُو سے روس کے حوالے کر دیے گئے تھے مگر ۲۳ فروری ۱۹۲۱ء کو جارجیا نے انھیں واپس کر دیا۔ اس وقت سے یہ قضا چورُوک کا مرکز اور چورُوک کی ولایت کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۴۵ء میں خود شہر کی آبادی ۳,۹۸۰ تھی اور ساری ''قضا'' کی ۱۶,۹۶۶.

[**مآخذ:** (۱) سامی: قاموس الاعلام، ۱: ۹۳؛ (۲) W. E. D. Allen: *A History of the Georgian People*، لنڈن ۱۹۳۲ء، بامداد اشاریہ و نقشہ].

(FR. TAESCHNER)

---

* **آرٹ:** رک بہ فن، نیز دیکھیے سارے ملکوں، شہروں اور خانوادوں پر مقالے، نیز مادّہ ہاے اَرَبِسک، بنا، تجلید، تذہیب، تکفیت، رسم، عاج، فنِ تعمیر، قالی، کوزہ گری، نسخ، نقاشی وغیرہ.

---

* **آرجیش:** [اَرجیش] ایک چھوٹا سا قدیم شہر، جو بحیرۂ وان کے شمال مشرقی کنارے پر واقع ہے اور جس کے نام پر ازمنۂ وسطیٰ تک یہ جھیل بحیرۂ آرجیش ہی کہلاتی رہی تھی۔ اس شہر کا وجود دَورِ اُراَرطائی (Urartaean) سے اِدھر تک تو تصدیق شدہ معلوم ہوتا ہے [اُراَرطُو یا آراراط کے لیے دیکھیے *The Jewish Encyclop.*، ۱۹۰۲ء، ۲: ۷۳ ببعد وایلن (Allen)، اشاریہ]۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر یونانی، رومی جغرافیہ نویسوں نے کیا ہے۔ عربوں نے اس شہر پر [حضرت] عثمانؓ کے عہد میں کچھ عرصے کے لیے قبضہ کر لیا تھا، لیکن یہ آٹھویں صدی عیسوی تک ارمنی امارتوں کا جزو لاینفک بنا رہا؛ ۷۷۲ء کے بعد اسے اَخْلاط [رک بآں] کی قیسی امارت میں شامل کر لیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی میں وہ مروانیوں کے قبضے میں رہا مگر ۱۰۲۵ء کے قریب اس پر بوزنطیوں نے قبضہ کر لیا، جنھوں نے آگے چل کر جنوبی اَرمینیہ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۰۵۴ء میں سلجوقی سلطان طُغْرِل بیگ [رک بآں] نے اس شہر کو دوبارہ فتح کر لیا۔ جب پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھرا تو اس شہر کو اَخْلاط کے شاہانِ اَرمینیہ نے اپنی ریاست کا جزو بنا لیا۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں یہ اخلاط کے شاہانِ مذکور کے ایوّبی جانشینوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں گُرجیوں اور منگولوں نے متعدّد بار اس شہر کو تاراج کیا، تاہم یہ اتنا اہم شہر تھا کہ اِیل خانی وزیر تاج الدّین علی شاہ تبریزی نے آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کے استحکاماتِ تعمیر کیے (معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس شہر میں جنگی استحکامات تعمیر نہ ہوے تھے)۔ اِس کے بعد اِس شہر کو تیمور کی مہمّوں کی وجہ سے اور پھر اُس بدامنی اور اختلال کے باعث جو ایرانیوں اور عثمانیوں کی جنگوں سے پیدا ہوا تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ سترھویں صدی عیسوی تک بھی یہ شہر مملکتِ عثمانیہ کے ایک ضلع کا صدر مقام بنا رہا، لیکن شہر وان کی ترقی اور بحیرۂ وان کے پانی کا بہاؤ شمال مغرب کی جانب ہو جانے کے باعث اسے نقصان پہنچا۔

اس شہر کے آخری باشندے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ آج اس کے آثار زیادہ تر پانی کے نیچے آ گئے ہیں۔ اس جگہ سے نصف گھنٹے کی مسافت پر ایک چھوٹا سا جدید شہر آباد ہو گیا ہے۔

مآخذ: [(۱) دیکھیے مادّۂ اَرمینیہ و اَخْلاط؛ (۲) عربی مآخذ (البلاذری، ابن الاَزْرق الفارِقی جن کی بنا پر اَمِدْروز (Amedroz) نے *JRAS*، ۱۹۰۲ء، ص ۷۸۵ - ۸۱۲ میں اپنا مقالہ شائع کیا اور ابن الاثیر وغیرہ) کی فہرست میں ذیل کے مآخذ بھی شامل کرنا چاہییں: وہ ارمنی مآخذ جنھیں (۳) R. Grousset: *Histoire d' Arménie*، پیرس ۱۹۴۸ء؛ اور (۴) F. Nève: *Histoire des Guerres de Tamerlan d' après Thomas de Medzoph*، برسلز ۱۸۶۰ء نے استعمال کیا ہے؛ فارسی مآخذ میں (۵) حمداللہ مستوفی: نزھۃ؛ اور ترکی مآخذ میں (۶) حاجی خلیفہ: جِہان نُما و (۷) سفر نامۂ اِوْلیاء چلبی ج ۴، کا اضافہ ہونا چاہیے، نیز قب (۸) M.Canard: *Les Hamdânides*، ۱: ۱۸۸، ۴۷۳ ببعد، نیز دیکھیے (۹) E. Honigmann: *Die Ostgrenze des byzantinischen Reiches*، برسلز ۱۹۳۵ء؛ [(۱۰) ایلن (Allen): *History of the Georgian People*، لنڈن ۱۹۳۲ء، اشاریہ]؛ (۱۱) Besim Darkot کا مقالہ "Erciş"، در *IA* (دائرۂ معارف، ترکی)، جس میں عصرِ حاضر کی قدیم ترکتابوں کے حوالے بھی موجود ہیں (یعنی ہیوبُش مان (Hübschmann) اور مارکار (Markwart) کے)].

(CL. CAHEN کاہن)

---

* **آرجیش طاغ:** (اِرجیاس، اَرجیش طاغ) جو قدیم زمانے میں اَرجائش (Argaeus) کہلاتا تھا۔ کَپّاڈُوصِیا Cappadocia [قَبَاذَق؛ حدود العالم، ص ۱۵۶] میں ہالیس (Halys) [قزیل ارماق] کے جنوب کی جانب کی بہت سی برکانی چوٹیوں میں سے سب سے زیادہ اہمّ چوٹی ہے۔ ۱۱,۴۸۰ فٹ بلند ہونے کی وجہ سے یہ ایشیاے کوچک کا بلند ترین مرتفع مقام مانا

جاتا ہے۔ آرجیش طاغ قیساریہ [قیصریہ] سے کوئی ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اُس کم رنگ برکانی اصل کی کھردری چٹانوں والے (trachytic) علاقے کے تقریباً وسط میں ہے جو غربِ جنوب مغرب سے شرقِ شمال مشرق تک ایک غیر منظم بیضوی شکل میں پھیلا ہوا ہے اور جس کا رقبہ تقریباً ۷۶۰ مربّع میل ہے۔ پہاڑیوں کے اس گتھّے ہوے سلسلے میں خصوصیّت کے ساتھ بہت سے آب کند ہیں، جو اس سلسلے کو مختلف سمتوں سے قطع کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں سب سے بڑا پہاڑ خوبصورت مخروطی شکل کا ہے: اس کی چوٹی اوپر جا کر تین نوکدار چوٹیوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور ہر چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے، اسی لیے اس کا نام ''کوہ سفید'' پڑ گیا ہے (یونانی: Ἀργαῖον ὄρος، جو ἀργής سے مشتق ہے، بمعنی سفید، چمکدار) اس بڑے پہاڑ کے اردگرد بہت سی چھوٹی چھوٹی مخروطی چوٹیاں اور برکانی تشکیلات ہیں۔ شمال مشرق میں تین چوٹیوں والا علی طاغ ہے، جس کی بلندی چوٹیوں سمیت ۶,۵۰۰ فٹ ہے۔ اس پہاڑی کے شمال مشرقی دامن میں شہر Talas [تالش؟] واقع ہے۔ آرجیش طاغ تاریخی زمانے تک آتش فشانی کرتا رہا ہے، اگرچہ یہ آتش فشانی محدود حد تک ہی ہوتی تھی۔ یہ قدیم زمانے ہی میں خاموش ہو چکا تھا، لیکن اس کی پہلی آتش فشانیوں کے آثار اس پہاڑ کے ڈھلواں پہلووں پر عظیم انباروں کی شکل میں صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے مشرقی جغرافیہ دانوں میں سے فقط ایک جغرافیہ نویس، ایرانی الاصل المُسْتَوفِی ہے (اُس کا زمانۂ تصنیف تقریباً ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء تھا)، جس نے اس پہاڑ کا ذکر ''اَرجائِش'' کے نام سے کیا ہے [مطبوعہ فارسی متن میں: 'ارجیش' ہے]۔ موجودہ زمانے میں ہِمِلْٹَن (W.Hamilton) پہلا شخص ہے جو ۱۸۳۷ء میں آرْجِیش طاغ پر چڑھا۔ اس کے بعد P. V. Tschithatcheff نے ۱۸۴۹ء میں ہملٹن کی پیروی کی، پھر چالیس سال بعد تُوزَر (H. F. Tozer) اس کے اوپر پہنچا اور غالباً اس سارے پہاڑ کے متعلّق سب سے زیادہ مستند حالات اُسی نے بہم پہنچائے ہیں اور اُسی نے اس کا مفصّل حال قلمبند کیا ہے۔

مآخذ: [(۱) W. Hamilton: *Researches in Asia minor*، ۲:۲۷۵ ببعد؛ (۲) V. Moltke: *Briefe über Zustände u. Begebenheiten ind er Türkei aus den Jahren 1835-1839*، (طبع چہارم، برلن ۱۸۸۲ء)، ص ۳۱۲ ببعد؛ (۳) P. V. Tschithatcheff: در *Petermann's Geogr. Mitteil.*، ضمیمہ (supplement)، ۲۰ (۱۸۴۷ء): ۳۸؛ اور (۴) وُہی مصنّف: *Asie Mineure*، (پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۹ء) اور *Kleinasien*، (لائپزگ ۱۸۸۷ء)، ص ۱۵۱ ببعد؛ (۵) H. F. Tozer: *Turkish Armenia and eastern Asia Minor*، (لنڈن ۱۸۹۱ء)، باب ۵؛ (۶) Hirschfeld: در Pauly-Wissowa: *Realencykl. der klass. Altertums wissensch.*، ۲:۶۸۴؛ (۷) R. Oberhummer and H. Zimmerer: *Durch Syrien und Kleinasien*، (میونخ Munich ۱۸۹۶ء)، ص ۲۴۲، ۳۳۲ ببعد؛ (۸) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، (کیمبرج ۱۹۰۵ء)، ص ۱۴۶؛ [(۹)] قاموس الاعلام، ۲:۸۲۴].

(شْٹْرِیک STRECK)

آرْزَاوْ: (بربری: اَرْزِیُوْ؛ املاے جدید Arzew یا Arzeu ہے) ✱ الجزائر کا ایک ساحلی شہر، جو وَہْران اور مُسْتَغانِم کے درمیان ایک چھوٹے سے قصبے اَرْزِیُو سے ۷ کیلومیٹر مشرق کی طرف واقع ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کا اسلامی شہر بلاشُبہہ ''میدانِ سِیْرات کے ساحل'' پر قدیم پُوْرْٹَس مَیْگْنَس (Portus Magnus) (= ''بندرِ بزرگ'') کے مقام پر واقع تھا۔ پُوْرْٹَس مَیْگْنَس اِس زمانے کا سانْت لیو (Saint Leu) ہے، جسے آج تک Vieil Arzeu [''کہنہ آرْزِیُو''] کہتے ہیں)۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں البَکْرِی نے رومی شہر اور اس کے آثار کا ذکر استحسان کے ساتھ کیا ہے مگر کہا ہے کہ اب یہ شہر بالکل غیر آباد پڑا ہے، البکری نے قریب کے پہاڑ پر (یعنی اُس پر جو موجودہ آرْزِیو پر مُشْرِف ہے) تین قلعوں کی موجودگی کا ذکر ضرور کیا ہے، جو 'رِباط' کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہ بات اس لحاظ سے زیادہ ہی قابلِ ذکر ہے کہ بلادِ بربر کے شمالی ساحل پر قلعہ بند خانقاہیں شاذ و نادر ہی بنائی گئی تھیں، اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آرزاوْ کا علاقہ فوجی اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اسی ساحل کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی بحری فعّالیّت کے اعمال بربروں کے بجاے اندلسی مہاجر ہی سرانجام دے رہے ہوں گے۔ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں آرزاوْ نے عبدالمؤمن الموحّدی کے لیے جہاز مہیّا کیے، جن کے ذریعے اس نے اِفْرِیْقِیّہ کی سرزمین فتح کی۔ اسی زمانے میں اَلاِدْریسی نے اس شہر کی اقتصادی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہ بڑا گاؤں ہے، جہاں گرد و نواح کے دیہات سے گیہوں فروخت کے لیے لایا جاتا ہے۔ تاجر اس گیہوں کو بڑے شوق سے خریدتے ہیں اور اس کی برآمد بے شمار ملکوں کو کرتے ہیں''۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں لیوافریقی (Leo Africanus [الحسن الوزّان الزّیّاتی]) نے اس ساحل کے چھوٹے بڑے شہروں کی جو فہرست تیار کی اس میں آرزاوْ کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

کسی نامعلوم دَور میں—اغلب ہے کہ یہ نسبۃً قریب ہی کے زمانے کی بات ہے (اٹھارھویں صدی عیسوی؟)—اس علاقے میں ایک اہمّ بربری قبیلہ بُوطِّیُوہ (Bottīwa) مرّاکُشی رِیف سے آ کر آباد ہو گیا تھا۔ آج سے چالیس سال پہلے تک اس قبیلے میں ان کی اصلی بولی رائج تھی۔

مآخذ: (۱) البکری: عربی متن، الجزائر ۱۹۱۱ء، ص ۷۰؛ فرانسیسی ترجمہ از دیسلان (de Slane)، الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۱۴۳؛ (۲) الاِدْریسی، طبع ڈوزی (Dozy) و ڈِخْوَیَہ (de Goeje)، ص ۱۰۰، ترجمہ، ص ۱۱۷؛ (۳) Gsell: *Atlas*

Notice sur les archéologique، مستغانم کا نقشہ، ۵، ۶؛ (۴) Biarnay: *Bettioua du Vieil Arzeu*، در *R. Afr.*، ۱۹۱۰-۱۹۱۱ء، ص ۱۰۱ بعد؛ (۵) R. Basset: *Loqmân berbère*، پیرس ۱۸۹۰ء، ص ۹، ۱۳؛ (۶) وہی مصنّف: *Dial. berb. du Rif*، ۱۸۹۷ء، ص ۱۶۸-۱۷۱.

(مارسے G. MARÇAIS)

⊗ **آرزو:** (سراج الدّین علی خان آرزو، المشہور بہ خانِ آرزو) ہندوستان کے اسلامی دور کے محقّق، ماہرِ منقول و معقول اور شاعر (فارسی)، ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۷-۱۶۸۸ء میں پیدا ہوے (سروِ آزاد، در "منتہائے مائۃ حادیۃ عشر (۱۱۰۰ھ)"؛ عَقدِ ثریا ۱۱۰۱ھ، لیکن سفینۂ خوشگو میں آرزو کا اپنا بیان ہے کہ 'نزل غیب' = ۱۰۹۹ھ سے تاریخِ تولّد نکلتی ہے)۔ ان کا سب سے اہمّ کارنامہ یہ ہے کہ فارسی شاعری کا رُخ تمثیل گوئی سے موڑ کر تازہ گوئی کی طرف کر دیا اور یہ انقلاب اُردو شاعری میں بھی ایہام گوئی کی جگہ تازہ گوئی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ بقولِ صاحبِ مجموعۂ نغز (۱: ۲۴) اگر "شعراے ہندی زبان" کو ان کے عیال کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ریختہ گو شاعروں میں (خواجہ میر درد: تذکرۂ شعراے ہند)، میر محمد تقی میر، میرزا محمد رفیع سودا، میاں آبرو، مضمون اور یک رنگ نے اُن سے فیض پایا۔ فارسی کے علاوہ کبھی کبھی اُردو کے شعر بھی کہتے تھے۔ تذکروں میں اشعار موجود ہیں۔ فارسی کے علاوہ اُردو زبان کی لسانی تحقیق کے قواعد بھی وضع کیے۔ ان کا دوسرا اہمّ کارنامہ توافقِ لسانَین کی دریافت ہے۔ فارسی اور سنسکرت کے توافق کا راز انھوں نے سب سے پہلے دریافت کیا (تفصیل کے لیے دیکھیے نوادر الالفاظ، دیباچہ از سید عبداللہ، ص ۲۵)۔

خانِ آرزو نے شاعری کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ ان کے والد شیخ حُسام الدّین سپاہی پیشہ اور عالمگیری منصب داروں میں شامل تھے؛ حُسام یا حُسامی تخلّص کیا کرتے تھے (نمونۂ کلام مردُمِ دیدہ، ص ۵۵ میں دیا ہے، نیز مجمع النفائس میں)۔ مُصحفی کے بیان کے مطابق بزرگوں کا اصلی وطن صوبۂ اودھ تھا۔ شجرۂ نسب والد کی طرف سے شیخ کمال الدّین ہمشیرزادۂ شیخ نصیر الدّین مشتہر بہ چراغِ دہلی تک جاتا ہے۔ والدہ کی طرف سے شیخ حمیدالدّین عرف محمد غوث گوالیاری تک، جو خواجہ فریدالدّین عطّار نیشاپوری کی اولاد سے تھے، پہنچتا ہے (مجمع النفائس؛ مردم دیدہ، ص ۵۴؛ عَقدِ ثریا، ص ۷؛ سروِ آزاد، ص ۲۲۷)۔

آرزو اکبرآباد میں پیدا ہوے (منوہر سہاے کا تحقیقی مقالہ، ص ۶۲)۔ کبھی گوالیاری نسبت بھی اختیار کرتے تھے، گوالیار میں ان کی والدہ شیخ حُسامی کے انتقال کے بعد مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئی تھیں۔ آرزو کا ابتدائی قیام کبھی گوالیار میں کبھی اکبرآباد میں رہا۔ والد کا انتقال ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء میں ہوا۔ چودہ برس کی عمر (حدودِ ۱۱۱۲ھ) تک تحصیلِ علم میں مشغول رہے، پھر شعر گوئی کی طرف توجہ کی اور میر عبدالصمد 'سخن' (م ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۹ء) سے ایک دو ماہ استفادہ کیا، کچھ عرصہ میر غلام علی 'احسنی' گوالیاری (حالات کے لیے دیکھیے پچھی نرائن شفیق: گل رعنا، اور مجمع النفائس) کے سایۂ تربیّت میں رہے۔ سولہ برس کی عمر (۱۱۱۵ھ) میں انھیں پہلی فارسی غزل دکھائی۔ سترہ یا اٹھارہ برس کے ہوے تو فوج میں ملازمت کر لی اور اورنگ زیبی افواج کے ساتھ دکن کا رخ کیا لیکن ۹ ماہ بعد گوالیار کی طرف لوٹے، کیونکہ عالمگیر کا انتقال (۱۱۱۸ھ) میں ہو گیا اور شہزادۂ محمد اعظم کی فوج دکن سے لوٹ آئی۔ تخت نشینی کی جنگ کے خاتمے پر بہادر شاہ تخت نشین ہوے۔ اس اثنا میں آرزو گوالیار سے اکبرآباد آ چکے تھے۔ یہاں انھوں نے مزید پانچ برس قیام کیا اور کسبِ علم کرتے اور کتبِ متداولہ پڑھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے استاد مولانا عماد الدّین المشتہر بہ درویش محمد تھے۔ چوبیس برس کی عمر میں علوم کی تکمیل کر لی۔ (سرو آزاد، ۲۲۷) اور گوالیار چلے آئے۔ معزّالدّین جہاندار شاہ کے عہدِ حکومت کی ابتدا میں گوالیار سے اکبرآباد اٹھ آئے۔ فرخ سیر اور جہاندار شاہ کی جنگ کے بعد فرخ سیر کامیاب ہو گیا۔ اُس کی سلطنت کے ابتدائی زمانے میں نوکری کی تقریب سے آرزو دہلی آئے اور فرخ سیر کے قتل ہونے پر نوکری سے معزول ہوے اور چند روز بے کار رہ کر اکبرآباد پہنچے، گوالیار کی اخبار نویسی کی خدمت پر مامور ہو کر گوالیار گئے اور سال بھر وہاں رہے۔ ساداتِ بارہہ کے زوال پر نوکری جاتی رہی۔ محمد شاہ کے داخلۂ دہلی پر آرزو بھی دہلی آئے اور ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹-۱۷۲۰ء میں دہلی کی مستقل رہائش اختیار کی اور تقریباً چھتیس برس وہاں ٹھیرے رہے۔ مجمع النفائس میں (بذیلِ مخلص) لکھتے ہیں کہ تینتیس سال سے مخلص نے کمالِ محبت کے رشتے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور میرے دہلی میں رہنے کا باعث وہی ہیں۔ یہ زمانہ آرزو کے لیے مالی اطمینان کا تھا۔ بقول خوشگو، انند رام مخلص کے وسیلے سے انھیں ہفت صدی کا منصب اور 'استعداد خان' کا خطاب ملا۔ دربار سے بھی ان کا تعلّق ہو گیا۔ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء کے لگ بھگ نوّاب مؤتمن الدّولہ اسحٰق خان شوشتری (حالات کے لیے دیکھیے مآثر الامراء، ۳: ۷۶۷) نے خان آرزو کی سرپرستی شروع کی اور خان ان کے ندیم ہو گئے۔ ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں دکنی مہمّات کی وجہ سے آرزو کو بھی سرپرست کی معیّت میں دکن کی طرف جانا پڑا۔ واپسی پر خان نے دہلی کی فصیل باہر بستی وکیل پورہ میں، جہاں انند رام مخلص کی حویلی بھی تھی، اپنا مکان بنا لیا۔ ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں مؤتمن الدّولہ نے انتقال کیا۔ نجم الدّولہ اسحٰق خان ثانی قرار پائے اور خان آرزو کو ان سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ اس زمانے میں خان آرزو اور شیخ علی حزین کے درمیان معارضہ ہوا۔ شیخ علی حزین ۱۱۴۹ سے ۱۱۶۱ھ تک دہلی میں فروکش تھے (سرفراز: حزین اور ان کا دور، ص ۳۲ بعد)۔ ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ خان آرزو اور حزین میں ٹھن گئی اور طرفین نے رسائل لکھے (تفصیل کے لیے دیکھیے منوہر سہاے انور، ص ۱۴۱ بعد، نیز وہی مصنّف در رسالۂ معاصر (پٹنہ)، حصّۂ اوّل، مقالہ بعنوان "معارضۂ آرزو و حزین"؛ یہ ہنگامہ

دراصل ایرانی-ہندی نزاع کا شاخسانہ تھا.

محرّم ۱۱۵۸ھ/فروری ۱۷۴۵ء میں محمد شاہ بادشاہ شاہی افواج کو ہمراہ لے کر گڑھ مکتیسر کی طرف روانہ ہوا۔ غرض سیر و شکار تھی اور ضمنی طور پر علی محمد رُوہیلہ کی گوشمالی بھی متصوّر تھی۔ اسحٰق خان بھی لشکر میں تھے اور آرزو بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انند رام مخلص نے بدائع وقائع (نسخۂ دانش گاہِ پنجاب، ورق ۱۹۷ ب و ۱۹۸ ب) میں اس سفر کا حال دیا ہے اور اثنائے سفر میں آرزو کی ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی طرح کے حوالے اس نسخے کے ورق ۵۶، ۶۵، ۶۹، ۷۲ ب، ۷۴ ب، ۱۰۸، ۱۷۲، ۱۸۸ ب، میں بھی ملتے ہیں۔ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹-۱۷۵۰ء کے لگ بھگ خان آرزو شدید بیمار ہوے۔ اس زمانے میں نجم الدّولہ کو صفدر جنگ کی حمایت کی غرض سے فرخ آباد کی طرف جانا پڑا لیکن آرزو ہمراہ نہ جا سکے۔ اس معرکے میں نجم الدّولہ مارے گئے؛ اب خان کے سرپرست سالار جنگ ہوے۔ دہلی میں آرزو کو انھیں کی سرپرستی حاصل رہی۔ دہلی کے سیاسی حالات کی وجہ سے سالار جنگ کو اودھ کا رُخ کرنا پڑا۔ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء کے آخر میں عماد الملک نے جب تیموری فرمانروا احمد شاہ کو معزول اور عالمگیر ثانی کو تخت نشین کرایا تو سالار جنگ کے لیے عماد الملک سے مخالفت کی بنا پر اودھ کی طرف جانا ناگزیر ہو گیا۔ آرزو نے بھی اودھ کا رُخ کیا۔ محرّم ۱۱۶۸ھ/اواخر نومبر ۱۷۵۴ء میں آرزو صفدر جنگ (م ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ) کے انتقال کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اودھ پہنچے (غلام علی آزاد: سرو آزاد، ص ۱۳۰ کا یہ بیان کہ سرکار صفدر جنگ سے تعلّق رہا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا؛ آرزو نے اجودھیا یعنی شہر اودھ میں قیام کیا، جو فیض آباد کی نواحی بستی تھی۔ صفدر جنگ کے انتقال کے بعد شجاع الدّولہ نے دارالحکومت فیض آباد کے بجاے لکھنؤ کر لیا، ۱۱۷۹ھ تک لکھنؤ دارالحکومت رہا۔ اس سال شجاع الدّولہ نے فیض آباد کو دوبارہ دارالحکومت بنایا اور اپنے انتقال تک فیض آباد ہی کو بسائے رکھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ فرح بخش، انگریزی ترجمہ، متعلّقہ صفحات)۔ سالار جنگ نے آرزو کی تین سو روپے ماہوار پنشن مقرّر کرا دی اور مزے سے دن گزرنے لگے۔ آرزو اس زمانے میں لکھنؤ آئے اور چند ماہ بعد ۷۰ برس کی عمر میں یہیں انتقال کیا (۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ/ ۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء، از روے نشتر عشق؛ قب سرو آزاد، ص ۲۳۰ و ۲۳۱؛ تذکرۂ بے نظیر، ص ۲۸، جہاں جُمادَی الاُخرٰی دیا ہے اور مردم دیدہ، ص ۵۸، جہاں مہینہ نہیں دیا نیز منوہر سہاے: سراج الدّین علی خان آرزو تصانیف اور زمانہ (انگریزی)، متعلّقہ صفحات)۔ غلام علی آزاد نے تاریخِ وفات کہی ہے "بگو: آن جان معنی آرزو رفت" = ۱۱۶۹ھ۔ مصحفی کے بیان کے مطابق لکھنؤ میں آرزو کی نعش امانتہً دفن کی گئی، چند سال بعد دہلی لائی گئی اور دوبارہ دفن ہوئی (عقدِ ثریا، ص ۸).

مخلص اِن کی نسبت لکھتا ہے: "وہ صاحبِ فطرتِ خداداد ہے، علمِ عربی، لغت، عروض، فنِّ تاریخ، موسیقی اور ہندی میں بھی استاد ہے" (مرآۃ الاصطلاح، بذیل آرزو).

تصانیف: ان کی اکثر تصانیف کے نسخے دانش گاہِ پنجاب میں موجود ہیں اور متعدّد بانکی پور، رام پور اور انجمن آسیوی بنگال [ایشیاٹک سوسائٹی بنگال] میں بھی ہیں۔ تصانیف کی تقسیم حسبِ ذیل ہے: (ا) کتبِ لغت؛ (ب) معانی و بیان و صرف و نحو؛ (ج) فقہ اللغۃ؛ (د) شروح؛ (ہ) تذکرۂ شعراء؛ (و) تنقیدات؛ (ز) رسائل وغیرہ؛ (ح) دیوان.

(الف) کتبِ لغت:

سراج اللغات، فارسی کے قدیم الفاظ کے بیان میں ہے۔ کلاسیکی دَور کی فارسی کی لغتوں میں برہان قاطع میں جامعیّت زیادہ ہے اور اس میں فرہنگِ جہانگیری کا سارا مواد موجود ہے؛ فرہنگِ رشیدی میں معنے صحیح تر بیان ہوے ہیں مگر غلطیاں برہان اور رشیدی دونوں میں ہیں۔ آرزو کا مقصدِ تالیف برہان و رشیدی وغیرہ کی تصحیح و تنقید تھا۔ اُس نے فرہنگِ مجدالدّین علی قوسی کا مواد مصنّف کے خود نوشت نسخے سے لے کر شاملِ کتاب کر دیا۔ رام پور، انجمنِ آسیوی بنگال اور دیوانِ ہند کے کتاب خانوں میں نسخے ہیں.

چراغِ ہدایت، سراج اللغات کا دفتر دوم ہے۔ اس میں فارسی کے ایسے الفاظ اور متأخّرین کے مصطلحات کا بیان ہے جو جہانگیری، سروری اور برہان قاطع میں نہیں آئے۔ شواہد بھی دیے ہیں۔ یعنی اس کی ضخامت سراج اللغات کے آٹھویں حصّے کے برابر ہے۔ کتاب کے نسخے عام ملتے ہیں۔ کتاب خانۂ شفیعیہ، لاہور کے نسخے پر آرزو کا اپنا ترقیمہ ۲۷ رجب ۱۱۶۰ھ کا دیا ہے۔ ترقیمے کا عکس نوادر الالفاظ طبع انجمن ترقّیِ اردو، کراچی ۱۹۵۰ء کے صفحۂ ۵۰ کے بعد دیا ہے۔ ایک اَور نسخہ جو اسی کتاب خانے میں ہے ۱۲۲۳ھ میں نقل ہوا۔ منقول عنہا کا مقابلہ ۱۱۷۹ھ میں آرزو کے سامنے ہوا اور اُس پر آرزو کے دستخط تھے۔ بانکی پور میں بھی نسخہ ہے، دانش گاہِ پنجاب میں ۱۱۹۱ھ اور دیوانِ ہند میں ۱۱۶۶ھ (صرف نصفِ آخر) کے نسخے موجود ہیں.

(۲) نوادر الالفاظ، یعنی عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات کی تصحیح شدہ اور جامع تر روایت۔ ہانسوی نے ان ہندی الفاظ کو جمع کیا تھا جن کی فارسی، عربی، ترکی غیر مشہور تھی۔ لاہور، بانکی پور، رام پور اور موزۂ برطانیہ میں نسخے ہیں۔ یہ کتاب انجمنِ ترقّیِ اردو، پاکستان، کراچی نے ۱۹۵۱ء میں شائع کی۔ اس میں مقدّمہ ص ۴۲ پر کراچی اور لاہور کے معلوم نسخوں کی فہرست دی ہے.

(ب) معانی و بیان و صرف و نحو:

(ا) عطیۂ کُبْرٰی، فنِّ بیانِ فارسی پر۔ دانش گاہِ پنجاب میں اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک دو دفعہ کتاب طبع بھی ہوئی تھی.

(۲) مَوْہَبتِ عُظْمٰی، معانی زبان فارسی کے فن میں، مفتاح و تلخیص کے طریق پر، آٹھ باب پر مشتمل۔ ۱۲۶۸ھ کا پتھر پر چھپا ہوا نسخہ دانش گاہِ پنجاب میں ہے.

(۳) معیار الافکار، علم ہجا و نحوِ فارسی کے بارے میں، اس کا ذکر عطیّۂ

کُبرٰی کے شروع میں ہے مگر نسخہ نہیں ملتا۔

(۴) زوائد الفوائد، شاذّ فارسی مصادر اور ان کے مشتقّات پر۔ رام پور کا نسخہ بخط مصنّف، مگر ناقص الآخر ہے۔

(ج) فقہ اللغۃ:

مُثْمِر، آرزو نے کتبِ لغت کی تالیف کے بعد یہ کتاب سیوطی کی المُزْہِر کے نمونے پر مرتّب کی، مگر اِس کا نطاق المُزْہِر سے وسیع تر ہے۔ یہ ۱۴۱ / اصلوں پر مشتمل ہے، جن میں اصولِ ذیل بھی شامل ہیں: فصیح و ردی، مفرد و شاذّ، آشنا و غریب، ابدال، امالہ، توافقِ الفاظ، تعریبِ الفاظِ فارسیہ، مشترک و مترادف، توابع۔

اس کتاب کے نسخے کم ملتے ہیں۔ دانش گاہِ پنجاب کا نسخہ ناتمام ہے۔ مجموعۂ کرزن (انجمنِ آسیوی بنگال) کے نسخے کی حالت اچھی نہیں (منوہر سہائے)۔

(د) شروح:

یہ شرحیں تمام فاضلانہ ہیں، مبتدیوں کے لیے نہیں ہیں۔ ان میں معانی، بیان و بدیع اور حکمت و تصوّف کے نکات بیان ہوے ہیں۔

(۱) خیابان یا خیابانِ گلستان، تالیف ''اوانِ طفلی''۔ مصنّف کو محمد نور اللہ احراری (حدود ۱۰۷۳ھ) اور سعد تنوی وغیرہ کی شرحوں میں تسامُح اور تساہُل نظر آیا، اس لیے تحقیق سے یہ شرح لکھی۔ تیس سال کے بعد اس پر نظرِ ثانی کی۔ ۱۲۵۵ھ کا ایک نسخہ محمد شفیع لاہوری کے کتاب خانے میں ہے۔ دہلی اور کان پور میں طبع ہوئی۔ ملّا غیاث الدّین رام پوری نے اپنی شرح میں اس سے استفادہ کیا۔

(۲) شگوفہ زار، (شرحِ سکندر نامہ)، صرف مشکل مقامات کی شرح؛ رام پور میں دو نسخے ہیں۔ فہرست قلمی، شمارہ ۳۹۸۵ و ۳۹۸۶۔ ملّا غیاث الدّین نے اپنی شرحِ سکندر نامہ میں شگوفہ زار کو شامل کر لیا۔ ۱۲۷۷ھ میں طبع ہوئی۔

(۳) شرح قصائد عرفی، صرف مشکل اشعار کا حل۔ ''قریب بچہار ہزار بیت''؛ نسخہ جسے اشرف بیگ خان دہلوی نے ۱۸۸۱ء میں کتابت کیا محمد شفیع لاہوری کے کتاب خانے میں ہے۔ منقول عنہ میں کتابت کی غلطیاں تھیں۔ رام پور میں بھی نسخہ ہے۔ فہرست قلمی، شمارہ ۳۴۱۴۔ آرزو نے (مجمع النفائس میں) لکھا ہے کہ اس نے شرح میں غشّ و سمین کو جدا اور ابو البرکات منیر اور دیگر شارحین کے اعتراضات کو ردّ کیا ہے۔

(۴) سراج و ھّاج، حافظ کے شعر:

کشتی شکستگانیم ای بادِ شُرْطَہ برخیز الخ کے معنی کے بیان میں مختصر سا رسالہ؛ نسخے بانکی پور (مغلوط) اور پوہار میں ہیں۔

(۵) شرح گلِ کُشتی
(۶) شرح مختصر المعانی
} کوئی نسخہ معلوم نہیں ہوا۔

(ہ) تذکرۂ شعرا:

مجمع النفائس آرزو، تذکرہ بھی ہے اور انتخابِ کلامِ شعرا بھی۔ کتاب میں متفرّق فوائد بھی ہیں: مثلاً زبان و ادبِ فارسی کے مسائل پر اشارات، دلچسپ حکایات و وقائع، تاریخی لطائف، تنقیدی ملاحظات اور آرزو کی تجویز کردہ شعری تصحیحات، اپنے سوانح حیات۔ اس میں ۱۷۳۵ شعرا کا سرسری سا حال بلا ترتیبِ زمانی دیا ہے۔ مصنّف کا اصل مقصد دل پسند اشعار کا درج کرنا تھا، حالاتِ شعرا کے درج کرنے کا خیال اسے بعد میں آیا، وہ تقی اوحدی نصر آبادی، سرخوش، سامی وغیرہ کے تذکروں سے لیے۔ متوسّطین و متأخّرین کے سو دیوان اس کے سامنے تھے۔ آغازِ کتاب غالباً ۱۷۵۰-۱۷۵۱ء کے لگ بھگ ہوا۔ اختتام ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰-۱۷۵۱ء میں، لیکن کتاب میں ۱۱۶۶-۱۱۶۷ء تک کے اضافے پائے جاتے ہیں (دیکھیے دیباچۂ دستور الفصاحت، ص ۳۴ ببعد)؛ آرزو کا ذاتی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں ہے۔ دانش گاہِ پنجاب میں دو نسخے موجود ہیں، ایک کامل جو ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ میں تمام ہوا اور ایک ناقص، دیگر نسخوں کے لیے دیکھیے سٹوری (Storey)، ۱ / ۲: ۸۳۹.

(و) تنقیدات:

(۱) تنبیہ الغافلین، حزین کے اشعار کی تنقید اور آرزو اور حزین کا مناقشہ۔ مخطوطہ دانش گاہِ پنجاب میں ہے مگر یہ رسالہ صہبائی: قول فیصل میں چھپا بھی تھا۔

(۲) احقاق الحق، تنقیدِ علی حزین، کلیاتِ صہبائی میں مطبوعہ موجود ہے۔

(۳) دادِ سخن، حاجی محمد جان قدسی کے کلام پر ملّا شیدا کی منظوم تنقید ہے، منیر لاہوری (م ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء) نے اس تنقید پر قصیدے کی شکل میں محاکمہ کیا۔ آرزو نے منیر کے محاکمے پر منثور تنقید دادِ سخن کے نام سے مرتّب کی اور شروعِ مقصد سے پہلے تین مقدّمے اور خاتمہ لکھا۔ اتمامِ کتاب کے بعد اجوبۂ اعتراضاتِ ملّا شیدا جو صہبائی اور ''محقّر'' نے لکھے ان میں سے بھی کچھ مواد داخلِ نسخہ کیا۔ دادِ سخن کے صرف دو نسخے معلوم ہیں، جن میں سے ایک دانش گاہِ پنجاب میں ہے۔

(۴) سراج منیر، کارنامۂ منیر میں طالب، زلالی، ظہوری وغیرہ چار شاعروں کے کلام پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ یہ ان کا ردّ ہے۔ دانش گاہِ پنجاب اور بانکی پور میں نسخے ہیں۔

(ز) رسائل وغیرہ:

پیامِ شوق، مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو محمد شاہ بادشاہ کے دور کی ابتدا میں شائع ہوا۔ اس کا منحصر بفرد نسخہ دانش گاہِ پنجاب میں ہے۔ مصنّف کا انفرادی رنگ اس کی انشا میں بھی موجود ہے مگر یہ رسائل تاریخی واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ آرزو کا رسالۂ آدابِ عشق، گلزارِ خیال (ہولی کے مضمون پر)، آبروے سخن، خطبے اور دیباچے اب نہیں ملتے۔ وارستہ نے صفاتِ کائنات (مطبوعہ) میں بظاہر خطبوں اور دیباچوں کا انتخاب دیا ہے (منوہر سہائے)۔

(ح) دیوان فارسی :

رام پور کا نسخہ ۱۵۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سب غزلیں ہیں، یعنی مستقل اور جوابی دونوں (دیوان ہائے شفیعاے اثر سلیم، فغانی اور کمال خجندی (ناتمام کا جواب)، ۴۳ قصیدے، ترکیب و ترجیع بند، خمسے، چھوٹی مثنویاں اور متفرقات (منوہر سہاے)۔ بانکی پور کے نسخۂ دیوان مؤرّخ در ۱۱۴۰ھ پر آرزو نے نظر ثانی کی ہے، جوابِ دیوانِ اثر ذخیرۂ حبیب گنج اور کتب خانۂ دانش گاہِ علی گڑھ میں بھی ہے۔

مثنویاں: مثنوی مہر و ماہ کا نسخہ دانش گاہِ پنجاب میں ہے، ۱۴ ورق؛ مہر و وفا کے نام سے اس مثنوی کے دو نسخے رام پور میں ہیں، فہرست قلمی، شمارہ ۴۳۲۷، ۴۳۲۸۔ اس کے علاوہ مثنوی شورِ عشق یا سوز و ساز ہے (انتخاب در سفینۂ عشرت) اور مثنوی عالمِ آب یا ساقی نامہ (انتخاب در صُحُف ابراھیم)۔ مجمع النفائس میں اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ کُلّیات اشعار وغیرہ نظم و نثر میں تقریباً ''۳۰ ہزار بیت'' ہے۔

اشعارِ ریختہ: آرزو کے متفرق اشعار ریختہ تذکروں میں ملتے ہیں۔

مآخذ: خان آرزو کی تصانیف کے علاوہ دیکھیے کتبِ مندرجۂ ذیل: (۱) منوہر سہاے انور: *Siraj-ud-Din Alikhan Arzu, his life and Works*، پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ در کتب خانۂ دانش گاہِ پنجاب؛ (۲) آنند رام مخلص: مرآۃ الاصطلاحات، خطّی بذیلِ آرزو؛ (۳) Storey: *Persian Literature*، ۱/۲: ۸۳۴-۸۴۰ (مفصّل)؛ (۴) قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، ۱: ۲۴-۲۶؛ (۵) راے لچھمی نرائن شفیق: چمنستانِ شعراء، دہلی ۱۹۲۸ء، ص ۶-۸؛ (۶) وہی مصنّف: گلِ رعنا، (قلمی)، در دانش گاہِ پنجاب؛ (۷) غلام علی آزاد بلگرامی: سروِ آزاد، لاہور ۱۹۱۳ء، ص ۲۲۷-۲۳۱؛ (۸) حاکم لاہوری: مردم دیدہ، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۵۱-۶۳؛ (۹) عبدالوہّاب افتخار: تذکرہ بینظیر، الٰہ آباد ۱۹۴۰ء، ص ۲۷-۲۹؛ (۱۰) احمد علی یکتا: دستور الفصاحت، دیباچۂ عرشی، رام پور ۱۹۴۳ء، ص ۳۴ ببعد؛ (۱۱) مرزا علی لطف: گلشنِ ہند، لاہور ۱۹۰۶ء، ص ۲۰ ببعد؛ (۱۲) علی حسن خان: بزمِ سخن، آگرہ ۱۲۹۸ھ، ص ۴-۵؛ (۱۳) اسد علی تمنّا: گل عجائب، اورنگ آباد ۱۹۳۶ء، ص ۱-۲؛ (۱۴) میر تقی میر: نکات الشعراء، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء، ص ۳-۴؛ (۱۵) سیّد فتح علی حسین گردیزی: تذکرۂ ریختہ گویان، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، ص ۶-۷؛ (۱۶) قائم: مخزنِ نکات، اورنگ آباد، ص ۱۴؛ (۱۷) میر حسن: تذکرۂ شعراے اردو، دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۵؛ (۱۸) غلام ہمدانی مصحفی: عِقدِ ثریّا، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۷؛ (۱۹) فیلن و کریم الدّین: تذکرۂ شعراے ہند، دہلی ۱۸۴۷ء؛ (۲۰) منوہر سہاے انور: ''معارضۂ آرزو و حزین''، مقالہ در مجلۂ معاصر، پٹنہ، حصّۂ اوّل؛ (۲۱) سرفراز خان خٹک: *Shaikh Muhammad Ali Hazin: His life, times and works*، لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۳۲ ببعد؛ (۲۲) مرزا محمد حسن قتیل: چار شربت.

(وحید قریشی)

آرسلان: [اَرسلان] (ترکی) بمعنی شیر۔ ترکی میں اسم علم کی حیثیت میں عام طور پر مستعمل ہے۔

آرسلان بن سلجوق: سلجوقیوں کے جدِّ اعلیٰ اور سلجوق خانوادوں کے نام گزار (eponym) سلجوق کا بیٹا، غالباً منجھلا بیٹا، تھا۔ اس کی تاریخ ان پہلے اتصالات میں مدغم ہے جو وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے ساتھ اوغز قوم کے ہوے جس کی قیادت آرسلان کا خاندان کر رہا تھا۔ آرسلان کا شخصی نام اسرائیل تھا (قب اس کے بھائیوں کے نام میخائیل اور موسیٰ۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان شخصی ناموں میں خزری یہودیوں یا وسط ایشیا کے نسطوریوں کا اثر نظر آتا ہے) اور آرسلان اس کا طوطمی نام ہے (قب طُغرل محمد اور چغری داؤد، جو اس کے نام آور بھتیجے ہیں)۔ اس کی تاریخ کے ابتدائی واقعات بڑے الجھے ہوے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں سلجوقی خاندان، جو جَنْد میں آباد ہو گیا تھا، اسلام قبول کر چکا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اوغُز کے یَبغُو (Yabghū) کی حکومت سے آزاد کر لیا تھا۔ اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں کہ بعد ازاں اُس کے باپ سلجوق نے اُسے سامانیوں کے آخری بادشاہوں میں سے ایک کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ یہ سامانی اس وقت قراخانیوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اس بات کی توثیق مَلِک نامہ کی روایت سے ہوتی ہے جو خانوادۂ سلجوق کی تاریخ ہے اور ۱۰۶۰ء کے قریب اَلپ آرسلان کی سرپرستی میں لکھی گئی تھی۔ غزنوی عہد کے مؤرّخ گردیزی نے یبغو لقب والے ایک شخص کے متعلّق لکھا ہے کہ اس نے ۱۰۰۳ء میں سامانیوں کی آخری مہم میں، جو وہ قراخانیوں کی مدافعت میں کر رہے تھے، انھیں مدد دی۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے آرسلان بن سلجوق ہی مراد ہے، لیکن حال میں پُرِشاک (O. Pritsak) نے اس خیال کی تردید کرتے ہوے لکھا ہے کہ یَبغُو کے لقب سے صرف ایک ہی شخص مراد ہو سکتا ہے اور وہ بحیرۂ آرال کے شمال کی سلطنت اوغُز کا آخری یَبغُو ہے۔ یہ سچ ہے کہ عربی اور فارسی مخطوط تاریخوں میں منفرد سلجوقی بادشاہوں کے نام کے ساتھ ایک لقب کا اضافہ کرتے ہیں، جسے 'یَبغُو' پڑھ سکتے ہیں، لیکن پُرِشاک نے ثابت کیا ہے کہ لقب 'یَبغُو' کے ساتھ ساتھ ایک طوطمی نام 'پَیغُو' بھی رائج تھا اور اغلب ہے کہ بعض صورتوں میں 'یَبغُو' کو 'پَیغُو' ہی پڑھنا صحیح ہوگا، گو آج تک لوگوں کی توجہ عموماً 'یَبغُو' ہی کی طرف منعطف رہی ہے اور 'پَیغُو' کو قطعاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جہاں تک آرسلان اسرائیل کا تعلّق ہے اس کے دو طوطمی نام نہیں ہو سکتے۔ اس کا لقب واقِعۃً 'یَبغُو' ہی تھا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ شمال کی بُت پرست سلطنت کے خلاف اس کے خاندان نے بغاوت کی تھی اور یہ اغلب ہے، گو یقینی نہیں کہ یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر گردیزی نے کیا ہے اور جس کی تائید روایتی بیان سے بھی ہوتی ہے۔

اس زمانے کے بعد اس کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس میں اختلافات نسبۃً کم ہیں۔ سامانیوں کے خاتمے کے بعد ہم اسے بخارا کے قراخانی باغی علی تِگین

سے وابستہ پاتے ہیں، جس کی ملازمت بالآخر اس کے بھتیجوں طُغْرِل اور چَغْرِی نے بھی اختیار کر لی تھی۔ ۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء میں علی تِگِین کو قراخانیوں کے خانِ بزرگ [قَدِر] خان نے (جس کی پشت پر زیادہ تر قارلُوق تھے) محمود غزنوی کے ساتھ مل کر شکست دی۔ علی تِگِین کی شکست کی زد آرْسْلان کے بھتیجوں کی نسبت خود آرْسْلان پر زیادہ پڑی؛ چنانچہ اسے اور اس کے ساتھی اوغوزوں کو طُغْرِل اور چَغْرِی کے اوغوزوں سے جدا کر کے خراسان بھیج دیا گیا؛ تھوڑے دنوں بعد طُغْرِل اور چَغْرِی کے اوغوز خوارِزْم چلے گئے۔ افسانے یا خوشامد نے اس نقلِ مکانی کے کوائف کو مبہم بنا دیا ہے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ نقلِ مکانی اختیاری تھی مگر اغلب ہے کہ وہ محمود کے حکم سے عمل میں آئی ہو، جیسا بعض دیگر مؤرّخوں نے بیان کیا ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ علی تِگِین کے زور کو توڑا جائے۔ بہرحال اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ محمود نے آرْسْلان اسرائیل کو قید میں رکھا اور وہ قید ہی کی حالت میں (۴۲۷ھ/ ۱۰۳۵-۱۰۳۶ء میں) ہند کی سرحد پر ایک قلعے میں فوت ہوا۔ یہ بتانا ناممکن ہے کہ آرْسْلان کے اس انجام میں اور ۴۱۸ھ/ ۱۰۲۷ء کے بعد سے خراسان کے اوغوزوں میں بغاوت کا جو متّصل اور متواتر میلان نمایاں ہے اُس میں باہم کیا تعلّق ہے۔ راوندی کی طرح کے مؤرّخ، جن کا وتیرہ رومی سلجوقیوں کی، جو آرْسْلان کے بیٹے قُتْلُمُش (قُتْلُمِیش؟) کی اولاد میں سے تھے، خوشامد ہے، یہ کہتے ہیں کہ آرْسْلان (جو قید میں تھا) اور اُس کے اوغوزوں کے درمیان قُتْلُمُش خفیہ قاصد کا کام کرتا تھا، لیکن اس روایت کو صحیح یا غلط ثابت کرنا ناممکن ہے۔

مآخذ: (۱) Cl. Cahen: *Le Maliknāmeh et l'histoire des origines seldjukides*، در *Oriens*، ج ۲، ۱۹۴۹ء، جس میں اصلی مآخذ کی فہرست موجود ہے مگر پِرْتْساک (Omelyan Pritsak) کے مطالعات کی روشنی میں اسے دوبارہ جانچنے کی ضرورت ہے، خصوصًا مطالعۂ ذیل *Der Untergang des Reiches des Oghuzischen Yabghu*، در *Köprülü Armağanī*، استانبول، ۱۹۵۳ء، یا در *Annals of the Ukranian Academy of Arts in the U.S.A*، ج: ۲/ ۲، ۱۹۵۲ء؛ اس کے ساتھ دیکھیے مقالہ نگار کی بحث در *J.A.*، ۱۹۵۴ء، ص ۲۷۱-۲۷۵، دیکھیے نیز Pritsak: *Die Karachaniden*، در *Islam*، ۱۹۵۳ء؛ (۲) آرْسْلان اور غزنویوں کے تعلّقات کی بابت ایک جامع بیان محمد ناظم کی کتابِ ذیل میں ملے گا: *The life and Time of Sultan Mahmud of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء.

(CL. CAHEN کاہن)

---

* **آرْسْلان بن طُغْرُل:** بن محمد ابوالمُظَفَّر، رکن الدنیا والدّین، سَلْجُوقی، ۵۵۵-۵۷۱ھ/ ۱۱۶۰-۱۱۷۵ء سریر آرائے حکومت رہا۔ جب اس کے والد طغرل کا انتقال ہوا (۵۲۸ھ/ ۱۱۳۴ء) تو آرْسْلان صرف ایک برس کا تھا۔ اس نے اپنے (ہم عمر) چچیرے بھائی ملک شاہ بن سَلْجُوق شاہ کے ساتھ تعلیم پائی۔ ۵۴۰ھ/ ۱۱۴۵-۱۱۴۶ء میں ان دونوں کو سلطان مسعود کے حکم سے قلعۂ تِکْرِیْت میں قید کر دیا گیا، جہاں سے انھیں خلیفۃ المُقْتَفِی کی وجہ ہی سے دوبارہ آزادی مل سکی (۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴ء) [دیکھیے راوندی، ۲۸۳ ببعد]۔ یہاں سے آرْسْلان شاہ فرار ہو کر اپنے سوتیلے باپ اَتَابِک اِیلِدگِز [رَکْ بآن] کے پاس پہنچ گیا [آرْسْلان کی ماں اِیلِدگِز کے نکاح میں آگئی تھی، اور وہ] بہت صاحبِ اقتدار تھا۔ اس کی مدد سے آرْسْلان، سلیمان شاہ [رَکْ بآن] کے قتل کے بعد، ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء میں (ہَمَدان میں) تخت نشین ہو گیا۔ [صَتْماز، والیِ اصفہان اور اینانج (تلفّظ: اِنَیْنَجْ) حاکمِ رَے نے مخالفت کی اور جنگ و جدال تک نوبت پہنچی مگر یہ فتنہ دبا دیا گیا۔ اینانج نے ۵۵۹ھ اور ۵۶۳ھ میں دوبارہ سر اٹھایا مگر اس کے قتل پر یہ فساد ختم ہو گیا]۔ چونکہ زِمامِ اقتدار حقیقۃً اِیلِدگِز کے ہاتھوں میں تھی اس لیے آرْسْلان شاہ نے صحیح معنوں میں حکومت کرنے کا کبھی دعوٰی ہی نہ کیا۔ [اس کے عہد کے قابلِ ذکر واقعات میں راوندی نے ابخازیوں کے خلاف تو دو مہمّوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے دوسری مہمّ ۵۵۹ھ میں واقع ہوئی اور ملاحِدہ (اسمٰعیلیوں) کے خلاف ایک مہمّ کا، جنھوں نے قزوین سے تین فرسنگ پر تین قلعے بنا لیے تھے۔ ان قلعوں کو ویران کر دیا گیا اور وہیں کے ایک اَور قلعے کو فتح کر لیا گیا۔ اس آخری واقعے کے متعلّق ابن الأثیر نے بھی تفصیل دی ہے، دیکھیے الکامل، طبع استقامہ، قاہرہ، ۹: ۹۲]۔ اِیلِدگِز کی وفات کے بعد [۵۶۸ھ میں، بقولِ ابن الأثیر: الکامل، طبع استقامہ، ۹: ۱۱۹ مگر قبؔ راوندی، ص ۲۹۸ ببعد، جہاں آخرِ ۵۶۹ھ بلکہ ابتداے ۵۷۰ھ کا گمان ہوتا ہے] اس کے بیٹے اور جانشین محمد پہلوان [رَکْ بآن] نے، جیسا کہ بعض مؤرّخین نے غالبًا درست ہی کہا ہے، دائم المرض سلطان سے یوں نجات حاصل کی کہ زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ [آرْسْلان وسط جمادَی الأُخرٰی ۵۷۱ھ/ ۳۱ دسمبر ۱۱۷۵ء میں ۴۳ سال کی عمر میں فوت ہوا] اور اس کے بیٹے طغرل کو، جو ابھی نابالغ تھا، سلطان تسلیم کر لیا گیا۔

مآخذ: [(۱) الراوندی: راحۃ الصدور، طبع وقفیّۂ گب، ص ۲۸۱-۳۳۰، نیز دیکھیے اشاریّہ؛ (۲) احمد کرمانی: تاریخ افضل (= بدائع الازمان فی وقائع کرمان، ص ۴۳]؛ (۳) ابن الأثیر (طبع تورن بورگ .Tornb)، ۱۱: ۱۲۹ ببعد؛ ایضًا طبع استقامہ، قاہرہ، ۹: ۶۷ ببعد، ۷۲ ببعد؛ (۴) *Recueil de textes relat. à l'histoire des Sedj*، ۲: ۲۳۶ ببعد؛ (۵) میرخوند: *Historia Selds-chukidarum* (طبع Vullers)، ص ۲۳۲ ببعد [روضۃ الصفا، بمبئی ۱۲۷۱ھ، ۴: ۱۰۰ ببعد و خواندامیر: حبیب السیر، ۲/ ۴: ۱۱۰ ببعد] نیز دیکھیے Seldjūḳids.

(ادارۂ آ، طبع اوّل)

---

* **آرْسْلان اَرْغُون:** ملک شاہ کا بھائی۔ اس نے ملک شاہ کی وفات پر خراسان اور ولایت بلخ پر قبضہ جما لیا اور اپنے ایک اَور بھائی بُوْرِی بَرْس کو، جو اس کے مقابلے پر بھیجا گیا تھا، شکست دے دی [اسے قید کر لیا اور ایک سال

بعد گلاگھونٹ کے مارڈالا (۴۸۸ھ/ ۱۰۹۵ء)]۔ اپنے مقتول بھائی کے حامیوں کے خلاف جب اس نے تعزیری اقدامات کیے اور احتیاطی تدابیر کے سلسلے میں مَرو، [قہندز] نیشاپور، [قلعۂ] سَرَخس اور سَبزَوار [شہرستان] وغیرہ [خراسان کے] شہروں کی فصیلوں کو [۴۸۹ھ میں] منہدم کرا دیا تو خلقت اس پر نفرین کرنے لگی؛ بالآخر [محرّم] ۴۹۰ھ/ [۱۰۹۶-۱۰۹۷ء] میں وہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ سَنجَر نے، جو سلطان بَرکیارُق کا بھائی اور نائب تھا اس کے کمسن بیٹے کو، جو سات سال کا تھا، آسانی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا۔ ابن الاثیر (۱۰: ۳۴ [طبع استقامہ، قاہرہ، ۸: ۱۰۳]) ایک آرسلان ارغون کا ذکر کرتا ہے جو آلپ آرسلان کا بھائی تھا؛ جب ملک شاہ کے وارثِ قیاسی (heir-presumptive) بنائے جانے کا اعلان ہوا تو آلپ آرسلان نے خوارزم کی امارت اسے سپرد کی۔ اخبار الدولۃ السلجوقیۃ (ص ۴۰) کا مصنّف بھی یہی معلومات فراہم کرتا ہے، لیکن وہ آرسلان ارغون کو آلپ آرسلان کا بیٹا بتاتا ہے، یعنی وہی شخص جو ملک شاہ کا بھائی تھا؛ مگر بقولِ عمادالدّین بُنداری (ص ۲۵۷) (اور اس کا تتبّع ابن الاثیر (ص ۱۷۸-۱۸۰، [۸۲]) نے بھی کیا ہے) جب ملک شاہ مرا تو اس کا یہ بھائی چھبیس برس کا تھا اور مغربی ایران میں صرف ایک چھوٹے سے اِقطاع (جاگیر) ہی کا مالک تھا۔ آلپ آرسلان کے اس نام کے بھائی کے بارے میں اگرچہ کوئی اور بات معلوم نہیں، لیکن ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ گویا اس نام کے دو شخص گزرے ہیں۔ ملک شاہ کے بھائی کی صلبی اولاد چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں بھی شہر مرو کے اندر موجود تھی۔

مآخذ: عمادالدّین بُنداری، تحقیق ہوتسما (Houtsma): *Receuil de Textes relatifs à l'histoire des Seljoucides*، ۲: ۸۴، ۲۵۵-۲۵۸، اور اس کے تتبّع میں بیان ابن الاثیر، ۱۰: ۱۷۸-۱۸۰؛ (۲) اخبار الدولۃ السلجوقیۃ، تحقیق محمد اقبال، لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۳۳، ۳۴ (آرسلان اَرغُون اور عَمید خراسان محمد بن منصور النَّسَوی کے باہمی تعلّقات)، ۴۰ (قب ابن الاثیر، ۳۴)، ۵۴؛ (۳) علی بن زید البَیہَقی المعروف بہ ابن فُندُق: تاریخ بَیہَق، طبع احمد بَہمَن یار، تہران ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۳۸ء، ص ۲۷۲، ۲۷۰، [(۴) ثناءاللہ: *The Decline of the Saljuqids*، (رسالۂ دکتری)، کلکتہ ۱۹۳۸ء، ۴، ۹۷-۹۹، ۱۰۱].

(CL. CAHEN کاہن)

---

* **آرسلان خان:** محمد بن سلیمان، [علاءالدّولہ در حکیم مختاری غزنوی] قراخانی: فرمانروائے ماوراءالنہر۔ اس کا والد سلیمان تگین جو (طَمغاج) خانِ ''اعظم'' ابراہیم کا پوتا تھا ۴۹۰ھ/ ۱۰۹۷ء کے لگ بھگ سلطان بَرکیارُق کے باج گزار کی حیثیّت سے ایک مختصر سی مدّت کے لیے اس ملک کا حکمران رہا تھا۔ [=قدِر] خان جبرئیل ترکستانی، [بُغرا خان محمد کے پوتے] نے جب ماوراءالنہر فتح کر لیا تو نوجوان شہزادہ محمد خراسان کی جانب بھاگ نکلا۔ بعدازاں سلطان سَنجَر نے قراخانی مذکور [=قدِر خان] کو شکست دی تو اس شہزادے کو سمرقند کا حکمران مقرّر کیا گیا (۴۹۵ھ/ ۱۱۰۲ء) اور اس نے آرسلان خان لقب اختیار کیا۔ آگے چل کر اس کی بیٹی سلطان سنجر کے ساتھ بیاہی گئی [آرسلان اپنے ماموں کو داماد کس طرح بنا سکتا تھا؟]۔ طویل اور مسلسل جدّوجہد کے بعد ہی آرسلان خان اپنے ملک میں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا اور اس اثنا میں کئی بار اپنے داماد سے امداد طلب کرنا پڑی، جس نے ان مفسدوں کو (جن میں محافظ دستوں کے ترک ارکان (praetorians) اور علما دونوں شامل تھے) مَرو میں نظر بند کر دیا۔ پتا چلتا ہے کہ آرسلان خان نے ملک میں تہذیب و تمدّن کی اشاعت کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ تاریخ بخارا میں [دیکھیے بارٹولڈ: *Turkestan*، ص ۱۳ ببعد] بتایا گیا ہے کہ اس نے اس شہر اور اس کے نواح میں مفادِ عامّہ کی کئی عمارتیں بنوائی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ۱۲,۰۰۰ مملوکوں کا ایک لشکر تیار کیا تھا اور کافر ترکوں [جن سے غالباً قپچاق مراد ہیں۔ بارٹولڈ: کتاب مذکور، ص ۳۲۰] کی سرزمین پر اکثر چڑھائی کی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں [جب اس پر فالج کا حملہ ہوا تو] اس نے اپنے بیٹوں کو یعنی پہلے نَصر اور پھر احمد کو بطورِ نائب شریکِ حکومت کیا۔ ان حالات کے ماتحت ملک میں باغیانہ تحریکوں نے نئی قوّت پائی۔ سنجر ایک بار پھر امن کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے میدان میں آ کودا اور وہاں سے اسی وقت ہلا جب امن قائم ہو گیا؛ نتیجہ یہ کہ سنجر کو ایک تکلیف دہ حلیف سمجھا جانے لگا؛ چنانچہ پہلے تو خسر اور داماد میں تُوتُو مَیں مَیں ہوئی اور پھر کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ سمرقند کا محاصرہ کر لیا گیا اور ربیع الاوّل ۵۲۴ھ میں (یہ مہینہ ۲۱ فروری ۱۱۳۰ء کو شروع ہوا تھا) شہر فتح ہو گیا۔ صاحبِ فراش آرسلان کو ڈولی میں ڈال کر اس کی بیٹی [ترکان خاتون] کے پاس لایا گیا اور وہاں سے بلخ لے جایا گیا، جہاں تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے وفات پائی (اس کے سال وفات کے بارے میں اختلاف ہے: ۵۲۴ھ، ۵۲۵ھ، نیز ۵۲۶ھ) اور مَرو کے ایک مدرسے میں، جسے اس نے خود تعمیر کرایا تھا، وہ مدفون ہوا۔ [مختاری نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، مگر دیوان مطبوعہ میں وہ ناقص و ناتمام ہے]۔

مآخذ: (۱) ابن الاثیر (کوائف مختلف اور متعدّد مآخذ سے مرتّب کیے گئے ہیں؛ چنانچہ ان میں اکثر تضاد نظر آتا ہے)؛ (۲) *Recueil de textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*، طبع ہوتسما (Houtsma)، ج ۲؛ نیز قب متعدّد قلمی ماخذ سے اقتباسات در (۳) Barthold: *Turkestan in Zeitalter des Mongoleneinfalls*، حصّۂ اوّل، خصوصاً وہ [جوابی] مکتوب جو محاصرے کے دوران میں سلطان سنجر کے نام سے سمرقند کے ائمّہ، قضاۃ اور اعیانِ شہر کو لکھا گیا، ص ۲۵، ۲۶ [*Turkestan*، طبع وقفیۂ گب، ص ۳۱۹-۳۲۱ و ۳۳۳؛ (۴) تاریخ بخارا، (احمد القُبّاوی کے متنِ عربی کا ترجمہ فارسی میں ہوا بحذفِ بعض، پھر محمد بن زُفَر بن عمر نے اس کی تلخیص کی اور ایک مجہول الاسم مؤلّف نے اس کا ذیل لکھا) طبع بتصحیح مدرّس

رضوی، تہران ۱۳۱۷ ش، اشاریہ؛ *The History of Bukhara*، تلخیصِ نرشخی فارسی کا ترجمۂ انگریزی از Richard N. Frye، کیمبرج و میساچوسٹس (Massachusetts) ۱۹۵۴ء، اشاریہ بذیل Arslān؛ (۵) حکیم مختاری غزنوی، تہران ۱۳۳۴ ش، ص ہفتاد و پنج و ۱۸ ببعد].

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

---

* **آرسلان شاہ:** بن طُغرُل شاہ کرمان کا سلجوق بادشاہ، جو طُغرُل شاہ کے چار بیٹوں [ترکان شاہ، بہرام شاہ، ارسلان شاہ، توران شاہ] میں سے ایک تھا، جن کے درمیان طغرل شاہ کی موت [۵۶۲ھ] کے بعد تاج وتخت کے لیے جدال وقتال جاری رہا۔ آرسلان شاہ [رمضان] ۵۷۲ھ [مارچ ۱۱۷۷ء میں ایک ایسی ہی لڑائی میں تیر لگنے سے گھوڑے سے گرا اور] فوت ہوا [نیز دیکھیے مادّۂ سلاجقۂ کرمان Saldjūḳs of Kirmān].

مآخذ: [(۱) افضل الدّین احمد کرمانی: تاریخ افضل: بدائع الازمان فی وقائع کرمان، تہران ۱۳۲۶ ش، ص ۳۵-۷۷]؛ (۲) *Recueil de Textes relat. à l' histoire des seldj.*: ۳۵ ببعد؛ (۳) *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، ۳۹: ۳۷۸ ببعد؛ [(۴) حمداللہ مستوفی: تاریخ گزیدہ، طبع وقفیۂ گب، ص ۴۷۹ ببعد؛ (۵) خواند امیر: حبیب السیر، ۲/ ۴: ۱۱۴].

(ادارۂ آآ، طبع اوّل)

---

* **آرسلان شاہ:** بن کرمان شاہ [بن قاورد]، مُحیِ الاسلام و [المسلمین] سلجوقی، [ابو الحارث معزّ الدّین، در مختاری، ۳۱۴]: فرمانروائے کرمان [محرّم] ۴۹۵-۵۷۳ھ/ [اکتوبر] ۱۱۰۱-۱۱۷۷ء۔ اس بادشاہ کا طویل مگر بظاہر سرگرمیوں سے خالی عہد بہت خوش قسمتی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ [مختاری کے دیوان میں تین قصیدے اس کی تعریف میں دیے ہیں۔ پہلے میں (ص ۱۶) یہ بھی کہا ہے کہ اس نے ملحدوں کے خلاف اقدامات کیے]۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ اپنی ایک چہیتی بیوی زَینتُون خاتون کے بے حد زیرِ اثر ہو گیا، جس کی تمنّا تھی کہ اس کا بیٹا کرمان شاہ آرسلان شاہ کا جانشین قرار پائے۔ لیکن کرمان شاہ نااہل ثابت ہوا اور دوسرے بیٹے محمد نے اپنے ضعیف العمر باپ کو گرفتار کر کے خود تخت سنبھال لیا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد آرسلان شاہ وفات پا گیا، لیکن یہ یقینی نہیں کہ اس کی موت طبعی موت تھی یا نہیں۔

مآخذ: [(۱) حکیم مختاری غزنوی، تہران ۱۳۳۶ ش، ص ہفتاد و یک، ۱۵، ۲۷۴، ۳۱۳؛ (۲) ابن الاثیر، طبع استقامہ، قاہرہ، ۸: ۲۰۳، ۲۷۵؛] [۳] *Recueil de Textes relat. à l' histoire des seldj.*، ۱: ۲۵ ببعد؛ [۴] *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، ۳۹: ۳۷۴ ببعد؛ [(۵) افضل الدّین ابو حامد احمد بن حامد کرمانی: تاریخ افضل (=بدائع الازمان فی وقائع کرمان) طبع مہدی بیانی، تہران ۱۳۲۶ ش، ص ۲۱ - ۲۴؛ (۶) ناصر الدّین منشی؟ کرمانی: سمْط العلیٰ للحضرۃ العلیا، طبع عباس اقبال، تہران ۱۳۲۸ ش، ص ۱۸؛ (۷) حمداللہ مستوفی: تاریخ گزیدہ، ص ۴۷۹؛ (۸) حبیب السیر، ۲/ ۴: ۱۱۴].

(ادارۂ آآ، طبع اوّل)

---

* **آرسلان شاہ:** بن مسعود، (ابو الحارث)، زنگی خاندان کا بادشاہ [رک بہ مادّۂ زنگی].

⊗ **آرسلان شاہ:** بن مسعود بن ابراہیم غزنوی، اس بادشاہ کو عثمان مختاری (دیوان خطّی، ورق ۷ ب، بانکی پور، طبع تہران، ص ۱۶۳، سطر آخر اور کئی اَور مقامات میں) ''ابو الملوک ملک آرسلان بن مسعود'' لکھتا ہے۔ آرسلان کی والدہ سلطان ملک شاہ کی پھُوپھی یعنی ابو سلیمان داؤد بن میکائیل بن سلجوق کی بیٹی تھی (قب دیوانِ مسعودِ سعد، ص ۶۱۱، سطر قبل از آخر: ''از اصل و نسلِ داؤدم'') اور دیکھیے آداب الحرب، ص ۱۸-۲۷، جس میں اس شادی کا سارا قصّہ دیا ہے)۔ یہ شادی موسم سرما ۴۷۵ھ/ ۱۰۸۲-۱۰۸۳ء کے حدود میں ہوئی ہوگی (قب دیوانِ مسعودِ سعد، ص ۲۰۹ ببعد، عنوان: باز در ثنای او)۔ آرسلان غالباً ۴۷۶ھ میں پیدا ہوا (قب طبقاتِ ناصری، کلکتہ، ص ۲۳؛ ص ۵۱۱ میں ملک آرسلان بوقتِ وفات ۳۵ سال کا تھا پس وہ ۴۷۶ھ میں پیدا ہوا)۔ مسعود سوم غزنوی (م شوال ۵۰۸ھ/ مارچ ۱۱۱۵ء، ابن الاثیر، طبع استقامہ، مصر، ۸: ۲۶۹) کی وصیت کے مطابق (مرآۃ العالم، ورق ۱۰۹ الف، بانکی پور) اس کا بڑا لڑکا عضد الدولہ شیرزاد، جو ہندوستان کا والی اور سپہ سالار تھا (قب ابو الفرج رونی، و مسعود سعد مثلاً دیوانِ مسعود سعد، ص ۲۲۷، ۵۰۴، ۵۶۳ وغیرہ)، تخت نشین ہوا۔ مگر اس کے تخت نشین ہوتے ہی بھائیوں میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور ملک آرسلان نے اپنے بھائی شیرزاد کو قتل کر دیا (مرآۃ العالم، ورق ۱۰۹ الف) اور دوسرے بھائیوں کو قتل یا قید کر دیا۔ لیکن ایک بھائی بہرام شاہ، جو تکین آباد (علاقۂ گرم سیر) میں باپ کے ساتھ اس کی وفات سے پہلے سے تھا، بچ نکلا (طبقاتِ ناصری، راورٹی، ص ۱۴۸) گو اس سے تکین آباد میں لڑائیاں بھی ہوئیں (قب دیوانِ مسعود، ۱۲۷ ببعد، ۱۱۱ ببعد)۔

ملک آرسلان نے جب میدان صاف پایا تو غزنین میں ''السلطان الاعظم، سلطان الدولہ'' کے لقب سے (تاریخ ایلیٹ (Elliot)، ۲: ۴۸۳) چہارشنبہ ۶ شوّال ۵۰۹ھ/ ۲۲ فروری ۱۱۱۶ء کو تخت نشین ہوا (قب دیوانِ مسعود، ص ۳۱۷ ببعد)۔ اس کے سکّوں کے نقوش کے لیے دیکھیے راجرز۔

عثمان مختاری کے اشعار سے (مؤنس الاَحرار، قلمی، ۶۹۱، حبیب گنج، ضلع علی گڑھ؛ دیوان، طبع تہران، ص ۳۳۵) اندازہ ہوتا ہے کہ ملک آرسلان تخت نشینی

کے لیے رَے بھی گیا، جہاں ماہِ بہمن کی دوسری تاریخ، بَہمَنجَنَہ کے دن (شوّال ۵۰۹ھ/فروری ۱۱۱۶ء) وہ رسم ادا ہوئی.

ملک آرسُلان کے خوف سے بہرام شاہ، سیستان ہوتا ہوا، مدد کے لیے آرسلان شاہ [رکن بآن] بن کرمان شاہ بن قاوَرد (م ۵۳۷ھ/ ۱۱۴۲ء) کے پاس کرمان پہنچا اور وہاں سے وہ سنجر کی خدمت میں استعانت کے لیے بھیجا گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے [احمد کرمانی: تاریخ افضل، ص ۲۲ ببعد]؛ محمد بن ابراہیم: تواریخ آل سلجوق کرمان، برلن ۱۸۸۶ء، ص ۲۵ اور سنائی: حدیقہ، لکھنؤ ۱۳۰۴ھ، ص ۶۳۸ - ۶۴۲، [ابن الاثیر، طبع مذکور، ۸:۲۶۹ ببعد])۔ آداب الحرب (ص ۳۲ - ۳۴) میں تفصیل ہے کہ بہرام شاہ کو سنجر کا قرب کس طرح حاصل ہوا۔ سنجر اس زمانے میں اپنے بھائی سلطان محمد (م ۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء) کا نائب تھا۔ اس نے ملک آرسُلان کو بہرام شاہ کے ساتھ مصالحت کرنے کا مشورہ دیا، لیکن آرسُلان نے پروا نہ کی، اس کے علاوہ اپنی والدہ کے ساتھ بُرا برتاؤ بھی کیا۔ اس لیے سنجر خود بہرام شاہ کو ساتھ لے کر آرسُلان پر حملہ آور ہوا (تاریخ بدایونی، کلکتہ ۱۸۶۸ء، ۱:۳۹)۔ ملک آرسُلان نے سلطان محمد سے التجا کی کہ سنجر کو حملے سے روکا جائے، لیکن بے سود (ابن الاثیر، محلِّ مذکور؛ حبیب السیر، طبع بمبئی ۱۸۵۷ء، ص ۳۳)۔ سنجر کے پاس تین ہزار سپاہی تھے اور مقامِ بُست پر حاکمِ سیستان یعنی تاج الدّین ابوالفضل (سنجر کا بہنوئی) اور اس کا بھائی فخر الدّین بھی سنجر سے آملا۔ ادھر ملک آرسُلان نے بھی تیاری کی اور تیس ہزار سوار، لاتعداد پیادے اور ایک سو ساٹھ ہاتھی جمع کر لیے (روضۃ الصفاء؛ ابن الاثیر، محلِّ مذکور، ص ۱۲۰۔ دیوانِ مسعودِ سعد، ص ۲۶۶ س ۱ میں ہے کہ آرسلان نے دو سو ہاتھی جمع کیے ہوئے تھے)۔ لیکن اس تیاری کے باوجود اس نے اپنی والدۂ [سبھی] مہدِ عراق کو منا کر دو لاکھ دینار اور تحائف کے ساتھ بُست کے مقام پر سنجر کے پاس بھیجا، لیکن والدہ ملک آرسلان سے ناراض تھی (دیکھیے سطورِ بالا) اور آرسلان نے اپنے بھائیوں کو قتل یا قید کر دیا تھا، اس لیے والدہ نے بجائے روکنے کے سنجر کو حملے کے لیے اُور آمادہ کیا۔ چنانچہ سنجر کی فوجیں غزنین سے ایک فرسخ پر [دشتِ شہر آباذ میں] ملک آرسلان کی فوج سے معرکہ آرا ہوئیں۔ تاج الدّین ابوالفضل (نَصر بن خَلَف) نے ایک ہاتھی کو مار ڈالا۔ تاریخ ابوالخیرخانی (ورق ۱۳۶ الف، بانکی پور) میں اس جنگ کے حالات کے علاوہ تاج الدّین ابوالفضل کے درباری شاعر خواجہ صاعد مستوفی کی متعلّقہ مثنوی کے اشعار بھی نقل کیے ہیں.

عبدالواسع جَبَلی (م ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء) نے بھی اسی تاج الدّین کی مدح میں اس واقعے سے متعلّق ایک طویل قصیدہ لکھا ہے، دیکھیے دیوان (نسخہ، در دانش گاہِ پنجاب، ورق ۶ ب، نسخۂ مطبوعہ طبع ذبیح اللہ صفا، تہران ۱۳۳۹ ش، ۱:۳۱۱-۳۱۲).

ملک آرسلان کو شکست ہوئی اور وہ ہندوستان کو بھاگ کھڑا ہوا (۵۱۰ھ/ ۱۱۱۶ء) اور اپنے وائسرائے محمد بن بوحلیم سے فوج جمع کرائی۔ ادھر سنجر وغیرہ کامیابی کے ساتھ ۲۰ شوال ۵۱۰ھ/ یک شنبہ ۲۵ فروری ۱۱۱۷ء کو غزنین میں داخل ہوئے اور چالیس روز، یعنی جمعہ یکم ذوالحجّہ ۵۱۰ھ/ اپریل ۱۱۱۷ء تک وہاں قیام کیا اور بہرام شاہ کو سلطان محمود کے تخت پر بٹھایا؛ اس شرط پر کہ وہ ایک ہزار دینار فی روز ادا کرے۔ وصولی کے لیے ایک عاملِ دیوان بھی مقرر کیا (روضۃ الصفاء، ۴: ۴۳؛ راحۃ الصدور، ۱۶۸)۔ اس کے بعد سنجر واپس خراسان چلا گیا، لیکن اس کے جانے کے بعد یعنی ۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء میں ملک آرسلان اپنی ہندوستانی فوج کے ساتھ غزنین پر حملہ آور ہوا۔ بہرام شاہ مقابلے کی تاب نہ لا کر بامیان میں چھپ گیا۔ سنجر نے بلخ سے فوج بھیجی، جس نے ملک آرسُلان کو بھگا دیا اور آخر کار شُکران کی پہاڑیوں میں اسے گرفتار کر کے بہرام شاہ کے حوالے کر دیا (تاریخ ایلیٹ، ۲:۱۹۹، بحوالہ محمد عوفی)۔ مسعودِ سعدِ سلمان نے (دیوان، ص ۱۷ سطر ۱۲ و ۱۳) اس دوسری جنگ کے متعلّق قصیدہ لکھا ہے، جس میں بہرام شاہ کو کہا ہے: ''شیر کے شکار کا شوق دل میں پیدا نہ کر، اس لیے کہ تیرے خوف سے مرغزار میں ایک بھی شیر نر نہیں رہا، ہاں کبھی کبھی چوگان کھیلنا جائز ہے گو برف کی وجہ سے زمین ڈھکی ہوئی ہے اور نظر نہیں آتی'' شکارِ شیر (شعر ۲) سے آرسُلان (=شیر) کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور زمین کے برف سے ڈھکے ہونے سے موسمِ سرما کا زمانہ (۲۱ دسمبر ۱۱۱۷ - ۲۰ مارچ ۱۱۱۸ء) مراد ہے جب کہ وہ دوسری جنگ ہوئی ہوگی۔ حدیقۂ سنائی (لکھنؤ ۱۳۰۴ھ، ص ۶۶۳-۶۶۶، خصوصاً دیکھیے ص ۶۶۴-۶۶۵ کے آخری دو شعر) میں بھی یہی جنگ مذکور ہے۔ سنجر کی فوج نے جب آرسُلان کو بہرام شاہ کے حوالے کر دیا تو اس نے کچھ عرصے تک اسے قید میں رکھ کر رہا کر دیا۔ آرسُلان نے پھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو بہرام شاہ نے اسے جُمادی الاُخریٰ ۵۱۲ھ/ ستمبر ۱۱۱۸ء میں قتل کر دیا اور غزنین میں اس کے والد مسعود سوم کی قبر کے پاس ہی دفن کر دیا (ابن الاثیر، طبع استقامہ، مصر، ۸:۲۷۱)۔ راورٹی نے انگریزی ترجمۂ طبقاتِ ناصری (کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۱۰۹، حاشیہ ۶) میں لکھا ہے کہ آرسلان نے شاہ آباد میں شوّال ۵۱۱ھ میں انتقال کیا، لیکن ملک آرسُلان کا قتل ہونا ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (قب حدیقۂ سنائی، ص ۶۶۳، س ۸ ببعد و ۶۶۴، س ۴)۔ طبقاتِ ناصری میں ہے کہ اس کے عہد میں آسمان سے آگ اور بجلی گری جس سے غزنین کے بازار جل گئے (قب مختاری، ۱۶۹)، نیز دیگر حوادث اور اتّفاقات ایسے ہوئے کہ خلقت اس کی حکومت سے متنفّر ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ شاعروں پر بہت مہربان تھا۔ مسعودِ سعد، سنائی اور مختاری نے اس کی بہت ستائش کی ہے۔ خصوصاً مختاری کے موجودہ دیوان میں تو کوئی تیئیس قصیدے اس کی مدح میں ملتے ہیں۔ یاد رہے کہ آرسلان کی مدّتِ حکومت صرف دو سال تھی.

مآخذ: (۱) سنائی: حدیقۃ الحقیقہ، لکھنؤ ۱۳۰۴ھ؛ (۲) دیوانِ عثمان مختاری خطّی، (بانکی پور) نسخۂ مطبوعہ تہران ۱۳۳۶ش؛ (۳) دیوان مسعودِ سعدِ سلمان (تہران ۱۳۱۸ ش)، ص ۲۰۹-۲۱۲؛ (۴) فخر الدّین مبارک شاہ: آداب الحرب، در

ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۳۸ء، ۱۸ - ۲۷؛ (۵) افضل الدّین ابو حامد احمد بن محمد کرمانی: تاریخ افضل (بدائع الازمان فی وقائع کرمان)، طبع مہدی بیانی، تہران ۱۳۲۶ش، ص ۲۲؛ (۶) محمد ابن ابراہیم: تواریخ آل سلجوق کرمان، برلن ۱۸۸۶ء؛ ملخّص در *ZDMG*، شمارہ ۳۹، ۱۸۸۵ء: ۷۴ ۳ ببعد؛ (۷) راوندی: راحة الصدور، طبع وقفیۂ گب، ۱۹۲۱ء؛ (۸) ابن الأثیر، طبع الاستقامہ، قاہرہ، ۸: ۲۶۹ ببعد؛ (۹) طبقاتِ ناصری، کلکتہ ۱۸۶۴ء، ۲۲ (=طبع کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ۱: ۲۸۴) (ترجمہ راورٹی، ۱۸۸۱ء، ص ۳)؛ (۱۰) میر خواند: روضة الصفاء، بمبئی ۱۲۷۱ھ، ۴: ۴۳؛ (۱۱) خواند امیر: حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۲/ ۴: ۳۳؛ (۱۲) تاریخ فرشتہ، بمبئی، ص ۸۵؛ (۱۳) محمد بقا سہارن پوری: مرآة العالم، خطّی، بانکی پور؛ (۱۴) تاریخ الیلیٹ، ۲: ۴۸۳؛ (۱۵) راجرز (Rodgers): *Catalogue of the Coins of the Indian Museum*، کلکتہ ۱۸۹۶ء، ۴: ۱۶۰؛ (۱۶) احمد بن محمد کلاتی اصفہانی: مؤنس الاحرار، خطّی، حبیب گنج، ضلع علی گڑھ؛ (۱۷) تاریخ بدایونی، کلکتہ ۱۸۶۸ء، ۱: ۳۸۶؛ (۱۸) تاریخ ابو الخیر خانی، خطّی، بانکی پور.

(غلام مصطفٰی خان)

---

* **آرسُلان لی:** (ترکی)، [لفظی ترجمہ: قرشِ اَسدی] ایک قدیم ترکی سکّہ، [رک بہ مادّہ Ghurūsh].

---

* **آرکاٹ:** (Arcot) مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ کا ایک شہر، جو دریاے پالار کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ آرکاٹ تامل زبان کے لفظ آرُکَ کَڈُ سے ماخوذ ہے بمعنیٰ 'آرکا جنگل' یا لفظ آرو۔ کَڈُو سے جس کے معنی ہیں 'چھے جنگل'۔ اس شہر کی بِنا چوْلا خاندان کے راجاؤں نے رکھی۔ بطلیموس کے جغرافیے میں اس کا نام آرْکَٹوس (Arkatos) آیا ہے۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اس کا بانی کولوٗٹ ٹُنگا چوْلا (Kolōttunga Čōḷa) کا بیٹا تھا اور ٹُمّی ریڈی نے قلعۂ آرکاٹ تعمیر کیا اور شہر کی بنا از سرِ نو رکھی، مگر یہ شہر اس سے بہت پہلے کا ہے (دیکھیے (۱) K. A. Nilakanta Sasti: *The Čōḷas*، ۱۹۵۵ء؛ (۲) R. Sewell: *Archaeological Survey of Southern India*، ۱: ۱۶۵)۔ بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ شہر آرکاٹ کے مغل نوّابوں کا صدر مقام بن گیا.

سترھویں صدی عیسوی کے دوران میں یہ شہر وجیانگر سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈے کو، پھر مرہٹوں کو اور ان سے مغلوں کو منتقل ہوا۔ ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں اورنگ زیب نے کرناٹک کا نیا صوبہ بنایا اور داؤد خان نے، جو ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء سے اس صوبے کا والی بنا، آرکاٹ کو صوبے کا صدر مقام بنایا.

داؤد خان کا جانشین محمد سیّد سعادت اللہ خان ایک نَوایَط تھا، اس نے آرکاٹ کا پورا صوبہ اپنے رشتے داروں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا بھتیجا اس کا جانشین بنا اور اس نے صوبے کو وسعت دی۔ اس کے بیٹے صفدر علی نے مرہٹوں کے تنجُور پر حملہ کیا اور اس کے داماد حسین دوست خان (چندا صاحب) نے چالاکی سے تُرِچِنا پلی (Trichinopoly) پر قبضہ کر لیا.

اس جارحانہ اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں آرکاٹ پر چڑھائی کر دی۔ نوّاب درّہ دَمَل چڑی میں مارا گیا، آرکاٹ کو مرہٹوں نے تاراج کیا اور چَنْدا صاحب کو گرفتار کر کے سَتارا لے گئے.

اس کے بعد حکومت صفدر علی کے ہاتھ آئی، مگر اسے ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر دکن کے صوبیدار نے باہر کے ایک آدمی انوار الدّین کو آرکاٹ کا والی بنا دیا، مگر اس تقرّر پر بہت سے نوایطون نے، جو صوبے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے عہدوں پر فائز تھے، ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس باہمی اختلاف نے پانڈی چڑی کے فرانسیسی گورنر ڈوپلے (Dupleix) کو مداخلت کا موقع دے دیا۔ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء میں ڈوپلے نے چَنْدا صاحب کو رہا کرانے میں مدد دی، جو آرکاٹ کی نوّابی کا دعویدار تھا اور نوایط اس کے طرفدار تھے۔ اگلے سال فرانسیسی فوجوں نے، جو چندا صاحب کے زیرِ قیادت تھیں، آمبُور کے مقام پر انوار الدّین کو قتل کر دیا اور ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰ء میں جب دکن کا صوبیدار مارا گیا تو چندا صاحب کے نوّاب آرکاٹ ہونے کا اعلان کر دیا گیا.

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی کشمکش میں، اگلے گیارہ سال، آرکاٹ شطرنج کا مہرہ بنا رہا۔ کبھی اس پر جنرل کلائو (Clive) نے قبضہ آجمایا [مثلاً ۳۱/ اگست ۱۷۵۱ء کو] اور کبھی لالی (Lally) نے۔ یہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ برطانیہ کا پٹھّو محمد علی یہاں کا نوّاب بنا دیا گیا۔ یوں تو اس کی فوجوں نے دو مرتبہ (سلطان میسور) حیدر علی کو شہر حوالے کر دیا اور نوّاب بہت مقروض بھی ہو گیا؛ تاہم اس کی اولاد ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء تک یہاں قابض رہی اور اس کے بعد کسی نرینہ وارث کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ریاست کمپنی کے ہاتھوں میں چلی گئی (دراصل صوبۂ آرکاٹ کا نظم و نسق ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء ہی سے برطانیہ کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا).

محلّ، قلعہ اور شہر کے دفاعی استحکامات، جو محمد علی نے یورپی طرز پر بڑے اہتمام سے تعمیر کرائے تھے، اب منہدم ہو چکے ہیں۔ اس شہر میں بے شمار مسجدیں، سعادت اللہ خان کا نفیس مقبرہ اور ٹیپو مستان اولیا کی درگاہ اب بھی موجود ہے۔ میسور کے ٹیپو سلطان کا نام انھیں بزرگ کے نام پر رکھا گیا تھا؛ باؤرِنگ (L. B. Bowring): *Haider Ali and Tipu Sultan*، ص ۱۱۷ ببعد، حاشیہ.

مآخذ: (۱) M. Wilks: *Historical Sketches of the South of India*؛ (۲) Sewell: کتاب مذکور، ۱: ۱۶۵؛ ۲: ۱۹۸-۱۹۹؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، ۱۹۰۸ء، ۵: ۴۱۹ ببعد؛ (۴) *Cambridge History of India*، ج ۵، باب ۸ و فہرست مآخذ؛ (۵) S. K. Aiyangar در *Journal of Indian Hist.*، ۱۹۳۰ء، ص ۱۷۳ - ۲۱۷؛ (۶) S. M. H. Nainar: *Sources of the History of the Nawabs of the*

Carnatic، ۴ جلدیں، ۱۹۳۴-۱۹۴۴ء؛ (۷) C. S. Srinivasachari: *A History of Gingee*؛ (۸) Edgar Thurston: *The Madras Presidency*، کیمبرج ۱۹۱۳ء؛ (۹) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، ۱۹۶۱ء، ۲: ۲۹۳].

(J.B. HARRISON ہَیْرِی سَن)

---

* **آرْنَاوُدْلُق:** (Arnawutluḳ) اَلبانیا کا نام عثمانی ترکی زبان میں (۱) زبانِ اَلبانوی، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پِلاسْجِی [یا پِلاسْغِی، قدیم اَلبانوی] زبان سے نکلی ہے، ارمنی، ہندی، ایرانی اور سلاوی زبانوں کی طرح ''سَاتِم'' (Satem) قسم کی ایک ہندی-یورپی زبان ہے۔ ۱۴۹۶ء سے پہلے کی ادبی تحریریں تو موجود نہیں ہیں، لیکن شخصی اور مقامی ناموں کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شمالی اَلبانوی زبان گِیغَہ (Geg) کی اصل، قدیم اِیلِیرِی (Illyrian) زبان ہے اور جنوبی اَلبانوی طَوْسقہ (Tosḳ) کی اصل، قدیم اِپِیرِی (Epirote) زبان ہے۔ چنانچہ ایلیری الفاظ مَنْتوا (mantua)، منتیا (mantia) (کانٹے دار جھاڑی) اور گرْوْسَہ (Grōssa) (ریتی) کے لیے اَلبانوی الفاظ علی الترتیب مَنْد (mand)، منزَہ (Manzë) اور گْرِیْسَہ (Grresë) ہیں۔ مقدونیا، تراکیا (Thracia) اور داچیا (Dacia) کی زبانیں بھی اَلبانوی زبان کے نمونے کی تھیں۔

اَلبانوی زبان اَلبانیا میں شْقِپْ (shqip) اور اَلبانوی نو آبادیوں میں اَرْبارِش (arbëresh) کے نام سے موسوم ہے۔ یہ زبان اَلبانیا میں تقریباً پندرہ لاکھ آدمی بولتے ہیں، یوگوسلاویا سے ملحق علاقے قوْصْوہ مِتْوْہِیَہ (Kosovo Metohija) میں تقریباً سات لاکھ آدمی اور اِیپِیر (Epirus) میں کوئی چالیس ہزار آدمی۔ یونانی جزیروں ہائیڈرا (Hydra) اور سْپِٹْزا (Spetsa) میں، نیز صِقِلّیہ اور قِلَّوْرِیَّہ (Calabria) میں اس زبان کی ایک قدیم متروک شکل اب تک باقی ہے؛ اس زبان کو وہ اَبانویانِ طَوْسْقَہ یہاں لائے تھے جو ترکوں کے حملوں سے ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے۔ صدیوں کی کس مپرسی کی بدولت اَلبانوی زبان مفلس ہوگئی اور اس لیے اس میں خالص اَلبانوی لفظوں کی کمی اور غیر ملکی مستعار الفاظ کی کثرت ہے۔ یہاں تک کہ پہیّے، چھکڑے اور ہَل کے لیے بھی مستعار الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح رشتوں کے لیے معمولی ہندی-یورپی الفاظ بھی مفقود ہیں۔ شہری زندگی، سڑکوں کی تعمیر، باغبانی، قانون، مذہب اور خاندانی رشتوں کے اظہار کے لیے لاطینی کے مستعار الفاظ مستعمل ہیں، جن کی اصل صورت نظامِ صوتی کے انحطاط کی وجہ سے بہت بدل گئی ہے۔ جو اصطلاحیں راسخ العقیدہ [آرتھوڈوکس] مذہبی رسوم میں استعمال ہوتی ہیں وہ یونانی ہیں؛ پکے ہوے کھانوں، کپڑوں اور گھر کے مختلف حصّوں کے نام اور اسلامی اصطلاحیں ترکی کے ذریعے آئی ہیں۔

اَلبانوی کی مخلوط ابجد یوں ہے [ا] a، [ب] b، c (ts کی طرح)، [چ] ç (ch) کی طرح، [د] d، dh (جس طرح th کی آواز انگریزی لفظ this میں ہے)، [اِ] e، ë (فرانسیسی le کی e کی طرح)، [ف] f، [گ] g، ڑ g (جس طرح ترکی g حروف e، i، ö کے ماقبل ہوتی ہے) [ہ] h، [اِ] i، [ی] j (جیسے انگریزی لفظ yoke میں y، [ک] k، [ل] ڵ (جیسے فرانسیسی میں)، ڵڵ (جیسے انگریزی لفظ all میں)، [م] m، [ن] n، نْیْ (nj) (جیسے لفظ cañon، تلفّظ: کینین میں)، [ـۆ] o، پ (p)، [ک] q (e، i، ö سے پہلے آنے والے ترکی حرف [ک] k کی طرح)، ر r (خفیف)، ر rr (ثقیل، کھینچ کر)، [س] s، [ش] sh (جیسے لفظ shop میں)، [ت] t، [تھہ] th (جیسے لفظ thin میں)، [ـۆ] u، [و] v، [ز] x (جیسے لفظ adze میں)، [ج] xh، (جیسے لفظ judge میں)، [ی] y (= جرمن زبان کا ü)، [ز] z، [ژ] zh (جیسے لفظ pleasure میں)۔ حروفِ علّت â، î، ê، گِیغہ (Geg) زبان کے اَنفی حروف ہیں۔

گِیغہ زبان اس صوبے کے صدر مقام تِیرانَہ (Tiranë) اور شمالی علاقے کی بولی ہے، جس میں قوصوہ مِتْوْہِیَہ (Kosovo-Metohija) بھی شامل ہے۔ طوسقہ میں خاصا وسیع ادب موجود ہے۔ اس میں گیغہ سے خاص خاص لسانی انحرافات یہ ہیں: مصدر کی جگہ شرطیہ ترکیبوں کا استعمال، اَنفی حروفِ علّت کی عدم موجودگی، کبھی کبھی ن کی ر میں تبدیلی اور ue، uem کی جگہ ur، uar کا استعمال، مزید بریں مفردات میں بھی معمولی اختلافات ہیں۔

جنس کے اعتبار سے اسم کے تین صیغے (genders) ہوتے ہیں اور پانچ نحوی حالتیں (cases)۔ اسم کو بعد میں آنے والے مضاف الیہ یا اسم صفت سے ایک صرف پذیر حرف کے ذریعے جوڑا جاتا ہے، جیسے مالی ای وِیرِیُوت (mali i veriut)، یعنی ''شمال کا پہاڑ'' اور مالی ای بُوکور (mali i búkur)، یعنی ''خوبصورت پہاڑ''۔ اس ترکیب میں مالی (mal-i) کی اضافت i- ایک مذکّر حرفِ تعریف ہے جسے علیٰحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مثلاً مولَ (molla) (مؤنث) کا مفہوم ہے (کوئی خاص) سیب (the apple) لیکن مْولا (mollë) کے معنی فقط ''سیب'' (apple) ہیں۔ فعل میں ذیل کے 'وجوہ' (moods) ہوتے ہیں: ناقص، مضارع، شرطیہ، تمنّائی، امرونہی اور نیم مجہول اور ایک مرکبّ 'وجہ' بھی جسے ''وجہِ'' تحسین وتعجّب (admirative) کہتے ہیں۔

۲- **ادبیات:** تیسری صدی عیسوی سے کلیساے روم کی طرف سے سقوطری واقع شمالی اَلبانیا میں ایک اُسْقُفِیّہ (bishopric) قائم ہے۔ یہ شہر اَلبانیا کا پہلا ثقافتی مرکز بن گیا؛ اس کی شہادت میں اُسقُف جان بُزَک (John Buzak) کی مرتّب کی ہوئی کتابِ نماز (Liturgy) کو، جو ۱۵۵۵ء میں مرتّب ہوئی، اور سترھویں صدی میں بُودی (Budi)، بَرْدی (Bardhi) اور بوْغْدانی (Bogdani) کی مذہبی تصانیف کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ ادبی سرگرمی جس سے شمال کے کیتھولک علاقے میں تُرک رواداری برتتے رہے مرکز کے اسلامی اور جنوب کے راسخ العقیدہ (Orthodox) خطّے میں دبا دی گئی، لیکن اس ادب نے ان نو آبادیوں

میں جنھیں اَلبانوی تارکینِ وطن نے صِقلّیہ اور قلّورِیہ میں قائم کیا تھا جڑ پکڑ لی۔ ان نو آبادجلاوطنوں کی اولاد میں سے مَتْرَنْگا نامی ایک شخص نے منظوم مناجاتیں لکھنے کی طرح ڈالی، جن میں اس نے لوک گیتوں کے اوزان استعمال کیے (۱۵۹۲ء)۔ اس روایت کو برانکاتو (Brancato؛ ۱۶۷۵-۱۷۴۱ء) اور قلّورِیہ کے وارِی بُونبا (Variboba؛ پیدائش ۱۷۲۵ء) نے جاری رکھا۔ اَلبانیا کی تحریکِ آزادی کے پُرجوش رہنما دَرادا (De Rada؛ ۱۸۱۳-۱۹۰۳ء) کے لوک گیتوں اور جوشیلے مبالغہ آمیز قطعاتِ ادبی نے اس تحریک کو دنیوی، غیر مذہبی رنگ دے دیا اور اس کے بعد بھی یہ تحریک زِف سْکِیرْو (Zef schiro؛ ۱۸۶۰-۱۹۲۷ء) کے ہاتھوں، جو صِقلّیہ میں پیدا ہوا اور جس نے دو مثالی (allegorical) رزمیہ نظمیں لکھنے کے علاوہ لوگ گیت بھی جمع کیے ہیں، موجودہ صدی میں بھی خاصی دیر تک جاری رہی۔

دَرادا (de Rada) کے کام سے متأثّر ہو کر طْوسْقہ کے تین محبّانِ وطن بھائیوں عَبْدِیل، سامی اور نَعیم فْرَاشَرِی نے ۱۸۷۸ء میں پْرِزْرِنْد (Prizrend) میں ایک انجمن قائم کی۔ سان سْتِیفانْو کے معاہدے سے تقویت پا کر انھوں نے اَلبانیا کے داخلی استقلال اور ادبی آزادی کا مطالبہ کیا۔ استانبول میں برسوں سرگرم عمل رہنے کے بعد، جہاں ان کے ساتھ کْرِسْتوفْورِدِی (Kristoforidhi؛ ۱۸۲۷-۱۸۹۵ء) بھی جو مترجم انجیل اور لغت نویس تھا، شامل ہو گیا، انھیں مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ بُخارِسْٹ میں سیاست دان عَبْدِیل، ماہرِ تعلیم سامی اور پیکتاشی شاعر نعیم نے، جس کے غزلیہ اشعار اشتیاقِ وطن کے درد سے پُر ہیں، مل کر ایک ادبی انجمن قائم کی اور ۱۸۸۵ء سے اَلبانوی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔ تھِیمی مِتْکو (Thimi Mitko) اور سپِیرو دِینہ (Spiro Dine) نے، جو مصر میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، اَلبانویوں کی مقامی نوآبادی سے لوک گیت جمع کیے۔ صوفیہ میں عَبْدِیل کے بیٹے مِدْحَت فْرَاشَرِی نے ایک جنتری، نظموں کا ایک مجموعہ اور ایک رسالہ شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس نے پند آمیز مقالے اور مختصر اخلاقی کہانیاں بھی لکھیں۔ جو کتابیں جلاوطنی میں لکھی جاتیں انھیں قافلوں کے ذریعے اَلبانیا پہنچا دیا جاتا تھا۔

کسی ادبی مرکز اور معیاری ابجد کا نہ ہونا اس تحریک کے لیے رکاوٹ کا سبب بن گیا، چنانچہ سامی کے مشکل صوتی ہجوں (phonetic spelling) کو ایک قسم کے دوحرفی (digraphic) ہجوں سے بدل دیا گیا [digraphic یعنی دو حرف جن سے ایک آواز حاصل ہو جیسے ch=چ، sh=ش] یہ طریقہ [قلّورِیہ] کے باشندے سَینْتوری (A. Santori) اور صِقلّیہ کے ماہرِ لسانیات کمارِدا (Dh. Camarda؛ ۱۸۲۱-۱۸۸۲ء) کے طریقے سے ملتا جلتا تھا۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں خودمختاری حاصل ہو جانے کے بعد یہ مختلف ادبی دھارے باہم مل گئے۔ دْرِینْوَا (A. Drenova؛ پیدائش ۱۸۷۲ء)، طوسقہ کا غزل گو بُبانی (Bubani) اور پورادِیشی (L. Poradeci؛ پیدائش ۱۸۹۹ء) تینوں نے بخارسٹ کی روایت کو قائم رکھا؛ گو پورادِیشی نے اپنے لیے مخصوص غیر رسمی اسلوب اختیار کیا۔ شمالی کیتھولک علاقے کے نمائندے یہ تھے: دیوانہ یادِ وطن شِرُوکا (F. Shiroka؛ ۱۸۴۷-۱۹۱۷ء)، ماہرِ لسانیات اور مؤرّخ زانونی (A. Xanoni؛ ۱۸۶۳-۱۹۱۵ء)، مُیِیدَہ (N. Mjeda؛ ۱۸۶۶-۱۹۳۷ء)، ہجو گو فِشْتَہ (Gi. Fishta؛ ۱۸۷۱-۱۹۴۰ء)، عوامی شاعر اور مرثیہ گو پْرُوشی (V. Prennushi؛ ۱۸۸۵-۱۹۴۶ء) اور افسانہ نویس کولِکی (E. Koliqi؛ پیدائش ۱۹۰۳ء)۔ طوسقہ کے ناول نگار فوکیون پوسْتُولی (Foqion Postoli) اور گْرامینو (M. Grameno؛ ۱۸۷۲-۱۹۳۱ء)، طوسقی تمثیل نگار کرستوفلوْرِی (Kristo Floqi؛ پیدائش ۱۸۷۳ء) اور کونتزا (F. Kontiza؛ ۱۸۷۵-۱۹۴۳ء) نے اپنی سرگرمیاں ریاستہائے متّحدہ امریکہ کے شہر بوسٹن میں منتقل کر لیں اور یہاں وَترا (Vatra) کے نام سے ایک ادبی مجلس اور ایک رسالے بنام دِیلّی (Dielli) (''سورج'') کی بنیاد رکھی۔

فسطائی حکومت کی مختصر سی مدّت (۱۹۳۹-۱۹۴۳ء) میں چند ایسے مصنّف بھی اس ادبی تحریک کی جانب متوجّہ ہو گئے جن کے میلانات اطالیہ کی طرف تھے؛ موجودہ اشتراکی دورِ حکومت میں حزبی (partisan) تحریک، طبقاتی کشمکش، کدّوعمل اور امن کے موضوعات پر لکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ درسی کتابیں روسی نمونوں کے مطابق ہیں۔ یہاں تین پُررونق تھیٹر ہیں اور مصنّفوں کی ایک یونین۔ اسی قسم کی ادبی سرگرمی قوصوہ-ہتوہیہ (Kosovo-Metohija) میں بھی پائی جاتی ہے، جہاں کے اشتراکی موضوعات میں ٹیٹو (Tito) کا اثر نمایاں ہے۔

۳-جغرافیہ: اَلبانیا (شْقِپْنِی (Shqipni)، شْقِپاریِ (Shaqipëri) گرینچ سے ۲۰ درجے مشرق میں ایک شمالی-جنوبی محور پر واقع ہے۔ یہاں کا کل رقبہ ۱۱,۰۹۷ مربّع میل (۲۸,۷۴۸ مربّع کیلومیٹر ہے) [قب وِٹکر ۱۹۶۱ء، ص ۸۳۰ اور *Statesman's Year Book*, 1930 جہاں رقبہ اس سے کم بتایا ہے] اور یہ یوگوسلاویا، یونان اور بحیرۂ ایڈریاٹک [آدریاتیق] سے محدود ہے۔ یہ شمالی عرض البلد ۳۹ درجہ ۳۸ دقیقہ اور ۴۰ درجہ ۴۱ دقیقہ کے درمیان واقع ہے اور اس کی کل لمبائی ۲۰۷ میل ہے، پِشکوپی (Peshkopi) کے مقام پر اس کی چوڑائی گھٹ کر صرف پچاس میل رہ جاتی ہے اور جھیل پُرِیسبہ خورد (Little Presba) کے قریب بڑھ کر ۹۰ میل ہو جاتی ہے۔ اس کی دس اصلی ایالتوں (prefectures) میں پہلے کل ۳۹ فرعی ایالتیں (sub-prefectures) تھیں۔ اب اس سارے علاقے کو ۳۲ حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، جو اضلاع کہلاتے ہیں اور جن کے نئے نام رکھ دیے گئے ہیں۔ اس علاقے سے دیناری (Dinaric) اَیلْپس کا سلسلہ گزرتا ہے، جو چونے کے پتھر سے بنا ہے۔ مشرق میں یہ خطّہ اپنی انتہائی بلندی کو پہنچ جاتا ہے اور کہیں کہیں اس کی اونچائی تقریباً سات ہزار فٹ ہو گئی ہے۔ مغربی نشیبی علاقوں میں، جن میں سے بعض سطحِ بحر سے

بھی نیچے ہیں، سب سے بڑا زرخیز میدان موزاکہ (Myzeqeja) ہے۔ یہاں کا سب بڑا دریا دُرِیْن (Drin) جھیل اوْخْرِی (Ochrida/Ohri) سے نکلتا ہے اور شمال مغرب سے جنوب مغرب کی سمت میں بہتا ہوا شِنْگِین (Shengjin) کے قریب بحیرۂ ایڈریاٹک میں جا گرتا ہے۔ دوسرے دریا ماط (Mat)، اِشِم (Ishém)، اَرزِین (Arzén)، ہَسْمِین۔ داوول۔ بِرات (Semén-Devoll-Berat) اور وِیوسہ (Vijöse) عام طور پر شمال مغرب کی جانب بہتے ہیں لیکن شْقُومْبِی (Shkumbi)، جو موسمِ سرما میں تیز بہنے والی پہاڑی ندی بن جاتی ہے، تقریباً مشرق سے مغرب کی جانب بہتی ہے اور ملک کے سارے رقبے کو تقریباً دو برابر حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے، جو گِیغْنِیہ (Gegnija) اور طوسْقِریہ (Toskërija) کے نام سے موسوم ہیں۔

بلند پہاڑوں کے گھٹے ہوئے مجموعے میں گِیغْنِیہ کے اندر شمالاً جنوباً تین راہ بند سدّیں ہیں اور طوسْقِریہ میں یہ مجموعہ شمال مغرب سے جنوب مشرق کے رخ چار متوازی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ سب سے بلند پہاڑ بِرات کے قریب تومور ہے (۲۳۹۶ میٹر = ۷۸۶۱ فٹ)۔ سطح کی مٹی کے بہہ جانے اور جنگلوں کے غائب ہو جانے کے باعث یہ علاقہ بے درخت اور سنگلاخ نظر آتا ہے۔ (شقودرْ Shkodër، سقوطری)، اوْخْرِی اور پُرِسْبہ کی جھیلوں کا صرف ایک حصّہ ہی اَلبانیا میں ہے۔ وسطی میدان کی جھیل تَرْبُوف (Tërbuf) محض دلدل ہے۔ جھیل مالک کو، جو کُوْرچہ سے نیچے ہے، خشک کر دیا گیا ہے۔

دِراچ (Durazzo, Durrës) یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، جس میں جہازوں کی گودیاں ہیں اور جہاز سازی کا کارخانہ ہے؛ آوْلُونِیہ (Valona) نہایت خوبصورت، قدرتی بندرگاہ ہے۔ یہاں سے صاف کیے ہوئے تیل اور رال (bitumen) وغیرہ کی برآمد ہوتی ہے۔ سَرانْدَہ ماہی گیروں کی بندرگاہ ہے اور شِینْگِین (Shëngjin) میں خام دھاتوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے نام حسبِ ذیل ہیں: تِیرانَہ (Tiranë)، صدر مقام ہے (آبادی ایک لاکھ)، شقودرْ (سقوطری؛ ۳۵ ہزار)، کورِیچہ (۲۵ ہزار)، دِراچ (Durrës؛ ۱۶ ہزار)، وْلُورَہ یا آوْلُونِیہ (۱۵ ہزار) اور گِینوقَسْتِر (Gjinokastër) یا گِیرُوقَسْتَر (Gjirokastër؛ بارہ ہزار)۔ ریلوے لائن، جس کی لمبائی تقریباً ۸۰ میل ہے، تِیرانَہ کو دِراچ، پِکِین (Peqin) اور اِلْبَصَان (Elbasan) سے ملاتی ہے لیکن زیادہ تر شہروں کے درمیان مواصلات کا ذریعہ سڑکیں ہیں۔

آب و ہوا بلند مقامات پر تو یورپ کی طرح ہے اور جنوب مغرب میں نیم حارّ (sub-tropical)۔ نباتات بحیرۂ روم کے اَور علاقوں کی سی ہے۔ یہاں کے جنگل زیادہ تر برگ ریز (deciduous) قسم کے ہیں اور ان میں آلوش (hornbeam)، بلّوط رومی (Turkey oak)، سُمّاق (sumach)، اَوِیلائی (avellan) بلّوط، امریکی سدا بہار بلّوط (holm oak)، عنّاب، النَّشَم الابیض (celtis) وغیرہ کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ دامنِ کوہ کی جھاڑیوں میں قَطْلَب (arbutus)، پتاور (bush heather)، انار اور عرعر (juniper) شامل ہیں۔ سب سے زیادہ گھنے جنگل قُرُوِیہ (Kruya) کے نزدیک مَمُورَس (mamuras) میں ہیں۔

مآخذ: (۱) M. Lambertz: *Albanisches Lesebuch*، حصّۂ اوّل و دوم (اَلبانوی گرامر، متون اور ان کے جرمن ترجمے)، لائپزگ ۱۹۴۸ء؛ (۲) S. E. Mann: *Albanian Literature, An Outline of Prose, Poetry and Drama*، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۳) وہی مصنّف: *A Short Albanian Grammar*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۴) وہی مصنّف: *An English-Albanian Dictionary*، کیمبرج ۱۹۵۷ء؛ (۵) S. Skendi: *Albania (Statistical, Historical, Political,* etc.)، نیویارک و لنڈن ۱۹۵۷ء۔

۴۔ آبادی: ۱۹۵۵ء کی سرشماری کے مطابق اَلبانیا کی آبادی ۱۳,۹۴,۳۱۰ تھی (۱۹۳۰ء میں آبادی ۱۰,۰۳,۰۹۷ تھی)۔ اَلبانیا کے باہر اَلبانوی مندرجۂ ذیل ملکوں میں آباد ہیں: یوگوسلاویا میں (۱۹۴۸ء کی سرشماری کے مطابق ۷,۵۰,۰۰۰)، یونان میں (اندازہ ہے کہ تیس اور ساٹھ ہزار کے درمیان ہیں)، اطالیہ میں (ڈیڑھ لاکھ اور ڈھائی لاکھ کے درمیان)۔ ساری دنیا میں پیدائشی اَلبانویوں کی تعداد ۳۰ لاکھ کے قریب ہے (دیکھیے *Albania*، طبع S. Skendi، نیویارک ۱۹۵۶ء، ص ۵۰)۔ ۱۹۳۰ء کی سرشماری کے مطابق اَلبانیا میں ۴۵ ہزار اِفلاق (Vlachs)، ۳۵ ہزار سْلاوْ [صقلابی]، ۲۰ ہزار ترک اور ۱۵ ہزار یونانی آباد تھے۔ ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں اَلبانیا کی کل آبادی کا ۲۰ فی صد حصّہ شہروں میں آباد تھا۔ اسی سال نسبۃً بڑے شہر یہ تھے: تِیرانَہ، اَلبانیا کا صدر مقام، جس کی آبادی کا اندازہ ۸۰ ہزار تھا (۱۹۳۰ء میں آبادی ۳۰,۸۰۶ تھی [قَپ وِیْکَر، ۱۹۶۱ء: پچاس ہزار])؛ شْقودَر (سقوطری) ۳۴ ہزار، کورچہ [کوریچہ] ۲۴ ہزار، دِراچ ۱۶ ہزار، اِلْبَصَان ۱۵ ہزار، وْلُورَہ ۱۵ ہزار، بِرات ۱۲ ہزار، گِینوقَسْتِر (Gjinokaster) ۱۶ ہزار۔

اَلبانوی لوگ نسلی اعتبار سے دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں: گیغہ [یا گیغقہ] Gegs، جو دریائے شْقُومْبِی کے شمال میں آباد ہیں اور طوسْقہ (Tosḳs)، جو اس دریا کے جنوب میں رہتے ہیں۔ ترکوں نے ان دو منطقوں کا نام گیغہ لِق (Gegalĭk) اور طوسقہ لِق رکھا۔ گیغہ صرف اپنی بولی ہی میں نہیں بلکہ اپنے اندازِ نظر اور معاشرتی طرزِ عمل میں بھی طوسقوں سے مختلف ہیں۔ گیغوں کے متعلّق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طوسقوں کے مقابلے میں اپنی قومی خصوصیات کو زیادہ خالص رکھا ہے۔

عام طور پر اَلبانیا کے بنجر پہاڑوں کی پیداوار یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی، خصوصاً ایسے زمانوں میں جب وبا سے ان کے مویشی ہلاک ہو جاتے تھے تو ان بے کس لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا کہ وہ ہجرت کر جائیں یا قریبی میدانوں پر حملہ آور ہوں۔ وہ عموماً اجیر سپاہیوں، چرواہوں اور مزارعین کی حیثیت سے وطن سے باہر چلے جاتے تھے۔

چودھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب اَلبانوی لوگ صربیوں کے دباؤ کے تحت یا یونانی تیول دار سرداروں کے اجیر سپاہیوں کے طور پر اِپِیْر، تھسلی، مورہ بلکہ بحیرۂ ایجین کے جزیروں میں بھی جا کر آباد ہو گئے۔ یہاں اکثر اَلبانوی بتدریج یونانی رنگ میں رنگ گئے یا آگے چل کر ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے جنوبی اطالیہ کے علاقوں میں چلے گئے، لیکن ۱۴۶۶ء کے قریب تک بھی تھسلی کے شہروں میں اَلبانویوں کے کئی خِطّے تھے اور اسی طرح لِوادِیَہ (Lebadea ، Livadia) میں ان کے ۲۴ قَتُون (Ḳatunes) تھے اور اِستیفا میں ۳۴ (دیکھیے H. Inalcik: *Fatih Devri*، انقرہ ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۶)۔ عثمانیوں کے دورِ حکومت میں ان 'قتونوں' کی خاص حیثیّت تھی اور اس کے بعد کے زمانے میں انھیں آرماتولوس (armatols) کا نام دیا گیا۔

جب ۱۴۶۸ء میں اسکندر بیگ مرا تو بہت سے اَلبانوی، جو اس کے ساتھ ہو کر عثمانیوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے، یا تو پہاڑوں میں جا کر اقامت گزین ہو گئے یا پھر مملکت نیپلز (Naples) میں ہجرت کر گئے۔ ۱۴۷۸ء، ۱۴۸۱ء اور ۱۴۹۲ء میں بہت سے اور اَلبانوی جنوبی اطالیہ اور صِقِلِّیَہ کی طرف ہجرت کر گئے، جہاں انھوں نے اپنی زبان اور رسم و رواج کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں عثمانی حکومت نے بعض اَلبانوی تیمارداروں کو [دیکھیے تیمار]، جو تیماری گھرانوں (مُزِیْرَکی (Mazeraki) اور ہِیْکَل (Heykal) سے تھے، طرابزون میں منتقل کر دیا۔

اَلبانیا میں ترکوں کی کسی بڑی نوآبادی (مستعمرہ) کا ذکر نہیں آتا، البتہ قونیہ کے چند جلاوطن یہاں آباد ہو گئے تھے، جنھیں مقامی طور پر 'قونیچی' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں قُوجہ جِیْک کے یورُوک [خانہ بدوش ینی (یکی چری) فوج کا سپاہی] بھی دِبْرَہ کے مشرق میں پہاڑوں پر موجود ہیں، جہاں غالباً انھیں بظاہر اس غرض سے آباد کیا گیا تھا کہ وہ رُوم ایلی سے اَلبانیا جانے والی شاہراہ کی حفاظت کریں۔ وہ 'سُورگُوں' (Sürgüns، جلاوطن لوگ) بھی، جو تقریباً ۱۴۱۰ء میں اناضول کے بعض حصّوں، مثلاً صاروخان، قوجہ ایلی، جانِیک وغیرہ سے بھیجے گئے تھے، تعداد میں بہت کم تھے (دیکھیے *Sûret-i Defter-i Sandjâk-i Arvanid*، اشاریہ)۔

رُوم اِیلی میں اَلبانوی آبادی کی دوسری اہمّ افزائش سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں ہوئی۔ وہ آکر یاقُوَہ (Djāḳovë)، پِرِزْرِیْن (Prizren)، اِیپِک (Ipek)، پِیچ (Peč)، قالقان دِلِن (Kalḳandelen)، تِیتُوہ (Tetovo)، اور قُوصْوَہ کے میدانوں میں آباد ہو گئے، بالخصوص اُس وقت جب ۱۶۹۰ء میں ان علاقوں سے صربوں کی عمومی ہجرت واقع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اَلبانویوں کی یہ آبادکاری زیادہ تر مقاطعۂ اراضی کے نظام کا نتیجہ تھی (دیکھیے میرا [مقالہ نگار کا] مقالہ *Tanzimat nedir?*، در *Tarih Araştırmaları*، انقرہ ۱۹۴۲ء) جو اس زمانے میں وہاں رائج تھا۔ اَلبانویوں نے ان زرخیز میدانوں میں آکر بڑے بڑے مقاطعہ داروں سے چھوٹے چھوٹے قطعاتِ زمین پٹے پر لے لیے اور یہاں مستقل طور پر اجارہ داروں کی حیثیت سے آباد ہو گئے۔

باقی رہے وہ اِفْلاق (Vlachs) جو اَلبانیا میں ہیں، تو وہ سلاویوں کے ساتویں صدی والے حملے کے بعد سے شمالی اَلبانیا کے پہاڑوں میں، اَلبانویوں کے پہلو بہ پہلو، چرواہوں کی زندگی بسر کرتے چلے آئے تھے اور گیارھویں صدی سے وہ اَلبانیا کی توسیع میں حصّہ لیتے رہے۔ ۸۳۵ھ/ ۱۴۳۱ء کے عثمانی دفتر (رجسٹر) کے مطابق اِفْلاق (Vlachs) اور ان کے 'قَتُون'، ('اِفلاق قَتُونْ') جنوبی اَلبانیا میں موجود تھے، بالخصوص اس علاقے میں جو قانینہ (Kanina) کے مشرق میں واقع ہے۔

دریاے دُرِین (Drin) کے شمال میں جو اَلبانوی قبائل ہیں ان کا عام اصطلاحی نام ''مالِی سُوْر'' (پہاڑی) ہے۔ ۱۸۸۱ء کے قریب اس گروہ کے کوئی انیس قبیلے تھے، جن میں تقریباً پینتیس ہزار رومن کیتھولک، پندرہ ہزار مسلمان اور ۲۲۰ کلیساے شرقی کے متّبع (Greek Orthodox) تھے۔ ان میں مشہور ترین قبائل یہ تھے: ہوتی (Hotti)، قْلِیْمِیْنْتِی (Klementi)، شُقْرِیلی (Shkreli)، قَسْتْراتِی (Kastarati)، قوچای (Koçaj) اور پُلاتی (Pulati)۔ یہ لوگ سقوطری کے مشرق میں پہاڑوں پر رہا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اَلبانیا کی عثمانی فتوحات کے دوران میں، جو ۱۳۸۵ء سے شروع ہو کر پندرھویں صدی کے آخر تک جاری رہیں، سرکش اور باغی قبائل کو پھر ایک بار اس کوہستان کے نہایت ہی دشوار گزار سنگلاخ علاقے میں واپس جانا پڑا، لیکن سترھویں صدی عیسوی میں جب سلطنتِ عثمانیہ کی گرفت ولایات میں کمزور پڑ گئی تو یہ لوگ پھر نشیبی علاقے میں آ گئے اور بعد میں ''صوبۂ رُوم اِیلی کے لیے بلاے جان'' بن گئے۔

ابتدا ہی سے حکومتِ عثمانیہ ان قبیلوں کے قبائلی نظام اور ان کی خود اختیاری کا احترام کرنے پر مجبور رہی۔ چونکہ روم اِیلی سے اَلبانیا آنے والے اہمّ پہاڑی درّوں پر ان کا قبضہ تھا اس لیے حکومت نے ان درّوں کی نگہبانی انھیں کے سپرد کر رکھی تھی اور ان خدمات کے عوض ان کے تمام محصول معاف کر دیے تھے۔ ایک ضابطے مؤرّخہ ۱۴۹۶ء (*Başbakanlık Archives, Istanbul, Tapu Def.*، عدد ۲۶) کے الفاظ یہ ہیں: ''ناحیۂ قْلِیْمِیْنْتِی (Klementi) میں پانچ گاؤں ہیں۔ اس کے عیسائی باشندے سنجاق بیگی کو ایک ہزار 'آقْچَہ' خراج اور 'اِسْپِنْجَہ' کے ایک ہزار 'آقْچَہ' دیتے ہیں۔ 'عُشر'، 'عوارضِ دیوانی' اور دوسرے لگان انھیں معاف ہیں، لیکن انھیں ذیل کے راستوں کا ''دِرْبِندجی (پہاڑی درّوں کے محافظ)'' مقرّر کیا جاتا ہے: سقوطری -o- علاقہ پِتْرِشْبَان -o- آلتون اِیْلِی؛ اسی طرح مِدُوْن -o- کُوْچَہ -o- پلاوا''۔ اس کے بعد سترھویں صدی میں قبیلۂ قْلِیْمِیْنْتِی نے رُوم ایلی میں تاخت و تاراج کر کے آفت برپا کر دی اور مونٹی نیگرو (قرہ طاغ) کے باغیوں سے تعاون کر کے بڑی زحمت کا باعث بن گئے۔

دریاے دُرِین کے جنوب میں ایک قبیلہ مِرْدِیْتا (Mirditë) نامی آباد تھا، جس کے افراد کی تعداد (۱۸۸۱ء میں) ۳۲ ہزار کے قریب تھی اور یہ سب کیتھولک تھے۔ یہ قبیلہ پانچ خاندانوں میں منقسم تھا، جنھیں 'بَیْرَق' کہتے تھے، یعنی:

اَوْرْوْشِی (Oroshi)، فانْدِی (Fândi)، سْپَشِی (Spashi)، کُشْنِینِی (Kushneni) اور دِبْرِی (Dibri)۔ ۱۶۹۶ء میں اہلِ وَیْنِس کے خلاف عثمانیوں کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دینے کے صلے میں خانوادۂ ہوتی (Hotti) کو ان خاندانوں میں تقدّم کا مرتبہ دیا گیا اور اُن کا 'بَیْرَق' دوسرے 'بیرقوں' کا سرگروہ بن گیا، لیکن آج کل شالَہ (Shalë) قبیلے کو اوّلیّت حاصل ہے۔

قبائلی روایات کے مطابق 'بیرقوں' کی ابتدا عثمانیوں کے عہد میں ہوئی۔ درحقیقت عثمانی ترکوں کا یہ دستور تھا کہ فوجی سرداروں کو قوّت واقتدار کی علامت کے طور پر ایک 'بَیْرَق' یا 'سَنْجاق' [پرچم] دے دیا جاتا تھا۔ ہر خاندان ایک 'بیرق دار' بمعنی عَلَم بردار کے ماتحت ہوتا تھا جو اس خاندان کا موروثی سردار ہوتا تھا۔ خاندان کے عام معاملات موروثی بزرگوں کی مجلس میں طے پایا کرتے تھے۔ امورِ عامّہ پر بحث وتمحیص کے لیے پانچوں خانوادوں کی ایک مجلس ہر سال اوروش (Orosh) میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ عثمانی والی کی جانب سے ایک 'بُولُوک باشی (bölük-bashi) مقرّر ہوا کرتا تھا، جو خانوادوں اور ادارۂ حکومت کے درمیان ہر قسم کے معاملات کا بندوبست کرتا تھا۔ قبیلہ مِرْدِیْتا کے پانچ سرداروں کا یہ دعوٰی تھا کہ وہ لِیکا دُوْقَہ گِیْن (Lekë-Dukagjin) کی اولاد میں سے ہیں، جس نے عثمانیوں کے خلاف اسکندر بیگ کی جنگ میں نمایاں کارنامے انجام دیے تھے۔ دُوْقَہ گِیْن کے متعلّق یہ بھی خیال ہے کہ اس نے قبائل کے قانونِ رواج کو مدوّن کیا، جسے ''قانونِ لِیکا دُوْقَہ گِیْن'' کہتے ہیں (A.Sh.K. Gječov: *Kanuni i Lekë Dukagjinit*، شْقودَرْ ۱۹۳۳ء)۔

یہ قبیلے عثمانی فوج کے لیے امدادی فوج مہیّا کیا کرتے تھے، جس میں ہر گھر سے ایک فرد شامل ہوتا تھا۔ اس عثمانی دستور کی پابندی یوروکوں اور کُردوں کو بھی کرنا پڑتی تھی۔ جب سولھویں صدیں کے آخر اور اس سے بعد کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ کو اپنی طویل جنگوں کی وجہ سے زیادہ سپاہیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اَلبانوی امدادی افواج کو روز افزوں اہمیّت حاصل ہونے لگی۔ انھیں خصوصاً قرہ طاغیوں (Montenegrians) کے خلاف مقامی جنگوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ روم ایلی میں قبیلۂ مِرْدِیتا کے لوگوں کو سب سے زیادہ بہادر سپاہی سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اِیکارْ (H. Hequard؛ ۱۸۵۵ء) انھیں ''دنیا کے سب سے بڑے لٹیرے'' کہتا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں جب ادارۂ تنظیمات نے انھیں غیر مسلّح کر کے باقاعدہ فوج میں بھرتی کر لینے کی کوشش کی تو انھوں نے بغاوت کر دی اور زادْرِیْمَا (Zadrimë) کے علاقے پر ٹڈی دل کی طرح چھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے سال حکومت نے یہ کوشش ترک کر دی۔ بعد میں قبیلۂ مِرْدِیتا کے سردار پْرِنْکْ بِبْ دْدہ (Prenk Bib Doda) نے ۱۹۰۸ء کی تحریکِ آزادیِ اَلبانیا میں اہم حصّہ لیا، جمہوریۂ مِرْدِیتا یوگوسلاویا کی سرپرستی میں ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی، مگر اگلے ہی سال ختم ہوگئی۔

۵- مذہب: ۱۹۴۲ء کے اطالوی اعداد و شمار کے مطابق (دیکھیے *Albania*، طبع سْکِنْدِی S. Skendi، ص ۵۸) ۱۱,۲۸,۱۴۳ کی کل آبادی میں سے ۷,۷۹,۴۱۷ مسلمان تھے، ۲,۳۲,۳۲۰ آرتھوڈوکس [کلیساے مشرق کے پیرو] عیسائی اور ۱,۱۶,۲۵۹ کیتھولک عیسائی، ایک ہی اہم کیتھولک گروہ شْقودَرْ (سقوطری) کے ضلع میں آباد ہے، گو بڑے بڑے آرتھوڈوکس گروہ اضلاع گْیِینوْقَسْتَر (Argyrokastro؛Gjinokastër)، کورچِہ (کورریجہ Kōrice)، بِیرات (Berat) اور وْلْوِر (آوْلْوِنیَہ Avlona) میں رہتے ہیں۔ مسلمان یوں تو پورے ملک میں پھیلے ہوے ہیں، لیکن ان کی سب سے زیادہ تعداد وسطی اَلبانیا میں ہے۔

اَلبانیا، جو ۷۳۲ء میں قسطنطینیہ کی بطریقی (Patriarchate) سے ملحق ہو گیا تھا، اسے ۱۰۵۴ء میں روما اور قسطنطینیہ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، اس طرح کہ شمالی حصّہ روما کی حدِّ نظامت میں آ گیا۔ نارمنوں اور اینجو والوں (Angevins) سے ملک میں کیتھولک مذہب کو تقویت پہنچی؛ اَنْتیواری (Antivari) اَلبانیا کے اور دِراچ مقدونیا کے اُسْقُفِ اعظم کا صدر مقام تھا۔

اَلبانیا کے آرتھوڈوکس عیسائی براہِ راست اوخری (Ohrida) کی اسقفی کے ماتحت تھے۔ عثمانی ترکوں نے ۱۴۵۴ء میں قسطنطینیہ کی بطریقی کو بحال کیا؛ مگر اس سے پہلے بھی کیتھولک مذہب کے مقابلے میں وہ آرتھوڈوکس فرقے کی حمایت زیادہ کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی حیثیت آرتھوڈوکس کلیسا کے محافظ کی تھی؛ تاہم سیاسی اغراض کے تحت بابِ عالی نے اَلبانیا میں کیتھولک کلیسا سے بھی رواداری ہی برتی۔ اَلبانوی امرا سیاسی حالات کے مطابق مشرق اور مغرب کے درمیان مذبذب رہتے تھے۔ ان آرتھوڈوکس اَلبانویوں کا، جو جنوبی اطالیہ میں ہجرت کر گئے تھے، اپنا علیٰحدہ (Uniate) کلیسا تھا جو پاپاے روم کی سیادت تسلیم کرتا تھا۔ ۱۸۹۵ء کے عثمانی سالنامے کے مطابق صوبۂ یانیہ (Yania) اِیپِیر (Epirus) اور اَلبانیا کے اس علاقے میں جو دریاے داوْوْل (Devoll) کے جنوب میں واقع ہے) ۲,۲۳,۸۸۵ مسلمان، ۱,۱۸,۰۳۳ یونانی، ۱,۲۹,۵۱۷ آرتھوڈوکس اَلبانوی، ۳,۵۱۷ یہودی اور صرف ۹۳ کیتھولک تھے۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ان یونانیوں میں سے بعض اصل میں آرتھوڈوکس تھے، جو اُن یونانی مذہبی اور تعلیمی اداروں کی بدولت جنھیں اٹھارھویں صدی کے نصف ثانی ببعد میں بڑے جوش واہتمام سے قائم کیا گیا تھا، یونانی مآب بن گئے تھے۔ اَلبانیا کی خودمختاری کے بعد آخرِ کار ۱۹۳۷ء میں قسطنطینیہ کے بطریق نے اَلبانیا کا ایک خودمختار کلیسا تسلیم کر لیا۔ وہ لوگ جو سب سے پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوے اَلبانیا کے تِیماری امرا تھے، جنھیں حکومتِ عثمانیہ کی طرف سے تِیمار عطا ہوے تھے۔ عام خیال کے برعکس، انھیں اپنی زمینیں بطورِ تِیمار رکھنے کے لیے تبدیلِ مذہب کی ضرورت نہ تھی، بلکہ تِیمار حاصل کرنے کے لیے صرف حکومتِ عثمانیہ سے وفاداری ہی کافی تھی۔ چنانچہ پندرھویں صدی میں عیسائیوں کو برابر تِیمار ملتے رہے، مگر پندرھویں صدی کے آخر تک بہت ہی کم عیسائی تیماردار باقی رہ گئے، کیونکہ بہت سے لوگ برضاء و رغبت خود مسلمان ہو گئے۔ اِیْلْبَصَان، جسے محمد ثانی نے ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء میں تعمیر کرایا، ابتدا ہی سے تھسلی کے ینی (یکی) شہر کی طرح، اسلامی مرکز بن

چکا تھا؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام یا 'رعایا' میں سے صرف معدودے چند ہی آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ سولھویں صدی کے شروع میں اَلبانیا کے چار سَنْجاقوں (اِیْلْبَصَان، اُوْخری، آوْلُونِیَہ اور اسکندریہ) میں مسلمان 'رعایا' کے تقریباً تین ہزار خاندان تھے۔ کیتھولک مآخذ میں، جو ۱۶۲۲ء کے حدود میں لکھے گئے، یہ انداز کیا گیا ہے کہ اَلبانیا کی کل آبادی میں سے صرف تیسواں حصّہ مسلمان ہے۔ سترھویں صدی کے شروع میں اہلِ آسٹریا اور اہلِ وَیْنِس نے کیتھولک اَلبانویوں اور آرتھوڈوکس صربیوں کو بغاوت پر ابھارنے کی کوشش کی، جو جزیے میں اضافے کی وجہ سے حکومت سے بگڑ گئے تھے۔ ۱۶۱۴ء میں زعماے کلیسا کے ایک اجلاس میں، جو قُوچِی میں منعقد ہوا، یہ قرار پایا کہ پاپاے روما سے امداد طلب کی جائے۔ ۱۶۲۲ء کے قریب سب سے پہلے فرانسیسکانی (Fransican) [راہب] مبلّغ اَلبانیا اور جنوبی صربیا میں وارد ہوے۔ ۱۶۴۹ء میں اَلبانیا کے کیتھولک عیسائیوں اور صربیوں نے اہلِ وینس سے تعاون کیا اور پھر ۱۶۸۹-۱۶۹۰ء میں آسٹریا والوں سے؛ جس کی بنا پر بابِ عالی نے ان لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے بچنے کے لیے پیچ (Peč)، پُرِزْرِیْن (Prîzren)، یاقوہ (Djakovë) اور قوصوہ (Kossovo) کے میدانوں کے عیسائی باشندے، جن میں سے کچھ اَلبانوی تھے، یا تو بڑی تعداد میں ہجرت کر گئے اور یا مسلمان ہو گئے۔ گو ان میں سے بہت سے لوگ دل سے عیسائی ہی رہے، جو مقامی طور پر "لارامانہ" (laramanë) (یعنی پچ رنگ) کہلاتے تھے۔ ان میدانوں میں [لوگوں کو] اَلبانوی رنگ میں ڈھالنے اور مسلمان بنانے [اسلام کی طرف بلانے] کا کام سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں بیک وقت جاری رہا۔

بُوشاتْلیوں اور تِپِہ دِلِن کے علی پاشا [رَکْ بآن] کے عہد میں قبولِ اسلام کی رفتار نئے سرے سے تیز ہوگئی۔ معاصر شاہدوں کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علی پاشا نے متعدّد گاؤوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود بِکْتَاشِی تھا اور اس کے زمانے میں اَلبانیا میں سلسلۂ بِکْتَاشِیّہ [رَکْ بآن] کو انتہائی ترقی حاصل ہوئی۔ شاہ زوگ (Zog) کے عہد میں اس سلسلے کے پیرووں کی تعداد کا اندازا دو لاکھ کے قریب تھا۔ بِکتاشیوں کے ان خوش حال 'تِکّوں' [تکیوں] کی بدولت، جو تِیرانہ (Tiranè)، آقچہ حصار (بکتاشیوں کا قدیم مرکز)، بِرات (Berat) اور کوہستان تُوْمُوْر میں تھے، نیز صدر مقام میں ان کے مرکزی ادارے کے سبب بکتاشی مذہب نے اَلبانیا میں بڑی اہمیّت حاصل کر لی۔ ۱۹۱۹ء میں جو مؤتمر (کانگرس) کوریجہ میں ہوئی اس میں بِکتاشیوں نے سنّیوں سے الگ ایک علٰیحدہ فرقہ بنانا چاہا لیکن ان کے اس ارادے کی تکمیل ۱۹۴۵ء میں اشتراکی عہدِ حکومت ہی میں ہوسکی۔

اَلبانویوں کو عثمانیوں کے رنگ میں رنگنے میں اسلام نے اہمّ حصّہ لیا۔ اَلبانیہ کے عیسائی اپنے مسلمان ہم وطنوں کو عموماً تُرک کہہ کر پکارتے تھے۔ دوسری طرف اسلام ہی کی وجہ سے اَلبانوی اپنے یونانی اور سلاو (Slavic) ہمسایوں میں جذب نہیں ہوسکے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں کے ملمّع کے نیچے اَلبانویوں میں، خصوصاً پہاڑی علاقے کے اَلبانویوں میں، ان کے ابتدائی مذہبی عقیدے باقی رہے۔

۶- تاریخ: یہ بات عام طور پر سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اہل اَلبانیا اِیلِیری (Illyrian) نسل سے ہیں، البتہ اس بات میں اب تک اختلافِ راے چلا آتا ہے کہ ان کا نسلی تعلّق اہلِ تراکیا (تھریس)، اہل ایپِیر (اِیپرس کے باشندوں) اور پِلاسجیوں (Pelasgians) سے کیا ہے۔ ایلیری قوم کے قبائل پہلے پہل ساتویں صدی قبل مسیح میں ان یونانی نوآبادیوں کے ذریعے جو اَلبانیا کے ساحلی علاقے میں قائم کی گئی تھیں یونانی تہذیب وتمدّن سے آشنا ہوے۔ ان میں سب سے بڑی نوآبادی دِراچ (Durrës = Durazzo) کے قریب اِیپی دَمْنُوْس (Epidamnos) کی تھی۔ ایلیریوں نے تیسری صدی ق م میں اپنا سب سے پہلا خودمختار سیاسی نظام قائم کیا۔ ۱۶۷ ق م میں انھیں رومیوں نے فتح کرلیا؛ پھر وہ صدیوں تک زبردست رومی اثر سے متأثّر رہے۔ رومیوں کے زمانے کی مشرق کو جانے والی شاہراہ، وِیا اِگناشیا (Via Egnatia)، دِراچ (Durrës = Dyrrachium) سے شروع ہوتی تھی اور وادی شُقُومبِی کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ سب سے پہلے بطلیموس ایلیریائی قبائل میں اَلبانویوں (Αλβανοι) اور ان کے پائے تخت اَلبانوپولیس (Αλβανόπολιζ) کا ذکر کرتا ہے جو قُرْوِیَہ (Croya) کے قریب تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب سلاویوں نے اَلبانویوں پر حملہ کیا تو اَلبانویوں کے رومی رنگ میں رنگ جانے کا خاتمہ ہوگیا اور وہ اَلبانیا کے شمالی پہاڑوں میں جا بسے اور وہاں کوئی پانچ سو برس تک راعیانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ نویں اور دسویں صدی میں مملکتِ بلغاریا نے اپنی حدودِ سلطنت کو جنوبی اَلبانیا تک، جس میں دراچ (Dyrrachium؛ یونانی Dyrrachion) بھی شامل تھا، توسیع دے لی اور بارھویں صدی کے تقریباً آخر میں اہل صربیا نے نِمَانْیا (Nemanja) کے ماتحت شمالی اَلبانیا پر قبضہ کرلیا۔ زراعت پیشہ سلاویوں کے ساتھ عرصۂ بعید تک باہم مل جل کر رہنے کے باعث اہلِ اَلبانیا پر سلاویوں کی طرزِ معاشرت کا بہت گہرا اثر پڑا۔ آخر الامر شہنشاہ باسِل ثانی نے جنوبی اَلبانیا میں بوزنطی حکومت دوبارہ قائم کی اور ۱۰۰۵ء میں دِراچ (Dyrrachion) کو فتح کرلیا، جو نویں صدی عیسوی سے بوزنطی صوبۂ (thema) دِراچ کا صدر مقام چلا آتا تھا۔ جب گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں صوبوں میں بوزنطی نظم وضبط میں کمزوری کے آثار پیدا ہوے تو اَلبانوی بھی اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل آئے۔ اس زمانے سے لے کر اَلبانویوں کا ذکر، جو زیادہ تر سقودرہ (Skodra = شُقُوْدَر Shkodër)۔ دراچ (Dyrrachin)، اُوْخْرِی و پُرِزْرِین (Ohrida-Prîzren) کے خطوط کے درمیان آباد تھے، ہم عصر مآخذ میں پہلے سے زیادہ نظر آتا ہے؛ یونانی میں اَلبانوای (Αλβανοι) یا آرْبانِتائی (Αρβανιται) کے نام سے، لاطینی میں Arbanenses یا Albanenses کے اور سلاوی مآخذ میں Arbanaci کے نام سے۔ عثمانیوں نے ان کے لیے پہلے یونانی طرز پر آرْوَانِیْد (Arvanid) کا نام استعمال کیا اور

اس کے بعد اس نام کی ترکی شکل اَرناوُوْد اور اَرناوُوْط نے رواج پایا۔

اَلبانیا گیارھویں صدی عیسوی کے بعد سے نظام جاگیرداری والے (feudal) یورپ کے لیے بوزنطی سلطنت پر حملہ کرنے کا مورچہ بن گیا۔ ۱۰۸۱ اور ۱۱۸۵ء میں دِراچ (Dyrrachion) پر عارضی طور پر نارمنوں نے اور ۱۲۰۴ء میں اہلِ وینس نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اِپِیر کا مطلق العنان حکمران تھیوڈور اینگیلوس (Theodore Angelus؛ ۱۲۱۵-۱۲۳۰ء) اس پر قابض رہا۔ ۱۲۷۲ء میں آنْژُو (Anjou) کا حکمران چارلس، دِراچ اور اَلبانیا کے سارے ساحلی علاقے پر قابض ہوگیا اور اس نے ''شاہ اَلبانیا'' کا لقب اختیار کر لیا۔ اس پر خاندانِ آنژو (Angevians) اور بوزنطی پادشاہوں کے درمیان ایک طویل جنگ چھڑ گئی۔

اناضول کے ترکوں کو بوزنطی شہنشاہ سے اتّحاد کی بنا پر اَلبانیا کا علم سب سے پہلے ۷۳۷ھ/ ۱۳۳۷ء میں ہوا۔ بوزنطی خانہ جنگی کے زمانے میں اَلبانوی کوہستانیوں کی دست درازیاں اَلبانیا میں بڑھ گئی تھیں۔ انھوں نے تیمُورُون (Timoron) یا تیمورِنْجَہ (Timoringdje) کو فتح کرلیا اور دیگر بوزِنطی مستحکم مقامات یعنی قانینہ، بلغراد (بِرات)، قُلِیسُورَہ (Klisura) اور اَسْقر اپار (Skarapar) کو خطرے میں ڈال دیا۔ اِپِیر اور اَلبانیا پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے آنْدْرَوْنِیقوس (Andronicus) ثالث [پالیولوغوس] نے اس صوبے میں لشکرکشی کی؛ اس کے لشکر میں ترکی امدادی فوج بھی شامل تھی۔ یہ فوج اس کے حلیف امور بیگ (Umur Beg) والیِ اَیدین نے بھیجی تھی۔ اس فوج نے دراچ تک کے تمام علاقے کو تاخت وتاراج کرڈالا۔ باغی پہاڑوں کی طرف پسپا ہوگئے اور انھیں ترکوں کے ہاتھوں بے حد نقصان پہنچا۔ ترک تسالیا [تھسلی] اور بےاُوشا (Boetia= قانتاقوزِنُوس Cantacuzenus) کے راستے اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ سْٹِیفان دُوْشان (Stephan Dushan) نے اَلبانیا پر قبضہ کرلیا (قُرْوْیَہ پر ۱۳۴۳ء میں اور وسطی اَلبانیا پر ۱۳۴۳-۱۳۴۶ء میں)؛ بظاہر اس واقعے کی وجہ سے یونان کی جانب اَلبانویوں کی ہجرت اور تیز ہوگئی۔ مقامی اَلبانوی جاگیرداروں اور سپاہیوں نے جنوب کی طرف مزید فتوحات حاصل کرنے میں دوشان کا ساتھ دیا (L.von Thallóczy اور C. Jireček: *Zwei Urkunden...*، ص ۸۵)۔ قبیلۂ واے نِک (voyniks)، جو بعد کو عثمانیوں کے ماتحت اَلبانیا میں نظر آتا ہے، غالباً اسی زمانے میں دُوشان کے ساتھ یہاں آباد ہوا۔ جب ۱۳۵۵ء میں دُوشان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مقامی جاگیردار، جو اصلاً سلاوی، اَلبانوی اور بوزنطی تھے، اَلبانیا کے سب حصّوں میں نظر آنے لگے۔ جلد ہی ان جاگیرداروں میں سے بَلْشَا (Balshas= بَلْشِچی Balshiće) شمالی علاقے میں اور تھوپیے (Thopias) وسطی علاقے میں سب سے زبردست اور طاقتور بن گئے۔ بلشیچیوں کے پاس دِراچ سے لے کر کتارو (Cattaro) تک کا تمام ساحلی علاقہ تھا اور انھوں نے پِرْزْرِین (Prizren) تک کے بڑے وسیع علاقے پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کی۔ ان کا ٹکراؤ شاہِ بوسنہ (Twrtko) اور اہلِ صربیا سے ہوا، جو اس علاقے یعنی زِیتہ (Zeta) کو دوبارہ اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد جلد ہی بَلْشوں نے، جو اَولونَہ، بلغراد اور قانِیْنہ میں آباد ہو چکے تھے، دراچ میں کارلو تھوپیا (Carlo Thopiā) پر حملے کا ارادہ کیا۔ اس نے ۷۸۷ھ/ ۱۳۸۵ء میں عثمانی ترکوں سے مدد مانگی، کیونکہ ان کے 'اُج' (سرحدی) دستے ۷۸۳ھ/ ۱۳۸۱ء ہی میں یانینہ (Yannina) کے قریب تک آ چکے تھے۔ بَلْشَا ثانی کو ایک ترکی فوج کے ہاتھوں ۱۲ شَعْبان ۷۸۷ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۳۸۵ء کو سَوْرَہ (Savra) کے مقام پر (جو [ناحیۂ] موزاکہ (Myzeqe) میں دریاے وِیْوسَہ (Vijosë) کے کنارے ہے، شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہ واقعہ ترکوں کے سرکاری وقائع میں مہمّ بجانب ''قارلی ایلی'' (Karli-illi) یعنی ''دیارِ قارلی'' (Carlo Thopiā) کے نام سے مذکور ہے اور ان میں اس کی صحیح تاریخ ۷۸۷ھ/ ۱۳۸۵ء درج ہے۔ اَلبانیا کے جاگیرداروں نے، جن میں بَلْشَا کے وُرَثا بھی شامل تھے، سلطانِ ترکیّہ کی سیادت تسلیم کرلی۔ ۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء میں لِش (Alessio) کے دُوْقَہ گِیْنُوں (Dukagjini [Le Duc Jean]) نے رِگُوسَن (Regusan) قبیلے کو مطلع کیا کہ انھوں نے عثمانیوں سے صلح کرلی ہے۔ عثمانیوں کی پیش قدمی سے خوف زدہ ہوکر حکومتِ وینس نے اِدھر تو دَیْنِیَل کُورْنارُو (Daniel Cornaro) کو مراد اوّل کی خدمت میں تھوپیا کی حفاظت کی غرض سے بھیجا (رمضان ۷۸۹ھ/ اکتوبر ۱۳۸۷ء) اور اُدھر اس شہر کو خود لے لینے کے لیے تھوپیا سے گفت وشنید شروع کردی۔ اس طرح اَلبانیا کے متعلّق وینس اور مقامی حکومت کی طویل رقابت کا آغاز ہوگیا۔ سلطان کے باج گزار کی حیثیت سے گِیْرْگِیْ سْٹْرَاٹ سِمِیْرْووِچ (Gjergy Stratsimirović) نے، جو سقوطری (شَقودرَ) اور دولچینیو (Dulcigno) میں بَلْشَا کا وارث تھا، اہلِ بوسنہ کے خلاف اپنی لڑائی میں عثمانیوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ کفالیہ شاہین (ترکی

وقائع میں: ''کوالہ شاہین'' بعد میں: شہاب الدّین شاہین پاشا) نے، جو ''اُج بیگی'' اور غالباً لِیاسْکُوِک (Liaskovik) کا ''صوباشی'' [کوتوال] تھا، بوسنہ کے علاقے میں متواتر کامیاب یلغاریں کیں، لیکن آخر کار اہلِ بوسنہ نے اسے ترہ بین (Trebinje) کے قریب ۲۳ شعبان ۷۹۰ھ/ ۲۷/اگست ۱۳۸۸ء کو شکست دی۔ بقولِ نِشْری یہ مہمّ ''امیر سقوطری'' سْٹْراٹ سِمِیْرْووِچ (G. Stratsimirović) کی درخواست پر شروع کی گئی تھی، جس پر شاہین کی شکست کے بعد دشمن سے ایک خفیہ سمجھوتہ کر لینے کا الزام لگایا گیا۔ قوصوَہ (Kossova) کے میدان پر فتح پانے کے بعد (۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں) عثمانیوں نے (Skoplje) (اُسکوب) کو ایک مستحکم سرحدی مرکز بنالیا اور پاشا یِگیت کے ماتحت یہاں صارُوخان کے ترکوں کو لا کر بسایا گیا (۷۹۳ھ/ ۱۳۹۱ء کے قریب)۔ اس کے بعد شاہین بھی واپس آ گیا اور اس نے G. Stratsimirović کو، جس نے اپنی حفاظت کے لیے پھر اہلِ وینس سے رجوع کیا تھا، سقوطری سے نکال دیا اور سینٹ سرجیس (St. Sergius) کو بھی بھگا دیا، جس نے اہلِ وینس کے پاس واپس جا کر پناہ لی تھی (۱۳۹۳-۱۳۹۵ء)۔ ادھر وینس نے لِش (Alessio)، دِراچ (۱۳۹۳ء) اور دْرِی ویشتہ (Drivaste) کے شہر لے لیے (۱۳۹۶ء)، جنھیں مقامی سرداروں نے سالانہ وظیفے کی تضمین کے عوض وینس کے حوالے کر دیا۔ عثمانیوں نے بھی اپنی جگہ یہ کوشش کی کہ وہ مقامی سرداروں کو اپنا جانب دار بنائے رکھیں اور اس کا ذمّہ لیا کہ ان کی زمینیں بطور 'تیمار' ان کے پاس ہی رہیں گی۔ چنانچہ دِمِتْرِی یونِیمہ (Gionima)، قُسْطَنْطِین بَلْشَا اور گِیرْگْی دُوقَہ گِجِین (Gjergj Dukagjin) نے ترکی باج گزاروں کی حیثیت سے اہلِ وینس کے مقابلے میں شاہین سے تعاون کیا۔

اَلبانیا کی سرزمین میں عثمانی حکومت کا قیام مع اپنے نظامِ ''تحریر'' (دیکھیے مادّۂ 'طاپُو' (Tapu) و 'تیمار'، [رٹ بآن]) اوّل اوّل پْرِمِدِی (Premedi= Premetë) اور کُورْچَہ (Körice کوریجہ) کے علاقوں میں آیا۔ باقاعدہ عثمانی نظامِ حکومت کا پتا، جس کی رُو سے شہروں میں صُوباشی اور قاضی اور دیہات میں سپاہی مقرّر کیے جاتے تھے، بایزید اوّل کے زمانے کی دستاویزوں میں بھی چلتا ہے (*Başvekalet Archives*، استانبول، مالیہ شمارہ ۲۳۱)۔ یہ صورت اَلبانیا میں عثمانیوں کی مہمّات (۷۹۶ھ/ ۱۳۹۴ء اور ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء) کے بعد عمل میں آئی ہوگی۔ عثمانی دستاویزات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آقْچَہ حِصَار (قْرُوْیَہ Kurjë = Croya) [جو آقچہ حِصار کا اصلی نام ہے] کو محصولات [=ٹیکس] سے معافی بھی اسی زمانے میں ملی۔ ۸۰۴ھ/ ۱۴۰۲ء میں اَلبانوی افواجِ خوجہ (؟) زَکَرِیّا (Coïa Zaccaria)، دِمِتْرِی یُونِیمَہ، گِیرْگْی، دُوقَہ گِین اور دُشْمَنِی کے زیرِ قیادت انقرہ کے میدانِ جنگ میں موجود تھیں۔ ۱۳۰۲ء میں بایزید کی امپراطوری کی درماندگی کے بعد ان میں سے کئی اَلبانوی سرداروں (اِیْوان قَسْتْرِی (Ivan Kastriot)، خوجہ (؟) زَکَرِیّا، نِکِتا تھوپیا (Niketa Thopia) نے حکومتِ وینس کی سیادت تسلیم کر لی۔ جب ۱۴۰۳ء میں گِیورْگ سٹراٹ سِمِیْرْووِچ (Georg Stratsimirović) فوت ہو گیا تو حکومتِ وینس نے، جو پہلے ہی سے سقوطری پر قابض ہو چکی تھی، اس کے موروثی علاقے کا ایک حصّہ یعنی دُولچِینِیو (Dulcigno)، [یا اوْلگُون] آنتیواری (Antivari) اور بُدوا (Budua) اپنے قبضے میں کر لیا۔ لیکن اس کے لڑکے بَلْشَا نے صربیا کے سٹیفن لیزرِوچ (Stephen Lazarevic) اور وُوْک برانکووچ (Vuk Branković) کی مدد سے حکومتِ وینس کے خلاف ایک طویل جنگ و جدال کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آخر ان کے حکم دار امیر سُلیمان سے حکومتِ وینس نے اَلبانوی امور کے متعلّق سمجھوتہ کر لیا (۱۹ جُمادی الاولیٰ ۸۱۲ھ/ ۲۹ ستمبر ۱۴۰۹ء)۔ اُسکوب کے پاشا یِگِت نے اِیوان قَسْتَرِی (Ivan Kastriot) کو مجبور کر دیا کہ وہ سلطان ترکی کی سیادت تسلیم کرے (۸۱۳ھ/ ۱۴۱۰ء)۔ جنوبی علاقے میں عثمانیوں نے اَلبانوی طوقوں (Toccos) کے مقابلے میں اَلبانوی سپاٹوں (Spatas) کی مدد کی۔ آخر الامر وینس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا، جس میں عثمانی حکومت نے شمالی اِیپِیر (Epirus) سے لے کر قْرُوْیَہ (آقچہ حصار) تک آلبانیا کو صحیح معنوں میں فتح کر لیا اور اَرْوَنِد-اِیلی یا اَرْنَاوُد-اِیلی کا صوبہ بنا دیا (۸۱۸-۸۲۰ھ/ ۱۴۱۵-۱۴۱۷ء).

اس ملک میں عثمانیوں کی فتوحات کی وجہ سے جو حالات پیدا ہوے اس کی تفصیل ۸۳۵ھ/ ۱۴۳۱-۱۴۳۲ء کے دِفْتِر 'تیمار' (صورتِ دِفتِر سَنْجَاقِ آرْوَنِد، طبع اینالْجِک (H. Inalcik)، انقرہ ۱۹۵۴ء) سے پوری طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ اس دفتر میں مختلف علاقوں کے ناموں کے ساتھ اکثر اوقات ان بڑے بڑے تِیماری خاندانوں کے نام بھی آ جاتے ہیں جو تقریباً ۸۱۹ھ/ ۱۴۱۶ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے باج گزار تھے: یووان اِیلی (Yuvan ili، علاقۂ قَسْتَرہ میں)، بَلْشَا اِیلی (قَوَایَہ (Kavajë) کے مشرق اور شقُومْبِی (Shkumbi) کے جنوب میں)، گِی اُونُومَیْمُو-اِیلی (Gionomaymo-ili)، (پِکِین Pekin کے شمال میں)، پَاوْلُو کُرْتِک اِیلی (وادی یِلِیْما Jilema میں)، کوندو-مِی ہو-اِیلی (Kondo-Miho-ili) (اِیلْبَصَان کے مغرب کے علاقے میں)، زِنِیبِش اِیلِی (Zenebish-ili) (زِنِیْبِسِی Zenebissi، گِینو قَسْتَر (Gjinokastër) اور اس کے گرد و نواح کے علاقے)، بوغدان-رِپِہ-اِیلی (اِیلْبَصَان کے شمال میں)، آشْتِن اِیلِی (پْرِمِیتَہ Premetë میں)۔ ان سب بڑے بڑے خاندانوں کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے عیسائی جاگیرداروں کے پاس ان کی کچھ زمینیں 'تیمار' کے طور پر باقی رہیں۔ ان میں سے دُوْبِرِیل (Dobrile، چارْتَولوس میں)، سائموس کوندو (Simos Kondo، کوکِنو لِساری Kokinolisari میں)، خاندان بُوْبُزَہ، گِیُون (Gion) اور اس کے بیٹے گْہِن (Ghin) اور آنْدْرِیا (Andre)

موضع بوبُرَہ یا بُوبُس (Bubës) میں) اور خاندانِ قارلی (مَتْیہ Matja میں) قابلِ ذکر ہیں۔ اَرْوَندِ ایلی کے تمام تیرداروں میں ایسی تیاروں کی کل تعداد ۱۶ فی صد تھی۔ اس قسم کی جاگیروں پر قابض رہنے کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ تیردار مذہبِ اسلام بھی قبول کرلے۔ بلغراد (بِرات Berat) میں ایک رئیس شہر (Metropolid) اور قانِینَہ، آقچہ حِصار اور چارتولوس میں تین جاگیرداروں (Peskopos) کو اپنے سابق گاؤں بطورِ تیمار دے دیے گئے تھے۔ اس صوبے میں ترکوں کی آبادی محض فوجی طبقے اور اربابِ دین تک ہی محدود تھی۔ ترکی تیردار اپنے متوسّلین سمیت آٹھ سو سے زیادہ نہ تھے۔ پوری سنجاق کوئی تین سو تیرداروں میں منقسم تھی جو گاؤوں اور قلعوں میں رہتے تھے، یعنی اَرْگِرِی قصری (Argirikasrî, Argyrocastro, Gjinokastër)، قانِینَہ، بلغراد، اِسْقُر اپار، بُرُتُوشِیش یا یکیجہ قلعہ (Yenidje- kale) اور آقچہ حصار میں اَرْگِرِی قصری (بعد میں اَرْگِرِی یا اِرْگِرِی) سنجاق بیگی کی جاے قیام قرار پایا اور ہر ولایت میں صُوباشی اور قاضی مقرّر ہوے۔ سب سے زیادہ انقلاب آفرین قدم جو عثمانی حکومت نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس نے تقریباً تمام زراعتی اراضی کو حکومت کی ملکیّت قرار دیا، کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا نظامِ تیرداری رائج نہ کرسکتی تھی۔ اس لیے کسان ضرور یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ اب وہ ایک غیر شخصی مرکزی حکومت کے تابع ہیں، اس لیے کہ سابقہ نظام میں انھیں اپنے جاگیردار آقاؤں سے قریبی توسّل حاصل تھا۔

شمالی علاقوں میں عثمانیوں نے شروع میں وینس کے برخلاف بلُشَا ثالث کی حمایت وتائید کی اور اس کی موت (۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) پر صربیا کے سٹیفن لیزرووچ کی؛ چنانچہ آخر کار وینس کو دریواستو (Drivasto)، اَیْنتِواری (Antivari) اور بُدُوَا (Budua) کے علاقے سٹیفن کو واپس دینے پڑے (۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء)۔ جنوب میں مطلق العنان امیر قارلوطوکو (Karlo Tocco) ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۹ء میں فوت ہوگیا اور مراد ثانی نے اس کے وارثوں کے باہمی تنازعات سے فائدہ اٹھاتے ہوے یانیہ پر قبضہ کرلیا (محرّم ۸۳۴ھ/اکتوبر ۱۴۳۰ء)۔ اس کے بعد اَلبانیا کی اراضی اور آبادی کا ازسرِنو جائزہ لیا گیا (شعبان ۸۳۵ھ/ بہار ۱۴۳۲ء)۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عثمانی حکومت کا نظم وضبط ملک میں زیادہ سخت ہوگیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اَلبانیا میں بعد کے عشرات میں جو مخالفت عثمانیوں کی ہوتی رہی اس کی ابتدا دراصل اسی جائزے سے ہوئی۔ اس کے علاوہ بغاوت کی حقیقی نوعیت بھی اسی سے ظاہر ہوجاتی ہے۔ اوّل تو کوہستان کے علاقے میں قُوُرُولِش (Kurvelesh) اور بُزُورِشق (Bzorshek) کے علاقوں کے بعض دیہات نے اپنے نام رجسٹر میں درج کرانے سے انکار کردیا، بلکہ بعض مقامات پر انھوں نے اپنے عثمانی تیرداروں کو ہلاک بھی کردیا۔ اِیوان (یُوَان) قَسْتَرِیُوت (Ivan, Yuvan- Kastriot) شمال میں، اَرِیانیتی (Arnit, Araniti, Arianites) قُومْنُنُوس (Comnenus)، اَرْگِرِی قَصْرِی کے علاقے میں انھیں اور اُن کی طرح کے اَور بڑے بڑے جاگیردار امرا کو اپنی اراضی کے بڑے بڑے حصّوں سے دست بردار ہونا پڑا تاکہ وہ زمینیں عثمانی 'سپاہیوں' میں تقسیم کی جاسکیں۔ سب سے پہلے اَرانِیتی (Araniti) نے حکومت کے مقابلے میں ہتھیار سنبھالے اور ۸۳۶ھ/ ۱۴۳۲ء کے موسمِ خزاں میں اس نے بہت سے 'سپاہیوں' کو قتل کردیا اور تھوپیا زِینَبِسی (Thopiā Zenebissi) نے اَرْگِرِی قَصْرِی کا محاصرہ کرلیا۔ الفانسو پنجم والیِ نیپلز، وینس اور ہنگری نے باغیوں کی ہمّت افزائی کی۔ انھوں نے علی بن اورنوس (Evrenuz) کو، جو اَلبانیا کا گورنر تھا، درۂ بُزورِشق (Bzorshek) پر شکست دی۔ ان واقعات سے شہ پاکر وسطی اور شمالی اَلبانیا کے عیسائی جاگیردار اس بغاوت میں شریک ہوگئے۔ آخرِ کار ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۴ء میں روم اِیلی کی تمام افواج اپنے والی (گورنر جنرل) سِنان بیگ کی زیرِ قیادت اس خطرناک بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے اکٹھی ہوگئیں، جس کی وجہ سے ہنگری ایک نئی صلیبی جنگ کے خواب دیکھنے لگا تھا، لیکن اَرانِیتی پہاڑوں میں جا چھپا۔ اس کے بعد جو زائد اوراق واسنادآرْوَندِ ایلی کے دفتر میں ۸۳۶ھ/ ۱۴۳۲ء کے بعد کے ملتے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عثمانی ضبط وربط یا ملک کے نظم ونسق پر اس بغاوت کا کوئی زیادہ اثر نہیں پڑا۔ عیسائی اور عثمانی تیرداروں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی اپنی تیاروں پر قابض رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بغاوت میں زیادہ تر کوہستانی باشندوں ہی نے [باغی] جاگیردار خاندانوں سے عملی تعاون کیا تھا، کیونکہ ان سرداروں سے ان کے شادی بیاہ کے تعلّقات تھے۔

۸۴۷ھ/ ۱۴۴۳ء کے بعد سے اسکندر بیگ نے [رَسْک بآن]، جو اَرانِیتی کا داماد تھا، اس بغاوت کی قیادت سنبھال لی۔ اس کی غیر معمولی مستعدّی اور بے باکی اور اس کے علاوہ اس وقت کی بین الاقوامی صورتِ حال کی وجہ سے اس تحریکِ بغاوت کو کسی حد تک بین الاقوامی اہمیّت حاصل ہوگئی۔ ان روایتی افسانوں کو جو اس کی شخصیت سے وابستہ ہوگئے ہیں نظرانداز کرکے یہ جتادینا ضروری ہے کہ اُس کی بغاوت کے اصلی اسباب اور مقاصد وہی تھے جو دوسرے اَلبانوی امرا کی بغاوت کے تھے۔ اسے تقریباً ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۸ء میں آقچہ حِصار (قُرویہ Croya) کا صُوباشی مقرّر کیا گیا، لیکن ۱۴۴۰ء میں برطرف کردیا گیا۔ اس نے قرویہ اور اپنے والد کی کل جاگیریں واپس حاصل کرلینے کی کوشش کی۔ وہ انھیں تیردار کی حیثیّت سے نہیں، بلکہ جاگیردار امیر کی طرح اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اُس نے دوسرے جاگیردار خاندانوں سے، یعنی خانوادہ ہاے تھوپیا، بلُشَا،

دُوقَہ گِیْن، دُشْمَنِی، لِیکاز کریا اور اَرانِتی سے اتّحاد کرلیا تھا (لِش Alessio کا جلسہ، یکم مارچ ۱۴۴۴ء) لیکن یہ تصوّر کہ [اس وقت] ایک قومی رہنما کی قیادت میں متّحدہ اَلبانیا کی تشکیل ملحوظ تھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ [اسکندر] کے تصرّف میں صرف شمالی اَلبانیا تھا، بحالیکہ وسطی اور جنوبی اَلبانیا پر ہمیشہ عثمانی ترکوں کا قبضہ رہا۔ اَرْگِرِی قَصْرِی (گِیْنُوْ قَسْتَر Gjinokastër)، اُوخری (Ohrida) یا بلغراد (بِرات Berat) کو مرکزِ جنگ بنا کر صوباشیوں اور سنجاق بیگوں نے مقامی فوجوں کے ذریعے اسے دبانا چاہا لیکن وہ ہمیشہ غیر رسمی اور چھاپہ مار طریقِ جنگ (guerilla warfare) پر کاربند رہا۔ بہت سی لڑائیاں، جن کا ذکر مارینو بارلیزیو (Marino Barlezio) نے دوراز قیاس اعداد وشمار دے کر کیا ہے، محض مقامی جھڑپیں تھیں؛ بظاہر اسکندر بیگ کی خود اپنی فوج کی تعداد کبھی تین ہزار سے نہیں بڑھی۔ ۲۶ مارچ ۱۴۵۱ء کے عہد نامے کی رُو سے وہ الفانسو پنجم شاہِ نیپلز کا باج گزار بن گیا اور اس نے قُرْوْیَہ کا علاقہ شاہ کے آدمیوں کے سپرد کردیا۔ اَرانِتی نے بھی، جو جنوبی اَلبانیا (واگینیشیا (Vagenetia)، آولونہ (Valona)، قانینہ (Kanina) کی ملکیّت کا دعویدار تھا، اس کی پیروی کی۔ شاہ نیپلز نے اپنی طرف سے اَرَانِتی کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ اس کی طرف سے دوسرے اَلبانوی رؤسا سے حلفِ وفاداری لے لے۔ چنانچہ زِیْنِبِسی (Zenebissi) اور دوسرے زعما بھی الفانسو [شاہِ نیپلز] کے باج گزار بن گئے۔ اس کے بدلے میں بادشاہ نے ہر ایک کو تین سو سے لے کر چودہ سو ڈُوکَٹ (ducats [ایک طلائی سکّہ]) تک کا سالانہ وظیفہ عطا کرنا منظور کیا اور اس بات کا بھی اقرار کیا کہ خطرے کے وقت وہ انھیں جاے پناہ بھی مہیا کرے گا۔ آقاؤں کی اس آسان سی تبدیلی کی بنا یہ تھی کہ اَیْرَ یْگُوْنِی (Aragonese) طریقِ جاگیرداری اَلبانوی زمینداروں اور جاگیرداروں کو عثمانی حکومت کے نظامِ اراضی کے مقابلے میں بہت زیادہ فائدہ مند معلوم ہوتا تھا، لیکن ایک معاصر اَیْرَ یْگُوْنی دستاویز شاہد ہے کہ ''عوام النّاس کو ترکی نظامِ حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی'' (دیکھیے C. Marinesco: *Alphonse VIII., Měl. de I'ěcole Roum. en France*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۰۴)۔ ایک دِفْتِرِ تیمار میں، جو ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۶-۱۴۶۷ء میں مرتب ہوا تھا، دِبْرَہ (Dibra)، دُلگُوْبُرْدُوْ (Dlgobrdo)، رُیِقَہ (Rjeka)، ماط اور چِرمِینِیْقَہ (Čermeniḳa) شامل تھے (*Baṣbakanlı̊k Archives*، استانبول، مالیہ، عدد ۵۰۸)۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ مُحمّد ثانی [رَکْ بآن] کی مہمّ (۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء) کے بعد نظامِ تیماری ان علاقوں میں بھی جاری کردیا گیا تھا۔ اِسْکِنْدِر بیگ کے، جس نے اپنے پہاڑی علاقے میں مراد ثانی سے (۸۵۲ھ/ ۱۴۴۸ء اور ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ء میں) اور مُحمّد ثانی سے (۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء اور ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۷ء میں) سرکشی اختیار کی، اصلی مقاصد خواہ کچھ ہی ہوں، یہ واقعہ ہے کہ اپنے زمانے میں پاپاے روما نے ''مدافعِ مسیحا'' کے لقب سے اُس کی شان بڑھائی اور انیسویں صدی کے اَلبانوی قوم پرست اسے اپنا بطلِ قومی تصوّر کرتے تھے۔

۱۴۶۳-۱۴۷۹ء کی عثمانی-وینسی جنگ کے دوران میں اَور مقامات کے علاوہ اَلبانیا کا ملک اہمّ میدانِ کارزار بنا رہا۔ آخر کار عثمانیوں نے ۱۴۷۸ء میں قُرْوْیَہ، دِرِیُوسَتُوْ، لِش (Alessio) اور جَبْل جَق (jabljak) یا جبْ یک (Gabyak) کو، ۱۴۷۹ء میں سقوطری کو اور ۱۵۰۱ء میں دِراچ کو فتح کرلیا۔ ۱۵۰۹ء میں انھوں نے اَلِیشّیو (لِش Lesh) پر دوبارہ قبضہ کرلیا، جو ۱۴۹۹-۱۵۰۳ء کی جنگ میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ۱۵۳۸ء میں اپنی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد عثمانیوں نے آخرالامر ۱۵۷۱ء میں اَیْنْتِوارِی (بار Bar) اور دولچینیو (Dulcigno=اُلْچِنْیْ Ulćinj، اور لُگُوْن ölgün) پر قبضہ کرہی لیا اور اس طرح اَلبانیا کی تسخیر کا کام مکمّل ہوگیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر تک حکومتِ عثمانیہ کی وجہ سے اَلبانیا میں امن اور خوش بختی کا دور قائم تھا۔ بہت سے قدیم جاگیردار خاندان عثمانی نظامِ حکومت سے مانوس ہوگئے اور اَرانِتی خاندان کا ایک فرد علی بیگ نامی تو قانِینَہ، اَرْگِرِی قَصْرِی اور بلغراد کے نواح میں ۱۵۰۶ء کے قریب ایک بڑی تِیمار کا مالک تھا۔

۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء کے قریب تک تمام عثمانی اَلبانیا ایک سَنْجاق کی صورت میں منظّم، آرْوَنِدْ اِیلی (یا آرناوُد-اِیلی) کے نام سے موسوم اور ذیل کی ولایتوں میں تقسیم تھا: اَرْگِرِی قصْری، قُلِیْسُورَہ، قانِینَہ، بلغرادْ تِمورِینْجَہ، اِسْقَراپار، پاوْلُوْ قرْتُک، چارتالُوس اور آقچہ حِصار۔ جب ۱۴۶۶ء میں مُحمّد ثانی نے اِیْلبصَان کا قلعہ تعمیر کرایا تو اُس علاقے کو ایک نیا سَنْجاق بنادیا گیا۔

ان کے علاوہ جنوب میں آوْلونیہ (Awlonya) اور مشرق میں اُوْخْرِی (Ohrida) کی سنجاقیں قائم کی گئیں اور ۱۴۷۹ء میں اسکندریہ (سقوطری) کی سنجاق شمال میں قائم ہوئی۔ مندرجۂ ذیل فہرست ۹۱۲ھ/ ۱۵۰۶ء اور ۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء کے جائزوں پر مبنی ہے (*Başb. Archives*، طاپو عدد ۳۴ و ۹۴) اور اس سے سولھویں صدی میں انتظامی اور فوجی صورتِ حال کی وضاحت ہوتی ہے۔

سَنجاق	جماعات			آبادی			سرکاری ملازم اور سپاہی**						آمد محصولات (Tax revenues)	
	شہر	قلع	مواضع	عیسائی خاندان	مسلم خاندان	یہودی خاندان	سنجاق بیگی	قاضی	زعیم	تیمار سپاہی	جزیہ	قلعوں میں مستحفظ	آقچہ (اس زمانے میں ایک بندوق کی قیمت ۲۵ آقچہ ۶۰ بارہ بور)	
اسکندریہ [= سقوطری]: اس کی قضاوار تقسیمات یہ تھیں: اسکندریہ، پودگوریچہ، ہَیْوَر، اِپِک، پُرْزْرِین، قرہ ظاغ.	۵	۶	۸۹۵	۲۳,۳۵۵	۳۷۱	—	۱	۴	۸	۱۳۷	؟	۲۹۷	۴۳,۹۲,۹۱۰	
آولونیہ: اس کی قضاوار تقسیمات حسبِ ذیل تھیں: بَلغراد، اِسْقَراپار، پُرِیمِدی، بُوگُونیہ، ہیپہ دِلن اَرگِری قَصْری، آولونیہ.	۷	۷	؟	*۳۳,۵۷۰	*۱,۳۴۴	*۵۲۸ آولونیہ میں اور ۲۵ بلغراد میں	۱	۷	۶۸	۴۷۹	۶۵۴	۳۴۶ اور ۱۰۷ دَعَرَب،	۶۹,۹۱,۸۳۰ ارگری قصری، آولونیہ اور بلغراد کی تین قضاؤں میں	
اِیلبصان: اس کی قضاوار تقسیمات حسب ذیل تھیں: اِیلبصان، چِرمِنِقہ، اِشْبَت، دِراچ.	۳	۴	۲۵۰	۸,۹۱۶	۵۲۶	؟	۱	۳	۲	۱۰۹	۱,۰۳۱	۴۰۰ ۲۵۰ دَعَرَب،	۱۲,۶۰,۰۸۷	
آوْخْرِی: اس کی قضاوار تقسیمات حسب ذیل تھیں: آوْخْرِی، دِبْرَہ، آقچہ حصار، ماط	۴	۶	۸۴۹	۳۲,۶۴۸	۶۲۳	—	۱	۴	۸	۳۸۸	۶۵۵	۱۹۳	۲۹,۴۷,۹۴۹	

* یہ اعداد و شمار صرف بلغراد، ارگری قصری اور آولونیہ کی قضاؤں سے متعلق ہیں.

** اس فہرست میں دِزْدار، کتخدا، خطیب، امام، یا شیخ شامل نہیں ہیں، جو تقریباً ہر شہر میں موجود تھے.

اگر ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء کے جائزوں کا سولھویں صدی کے جائزوں سے مقابلہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ درمیانی مدّت میں ہر جگہ، شہر اور دیہات دونوں میں، آبادی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی، لہٰذا محصولات (Taxes) کی آمدنی میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا۔ مندرجۂ ذیل گوشوارہ بڑے بڑے شہروں کی صورتِ حال پر شاہد ہے.

شہر یا قصبات	۱۴۳۱ء		سولھویں صدی کی ابتدا	
	عیسائی خاندان	مسلم خاندان	عیسائی خاندان	مسلم خاندان
اَرْگِری قَصْرِی	۱۲۱	–	۱۴۳	–
بلغراد	۱۷۵	–	۵۶۱	۱۱
قانِینَہ	۲۱۶	–	۵۱۴	–
پُرِمدِی	۴۲	–	۲۶۰	–
قُلِیسُورَہ	۱۰۰	–	۵۱۴	–
آقچہ حِصار	۱۲۵	–	۸۹	۶۵

(ان اعداد میں فوجی یا غیر فوجی افسر شامل نہیں)

اَلبانیا کی چار سَنْجَاقوں میں ۱۹ قصبے تھے، جو سب کے سب چھوٹے چھوٹے، منڈیوں والے قصبے تھے اور جن کی آبادی ایک ہزار سے لے کر چار ہزار تک تھی۔ ان میں سے صرف آوْلونیہ (Awlonya=آوْلونَہ Avlona) ہی ایسا شہر تھا جسے تجارتی مرکز ہونے کی حیثیّت سے کچھ اہمیّت حاصل تھی (آبادی چار ہزار سے پانچ ہزار تک)۔ تجارت کو زیادہ فروغ دینے کے لیے حکومت نے وہاں یہودیوں کی خاصی بڑی نو آبادی قائم کی، جو ہسپانیہ کے پناہ گزین تھے (پندرھویں صدی کے آخر میں).

آوْلونیہ کے قانون نامہ کی رُو سے (دیکھیے آرْوَنِدْ دِفْتِری، ۱۲۳) اس بندرگاہ پر وہ مال اتارا جاتا تھا جو یورپ سے آتا تھا۔ مخمل، کمخواب، موہیر (باریک اُون کا کپڑا)، سوتی کپڑا، قالین، مسالے اور چرمی مال، یہ سب کچھ بروسہ اور استانبول سے آیا کرتا تھا، بلکہ آولونیہ کے بعض شہریوں نے یورپ کے تاجروں سے بھی کاروباری تعلّقات قائم کر رکھے تھے۔ کول تار اور نمک، جو شہر کے نزدیک ہی پیدا ہوتا تھا، مقرّرہ قیمت پر حکومت کے کارندے ہی خاصی مقدار میں خرید لیتے تھے۔ آوْلونیہ کے محصولات کی صرف وہ آمدنی جو خزانۂ سلطان میں داخل ہوتی تھی کوئی بتیس ہزار طلائی ڈوکٹ (Ducats) سالانہ تھی۔ ایک قلعہ نشین فوج اور مختصر سا بحری بیڑہ یہاں مستقل طور پر رہتا تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عثمانی حکمرانوں نے (تقریباً ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء، میں؛ دیکھیے اِوْلِیاء چلبی، ج ۷ و ۸) اَلبانوی قصبوں مثلاً آقچہ حِصار اور اِسْقَرَا پار کی وہ محصولاتی مراعات برقرار رکھیں جو بوزنطی عہد سے چلی آتی تھیں؛ (دیکھیے L. von Thallóczy-C. Jireček: *Zwei Urkunden aus Nordalbanien, Archiv für slavische Phil.*، ج ۲۱، ۱۸۹۹ء، ص ۸۳)۔ 'دِفتر' بابت ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء میں تحریر ہے: ''باشندگانِ آقچہ حِصار قلعے کی حفاظت کریں، نتیجۃً اُن کے لیے ہر قسم کے محصولات، خَراج [زمین کے لگان] کے سوا، معاف ہوں گے''۔ ٹیکس کی یہ مراعات سولھویں صدی کے اواخر میں منسوخ ہوئیں.

عثمانیوں نے نظامِ محصولات میں، جو عہدِ بوزنطی اور عہدِ صربیا سے جاری تھا، کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ 'اِسپِنْجَہ' نام کا محصول، جو بہت اغلب ہے کہ اہلِ صربیا نے عائد کیا تھا، ہر ایک بالغ عیسائی مرد کو ۲۵ آقچہ فی کس کے حساب سے ادا کرنا پڑتا تھا۔ عثمانیوں کے بنیادی ٹیکس یہ تھے: 'عُشْر'، جو حقیقۃً کل زرعی پیداوار کا آٹھواں حصّہ تھا [یعنی دسواں نہیں] اور 'جزیہ'۔ بوزنطیوں کا عائد کردہ ٹیکس، یعنی دو پیمانے ['بُشَل'، تقریباً ۳۶ لیٹر] گندم اور دو پیمانے رئی (rye= گندم سیاہ) سالانہ، اَلبانیا کے بعض حصّوں میں عثمانیوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ اسی طرح وہ جرمانے جو 'بادِہوا' [رشت بآن] کے نام سے موسوم تھے بظاہر بوزنطی aerikon کی ایک بدلی ہوئی شکل اور ''طاوُوق وِ بُوغاچہ'' [''مرغ اور روٹی''] (بوزنطی: kaviskia) بھی اَلبانیا میں بطورِ ''عادت'' (معمول) کے جاری رہے۔ جزیے کا ٹیکس تو خزانۂ سلطان کے لیے جمع کیا جاتا تھا، لیکن باقی تمام ٹیکس تیمارداروں ہی میں تقسیم ہو جایا کرتے تھے۔ عہدِ عثمانی میں بظاہر محصولات کی شرح میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ البتہ بیگار بند کر دی گئی اور ہر کسان کو جتنا ٹیکس دینا واجب تھا اس کی مقدار پہلے سے متعیّن کر دی گئی۔ غیر قانونی کارروائیاں ضرور موجود رہیں؛ قانون نامۂ ۱۵۸۳ء بظاہر اس قسم کی بدعنوانیوں پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کوئی تیماردار اپنے مزارعین سے جبراً بیگار نہیں لے گا، نہ اُن سے اپنی خشک گھاس (hay) اٹھوائے گا، نہ تیماردار مجاز ہے کہ غیر قانونی طریقے پر کسی کسان کی زمین پر قبضہ کر لے یا اُسے عُشْر کو نقدی کی صورت میں ادا کرنے پر

مجبور کرے، جو جنس ہی کی صورت میں ادا ہونی چاہیے۔ نیم خانہ بدوش لوگوں کی عام شکایت یہ تھی کہ جب وہ ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو ان کی بھیڑوں پر سال بھر میں ایک سے زیادہ مرتبہ ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔

سولھویں صدی کی ابتدا میں اسکندریہ (سقوطری) کے سنجاق کی آمدنی ۴۳,۹۲,۹۱۰ آقچہ تھی۔ اس کا نصف تو سلطان کو دیا جاتا اور دوسرا نصف سَنْجاق بیگی (۴,۴۹,۹۱۳) اور تیمارداروں کو (۱۷,۷۶,۱۱۸).

سلطنتِ عثمانیہ کے حکمران طبقے میں اَلبانویوں کو نمایاں حیثیّت حاصل تھی۔ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر تقریباً ایسے تیس آدمیوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں جو اَلبانوی الاصل تھے۔ ان میں گِدِک احمد، قوجہ داؤد، دُوْقَگِین زادہ احمد، لُطْفی، قَرَہ احمد، قوجہ سِنان پاشا، نَصُوح، قَرَہ مُراد اور ترخونْجی احمد شامل ہیں۔ 'قپوقُولی' فوج میں بھی اَلبانوی ہمیشہ بڑی تعداد میں موجود رہے؛ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اَلبانیا میں بوسنہ کی طرح نظامِ دِیُوْشِرْمِہ [رَکْ بآن] وسیع پیمانے پر رائج تھا.

عثمانی سلطنت کے ڈھانچے میں دو بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں، یعنی ایک طرف نظامِ تیمارداری درہم برہم ہو گیا اور دوسری جانب مالیاتی نظام میں انحطاط واقع ہوا؛ ان تبدیلیوں کا دوسرے علاقوں کی طرح اَلبانیا کے حالات پر بھی اثر پڑا۔ پہلی تبدیلی سولھویں صدی کے آخر میں مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا کہ ولایتوں میں بڑی بڑی جاگیرداریاں بن جائیں اور دوسری تبدیلی کی بنا پر حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ نئے ٹیکس لگائے اور جزیے کی رقم از سرِ نو متعیّن کرے۔ اس سے شرحِ جزیہ میں اضافہ ہوا اور اس کا اثر بالخصوص عیسائی آبادی پر ہوا۔ لوگوں میں جو بددلی پیدا ہوئی اس کا اظہار خاص طور پر سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں اَلبانیا کے کیتھولک کوہستانیوں کے باغیانہ رویّے اور مخالف طاقتوں سے ان کے تعاون کی شکل میں ہوا۔ مثال کے طور پر قبیلۂ قِلیمِیْنْتِی (Klementi) پر ایک ہزار آقچہ سالانہ کا ٹیکس عائد ہوا تھا، مگر آقچہ کی قیمت گر جانے کی وجہ سے یہ رقم سولھویں صدی کے آخر میں ایک حقیر سی رقم بن گئی، اس لیے حکومت نے یہ تجویز کی کہ جزیہ کی رقم ۱٬۰۰۰ اشرفی طلائی کر دی جائے۔ اس سے شمالی اَلبانیا کے قبائل میں بغاوت پیدا ہو گئی اور انھوں نے روم اِیلی کے میدانوں میں فِلِبہ (Philippoholi [Filibe]) تک قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے بابِ عالی نے ان لوگوں کے خلاف کئی مرتبہ فوج بھیجی اور غُوسِیْنِہ (Gusinje) کے قریب ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ ان لوگوں کی ایک نئی شورش ۱۶۳۸ء میں ہوئی، جسے دوچہ محمد پاشا نے دبا دیا (دیکھیے نعیما، ۳:۳۹۹-۴۰۹)۔ قبائل قِلیمِیْنْتِی (Klementi)، قوجی (Kuči)، قُتْسْ چای (Ḳcčaj) اور پِپِری (Piperi) نے شمال میں اور خِیماریوں (Himariots) نے، جو ساحل کے متّصل سلسلۂ کوہِ خِیماریہ میں آباد تھے، ۱۶۸۳-۱۶۹۹ء، ۱۷۱۴-۱۷۱۸ء اور ۱۷۳۶-۱۷۳۹ء کی جنگوں میں آسٹروی اور بُنْدُقی (Venetian) فوجوں سے تعاون کیا.

دوسری طرف، جب مرکزی نظم و نسق کمزور ہو گیا تو یہ کوہستانی باشندے رُوم اِیلی میں داخل ہونے لگے بلکہ سترھویں صدی کے آغاز سے اناطولیہ تک بھی پہنچنے لگے۔ اٹھارھویں صدی میں پاشاؤں، بیگوں اور 'اعیان' نے ہر جگہ ان کوہستانیوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرنا شروع کر دیا؛ جو بہترین اجیر سپاہی ہونے کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان سپاہیوں کے تقریباً سو سو کے بُولُوک (bölüks، دستے) مرتّب کیے گئے تھے اور ہر دستے کی قیادت ایک 'بُولُوک باشی' کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جو اجیر سپاہیوں کے کامل سردار کی حیثیت سے اجیروں کے بھرتی کرنے والوں سے ان کے متعلّق ہر قسم کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ ان دستوں کی اہمیّت محمد علی اور اس کے کارناموں کی مثال سے پوری طرح واضح ہوتی ہے جو اس نے مصر میں سرانجام دیے تھے۔ بہت سے اَلبانوی رُوم اِیلی کے کوہی دستوں میں بھرتی ہو گئے، جنھیں طاغلی اِشْکِیاسی (Daghlî eshkîyāsî) یا قِیر چالی (Kirčaali) کہا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں سرکاری اراضی کی اجارہ داری ("مِیْرِی اَراضِی مقاطعہ سی") کا طریقِ عمل نشیبی علاقوں، ساحلی میدانوں اور اندرونی طاسوں میں رائج ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے زمینداروں یعنی "اعیان" [رَکْ بآن] کا گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ "غیر حاضر" زمیندار ہر ممکن طریقے سے زیادہ سے زیادہ مقاطعات حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ شمال میں بُوشاتْلِی خاندان گِیغَہ (Geg) کے علاقے میں اور جنوب میں علی پاشا تِپِہ دِلِنْ لی (دیکھیے علی پاشا تِپِہ دِلِنْلِی (۱۷۴۴-۱۸۲۲ء) طوسقہ کے علاقے میں نیم خودمختار اور مستبدّ حکمران بن گئے۔ تب سے پہلا بُوشاتْلِی (ترکی وقائع ناموں میں بُوجاتْلِی یا بُوچاتِلی) محمد پاشا تھا، جس نے بڑے بڑے مقاطعات حاصل کر کے اپنا اقتدار قائم کیا اور مَالِیْسُوْرون (پہاڑی قبائل) سے اتّحاد پیدا کر کے بابِ عالی کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے سقوطری (اشقودرہ، شقودِیْر) کا گورنر مقرّر کر دے (۱۷۷۹ء)۔ ۱۷۹۶ء میں وہ فوت ہوا تو حکومت نے یہ مقاطعات واپس لینے کا ارادہ کیا؛ اس پر محمد پاشا کے بیٹے قرہ محمود پاشا [رَکْ بآن] نے بغاوت کر دی۔ علی پاشا کے قبضے میں بھی کوئی دو سو املاک ("چِفْتْ لِک") تھے۔ شروع میں تو بابِ عالی نے خاندانِ بُوشاتْلِی اور علی پاشا کی بڑھتی ہوئی قوّت اور اقتدار کے سدِّ باب کی جانب کچھ توجّہ نہ کی، کیونکہ بجا طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگ مقامی 'اَعیان' کے غلبہ و اقتدار کو بخوبی روک سکتے ہیں اور ان دو پاشاؤں کے درمیان جو رقابت تھی اس کے باعث یہ خیال تھا کہ وہ ایک دوسرے کا توڑ خود بخود کرتے رہیں گے۔ علی پاشا ایک دفعہ بُوشاتْلِیوں کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کی کوشش میں ان سے جنگ بھی کر چکا تھا۔ اپنے بیٹوں کے ذریعے، جنھیں اس نے تسالیا (Thessaly)، مورہ (Morea) اور قارْلِی اِیلِی (Ḳarli-ili) کا گورنر مقرّر کرا لیا تھا، اس نے اَلبانیا اور یونان میں واقعۃً ایک نیم خودمختار ریاست قائم کر لی

تھی۔ ۱۸۲۰ء میں جب مرکزی حکومت نے آخرِ کار اس کے خلاف کارروائی شروع کی تو وہ باغی ہو گیا اور اس نے یونانیوں کو بھی سرکشی اختیار کرنے پر اکسایا۔ آخری بُوشاتلی حکمران مصطفٰی پاشا کے اقتدار کو کہیں ۱۸۳۲ء میں جا کر محمود ثانی کی فوج نے ختم کیا، جو از سرِ نو مرتّب کی گئی تھی۔ تنظیمات کی مرکزیّت پسند حکمتِ عملی کے باعث شمالی اَلبانیا کے داخلی استقلال والے قبائل نے بھی شورش برپا کی۔

۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو محض برلن کانگرس کے فیصلوں پر اثر ڈالنے کی غرض سے ''پُرِزرین'' میں ''اَلبانوی قوم کے حقوق کا تحفّظ کرنے والی انجمن (لیگ)'' کا قیام عمل میں آیا لیکن اَلبانیا کی ایک علیٰحدہ ریاست کو وجود میں لانے کے بارے میں وہ بہت اہمّ ثابت ہوئی۔ ابتدا میں عثمانی حکومت کی حوصلہ افزائی سے اس لیگ نے قرہ طاغ (مونٹی نیگرو) اور یونان کی مزاحمت شروع کی تا کہ اَلبانوی صوبے (یعنی چار عثمانی 'ولایتیں'، یانیہ، شقودرْ، مناستر اور قوصوہ) متّحد رہ سکیں، مگر جب لیگ کا رجحان داخلی استقلال والے اَلبانیا کے تصوّر کو تقویت پہنچانے کی جانب ہوا تو ۱۸۸۱ء میں بابِ عالی نے کچھ فوج بھیج کر لیگ کو منتشر کر دیا۔ دُوَلِ عظمٰی، بالخصوص آسٹریا، ہنگری اور اٹلی نے تحریکِ استقلال کی تائید کی، کیونکہ ان دونوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اَلبانیا میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں لیکن روس اَلبانیا کے علاقوں پر مونٹی نیگرو کے دعاویِ تصرّف کا حامی تھا؛ دوسری طرف عبدالحمید ثانی اَلبانویوں کو اپنے محافظ دستے (باڈی گارڈ) میں بھرتی کر کے اور انھیں مخصوص عنایات سے نواز کر ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا، لیکن روشن خیال اَلبانوی نوجوان ترکوں (Young Turks) سے مل کر، جو پیرس یا دوسرے مقامات میں مقیم تھے، یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ اَلبانیا کو داخلی استقلال حاصل ہو جائے گا۔ ۱۹۰۸ء میں اَلبانویوں نے عبدالحمید ثانی کے خلاف جو روّیہ فریزْووِک (Frizovik) کے اجلاس میں اختیار کیا اس سے واقعتاً اس انقلاب کی کامیابی میں بڑی مدد ملی۔ عثمانی پارلیمنٹ میں ذی اثر اَلبانوی مندوبین، مثلاً اسمٰعیل کمال، اِسعَدتْوپْتَنی، حَسَن پُرِشْتِنہ وغیرہ حزبِ ''حُرِّیّت و ائتلاف'' میں شامل ہو گئے، جس کا مقصد مرکزیّت کو ختم کرنا تھا، حزبِ ''اتّحاد و ترقّی'' کے خلاف جو مرکزیّت اور عثمانی اشتراک کے حق میں تھی۔ ٹھیک اس موقع پر جب اَلبانیا کے نظامِ تعلیم پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی (مؤتمرِ مَناستر، نومبر ۱۹۰۸ء) اَلبانیا کے کوہستانی قبائل میں بغاوت برپا ہو گئی، اس لیے کہ عثمانی حکومت نے ان کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی اور انھوں نے مزاحمت کی۔ آخرالامر ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو جدید عثمانی حکومت نے داخلی استقلالِ اداری کے متعلّق اَلبانیا کے مطالبات تسلیم کر لیے، لیکن جنگِ بلقان کی وجہ سے بلقان کی صورتِ احوال بالکل بدل گئی۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں اعلانِ جنگ ہونے کے بعد ہی اسمٰعیل کمال نے آوْلونْیَہ میں (وْلورَہ Vlorë) کے مقام پر اَلبانیا کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مؤتمرِ لنڈن (London Conference) نے ۲۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو قرار دیا کہ اَلبانیا چھے ملکوں کی ضمانت کے تحت داخلی استقلال والی ریاست ہے اور اس کا اعلان کر دیا۔ لیکن شہزادہ وِلہلم فون وِیڈ (Wilhelm von Wied) کو، جسے تخت نشینی کے لیے منتخب کیا گیا تھا، جلد ہی ملک سے نکلنا پڑا (۳ ستمبر ۱۹۱۴ء)۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد صربیا نے شقودر اور دِراچ (Durrës) کی ملکیّت کا دعوٰی کیا، چنانچہ اپنے ملک کے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر اَلبانوی رہنماؤں نے جلد ہی لُشْنْیا (Lushnjë) کے مقام پر کانگریس کا ایک اجلاس منعقد کیا (۲۱ جنوری ۱۹۲۰ء) اور اَلبانیا کی خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ تِیرانہ (Tiranë) میں قومی حکومت قائم ہوئی اور قوم پرست اَلبانوی فوجی دستے نے اطالویوں کو وْلورَہ (Vlorë) سے نکال دیا۔ آخر کار اطالیہ نے تیرانہ کے عہد نامے (۳/اگست ۱۹۲۰ء) کی رُو سے اَلبانیا کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ اَلبانیا کی اس چھوٹی سی حکومت کی پارلیمانی زندگی ابتدائی سالوں (۱۹۲۱ - ۱۹۲۴ء) میں بہت پُرآشوب تھی۔ مغربی اور وسطی میدانوں کے مسلمان جاگیردار بیگوں کا، مقبولِ عام پارٹی (زیرِ قیادت فان ایس۔نولی (Fan S. Noli) سے تصادم ہوا۔ اس طرح ایک انقلاب برپا ہو گیا اور وزیرِ اعظم احمد زْوغ (زوگ) کو راہِ فرار اختیار کر کے یوگوسلاویا میں پناہ لینا پڑی۔ چنانچہ اُسی ملک کی امداد و حمایت سے وہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو دوبارہ برسرِ اقتدار آیا۔ ایک رائے دہندہ [دستور ساز] مجلس (Constituent Assembly) نے اَلبانیا کو جمہوریہ قرار دیا اور احمد زْوغ کو اس کا پہلا صدر نامزد کیا۔ اس کے بعد اس نے اطالیہ سے کئی عہد نامے کیے (۱۲ مئی ۱۹۲۵ء؛ ۲۷ نومبر ۱۹۲۶ء؛ ۲۲ نومبر ۱۹۲۷ء اور مارچ ۱۹۳۶ء) اور ملک کو عملاً اطالیہ کی حفاظت میں دے دیا۔ ماہِ ستمبر ۱۹۲۸ء میں زْوغ کے شاہِ اَلبانیا بنائے جانے کا اعلان ہوا۔ جب ۱۶/اپریل ۱۹۳۹ء کو اطالویوں نے پہلی بار اس ملک پر حملہ کیا تو زْوغ اس سے ایک روز پہلے ملک چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔

مآخذ: (۱) Emile Legrand : *Bibliographie albanaise*، تکمیل و طبع Henri Guys، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۲) Jean G. Kersopoulos: *Albanie, ouvrages et articles de revue parus de 1555 à 1934*، طبع Flamma، ایتھنز ۱۹۳۴ء؛ (۳) Herbert Louis: *Eine Landeskunde vornehmlich auf Grunde eigener Reisen*، شٹُٹ گارٹ (Stuttgart) ۱۹۲۷ء؛ (۴) Antonio Baldacci: *Studi Speciali albanesi*، ۳ جلد، روما ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء و ۱۹۳۸ء؛ (۵) Johann G. von Hahn: *Albanesische Studien*، جینا (Jena) ۱۸۵۴ء؛ (۶) F. Nopcsa: *Albanien. Bauten, Trachten und Geräte Nordalbaniens*، برلن و لائپزگ ۱۹۲۵ء؛ (۷) Hyacinthe Hequard: *Histoire et Description de la Haute -Albanie ou Ghegarie*، پیرس ۱۸۵۵ء؛ (۸) M. E. Durham: *High Albania*، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۹) S. Gopčevič: *Oberalbanien und Seine Liga*، لائپزگ ۱۸۸۱ء؛ (۱۰) Margaret Hasluck: *The Unwritten*

Carleton S. Coon: *Racial Law in Albania*، کیمبرج ۱۹۵۴ء؛ (۱۱) *and Cultural Study of the North Albanian Mountain Ghegs*، کیمبرج (میساچوسٹس) ۱۹۵۰ء؛ (۱۲) Ludwig von Thallóczy: *Illyrisch - albanische Forshungen*، میونِک ـ لائپزگ ۱۹۱۶ء؛ (۱۳) Georg Stadtmüller: *Forschungen zur albanischen Frühgeschichte*، در *Archivum Europae Centro-Orientalis*، vii/ ۱۹۴۱ء: ۱ـ۱۹۶؛ (۱۴) M. M. v.Šufflay: *Srbi i Arabanasi*، بلغراد ۱۹۲۵ء؛ (۱۵) N. Jorga: *Brève Histoire de l' Albanie et du peuple albanais*، بخارِسٹ ۱۹۱۹ء؛ (۱۶) Fr. Pall Marino: *Mélanges d' histoire générale*، ۲ (Cluj ۱۹۳۸ء): ۳۱۸ـ۱۳۵؛ (۱۷) Barlezio uno storico Umanista H. Inalcik: *Sûret- i Defter - i Sancak - i Arvanid*، انقرہ ۱۹۵۴ء؛ (۱۸) وہی مصنّف: *Timariotes chrétiens en Albanie au XV, siécle*، در *Mitteil, des oesterreichischen Staatsarchivs*، وی اِنّا، ۱۹۵۲ء/۴: ۱۱۸ ـ ۱۳۸؛ (۱۹) وہی مصنّف: *Iskender bey*، در اسلام آنسائیکلو پیڈیسی، جز ۵۲؛ (۲۰) Stavro Skendi: *Religion in Albania during the Ottoman Rule*، در *Südostforschungen*، ۱۹۵۶ء/xv: ۳۱۱ـ۳۲۷؛ (۲۱) *Albania*، طبع S.Skendi، نیویارک ۱۹۵۶ء؛ (۲۲) عثمانی دور کے مؤرّخین: نِشری، اُرُوج، خواجہ سعد الدّین، کاتب چلپی، نَعیما، فِندِقلی مُحمّد آغا، راشد، اِنوَری اور جودت پاشا نے بھی اَلبانیا کے متعلّق خاصی معلومات بہم پہنچائی ہیں (دیکھیے بابنگر F. Babinger، در *GOW*؛ (۲۳) اولیاء چلپی کے لیے دیکھیے بابنگر: F. Babinger) *Evlijā Tschelebi's Reisewege in Albanien*، برلن ۱۹۳۰ء؛ (۲۴) [اَلبانیا میں] عثمانی حکومت کے آخری دور کے متعلّق دیکھیے Y. H. Bayur: *Türk Inkılabî Tarihi*، طبع Turkish Historical Society، انقرہ ۱۹۴۳ـ۱۹۵۶ء؛ (۲۵) T. W. Arnold: *The Preaching of Islam*، لنڈن ۱۹۳۵ء؛ (۲۶) J. K. Birge: *The Bektashi Order of Dervishes*، ہارٹ فورڈ (Hartford) ۱۹۳۷ء؛ (۲۷) K. Süssheim: *Arnavutluk*، در *IA*؛ [(۲۸) سامی: قاموس الاعلام، استانبول ۱۳۰۶ھ، ۱:۱۴۹ـ۱۵۳، بذیل مادّہ؛ (۲۹) ڈرہم (M. E. Durham): *The Struggle for Scutari*، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ (۳۰) M. D. A. R. von Redlich: *The Unconquered Albania*، ۱۹۲۵ء].

(خلیل اینالجِک ḤALIL INALCIK)

⊗ **آزاد:** ابوالکلام، محی الدّین، احمد، آزاد ان کا تخلّص تھا۔ آزاد کے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوے، جو ہندوستان وحجاز کے ممتاز بیوتِ علم و ارشاد میں سے تھے: (۱) آزاد کے دادا مولانا محمد ہادی اس گھرانے سے تھے جس میں بیک وقت پانچ پانچ اصحاب درس وافتا و طریقت پیدا ہوے؛ (۲) آزاد کے والد کے نانا رکن المدرّسین مولانا منوّرالدّین، شاہ عبدالعزیز محدّث کے ممتاز شاگرد اور مشہور صاحبِ درس وسلوک تھے؛ (۳) آزاد کی والدہ شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتیِ مدینہ کی بھانجی تھیں، جو اپنے عہد کے اکثر علماے حجاز کے استاذِ حدیث اور شیخ عبداللہ بن سراج کے بعد مکّے کے آخری محدّث تھے (تذکرہ، طبعِ اوّل، ص ۴)۔

آزاد کے والد مولانا خیرالدّین کم سنی ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ نانا کے گھر میں پرورش پائی۔ انھیں سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کی [شورش] سے پہلے نانا کے ہمراہ بہ قصدِ ہجرتِ حرمین روانہ ہوے۔ نانا نے بمبئی پہنچ کر وفات پائی۔ مولانا خیرالدّین جا کر مکّے میں مقیم ہو گئے۔ مدینے میں نکاح کیا۔ بمبئی، کلکتے اور رنگون میں ان کے بے شمار مرید تھے، جن کی وجہ سے ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں نہرِ زُبَیدہ کی مرمّت کے لیے سرمایہ فراہم کرنے میں خاص ناموری حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں مریدوں کے اصرار پر کلکتے چلے آئے۔ وہیں ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا (راقم سے مولانا آزاد کے مذاکرات، سطور آئندہ میں بغرض اختصار صرف 'مذاکرات' لکھا گیا ہے)۔

آزاد ذوالحجّہ ۱۳۰۵ھ/ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوے۔ آبائی وطن دہلی، مادری وطن مدینۂ منوّرہ، مولد مکّۂ مکرّمہ، محلّہ قدوہ، متّصل باب السلامِ حرمِ پاک، تاریخی نام فیروز بخت (تذکرہ، طبع اوّل، ص ۲۸۷ـ۲۸۹)۔ پانچ بھائی بہنوں میں یہ سب سے چھوٹے تھے۔ دس برس کی عمر میں والدین کے ہمراہ کلکتے آئے۔ ایک سال بعد والدہ فوت ہو گئیں۔ وہ صرف ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتی تھیں (مذاکرات)۔

تعلیم گھر ہی میں ہوئی۔ والد ہر علم میں کوئی مختصر متن حفظ کرا دیتے تھے کہ یہ شاہ ولی اللہ محدّث کے خاندان کا طریقِ تعلیم تھا۔ ۱۹۰۰ء میں فارسی کی تعلیم مکمّل کر لی۔ ۱۹۰۳ء میں درسِ نظامیہ سے فارغ ہو گئے۔ پھر تکمیلِ فنون کے لیے خود طب میں قانون پڑھنے لگے اور قدیم طریق کے مطابق پختگیِ استعداد کی غرض سے طلبہ کو مطوّل، میر زاہد، ہدایہ وغیرہ پڑھانے لگے (غبارِ خاطر، طبع سوم، ص ۱۳۱ ببعد)۔ بعد ازاں کثرت وانہماکِ مطالعہ سے مختلف علوم میں غیر معمولی کمال حاصل کر لیا۔ یورپی زبانوں میں سے پہلے فرانسیسی سیکھی، پھر انگریزی کی چند کتابیں پڑھ کر ذاتی مطالعے سے اتنی استعداد پیدا کر لی کہ اس زبان کی بہت سی قابلِ ذکر علمی وادبی کتابیں دیکھ ڈالیں (مذاکرات)۔

گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی غزلیں ارمغانِ فرخ، بمبئی اور خدنگِ نظر لکھنؤ میں چھپیں۔ نیرنگِ عالم کے نام سے خود بھی ایک گلدستہ نکالا۔ اسی زمانے میں نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ ابتدائی مضامین احسن الاخبار و تحفۂ احمدیہ، کلکتہ اور مخزن، لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء

کو کلکتے سے اپنا ماہانہ رسالہ لسان الصدق نکالا، جو ایک برس جاری رہا (مکتوبِ آزاد بنام راقم، مؤرّخہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء).

پہلی تقریر بارہ برس کی عمر میں کی۔ چار برس کے بعد (۱۹۰۴ء میں) انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں ان کی تقریر نے عام خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اسی موقع پر خواجہ حالی سے ملاقات ہوئی، جنھیں شروع میں یقین نہ آیا کہ لسان الصدق کے ایڈیٹر یہی ہیں۔ اسی طرح مولانا شبلی سے جب بمبئی میں ملاقات ہوئی تو وہ بھی ابتداءً انھیں ابوالکلام ماننے میں متأمّل رہے، مگر پھر اتنے گرویدہ ہوے کہ رسالۂ الندوہ کی ادارت سپرد کر دی (اکتوبر ۱۹۰۵ سے مارچ ۱۹۰۶ء تک) (حیاتِ شبلی، ص ۴۴۳ و مکاتیبِ شبلی، ۱: ۲۶۳)؛ بعدازاں کچھ مدّت اخبار وکیل (امرتسر) کے ایڈیٹر رہے۔ والد کی وفات کے بعد کم وبیش دو سال ایران وعراق کی سیاحت میں گزارے.

۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتے سے ہفت روزہ الہلال نکالا، جس کا خواب ان کی چشم بیدار چھے سال پیشتر امرتسر میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے دو مقصد تھے، ایک عام کہ اردو زبان میں ہر اعتبار سے ایسا بلند پایہ رسالہ جاری ہو جائے جو زمانے کی رفتارِ ترقّی کا ساتھ دے سکے اور فکر ونگارش میں ایک نئی قسم کی بلندی پیدا کر دے؛ دوسرا خاص کہ مسلمانوں کو مذہب میں مجتہدانہ فکر ونظر اور سیاست میں آزادیِ رائے وعمل کی دعوت دی جائے (الہلال، مؤرّخہ ۲۴ جون ۱۹۲۷ء، ص ۲)؛ چنانچہ الہلال اپنے بدیع اسلوبِ نگارش، بلند علمی وادبی ذوق، اجتہادِ فکر ونظر، سراپا مذہبیّت، بے باک سیاست اور جاذبِ نگاہ طباعت کی بنا پر بہت جلد ہندوستان کا یگانہ اخبار بن گیا۔ اس کا یکسر داعیانہ اندازِ تحریر حد درجہ پُرتاثیر ودلپذیر تھا.

۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب ہوئی۔ پہلی جنگِ یورپ کے متعلّق بعض مضامین کی بنا پر ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو یہ ضمانت ضبط ہو جانے سے الہلال بند ہو گیا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ جاری ہوا، جو نام کے سوا سراپا الہلال تھا۔ اس کے ساتھ ہی ''دارالارشاد'' قائم ہوا، جس میں ان جوانوں کو قرآن حکیم کا درس دیا جاتا تھا جو اپنی زندگیاں خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر دینے پر آمادہ تھے۔ تُرک انگریزوں کے خلاف شریکِ جنگ ہو چکے تھے۔ حکومتِ ہند ممتاز مسلمان لیڈروں سے بہت بدظن تھی، اس لیے ۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ دفعہ ۳ کے تحت حکم دے دیا کہ آزاد چار دن کے اندر حدودِ بنگال سے باہر نکل جائیں، چنانچہ البلاغ اور ''دارالارشاد'' بند ہو گئے۔ اسی غرض سے حکومت نے اخراج کا حکم دیا تھا۔ آزاد رانچی (بہار) چلے گئے، جہاں پانچ ماہ بعد نظر بند کر دیے گئے۔ زمانۂ نظر بندی میں انھوں نے حکومت سے کوئی وظیفہ قبول نہیں کیا.

اس زمانے میں دو مرتبہ رانچی میں اور تین مرتبہ کلکتے میں ان کے مکانوں کی تلاشی ہوئی اور متعدّد کتابوں کے مکمّل یا قریب التکمیل مسوّدے پولیس لے گئی، جن میں سے بیشتر ضائع ہو گئے، مثلاً تاریخِ معتزلہ، سیرتِ شاہ ولی اللہ، خصائصِ مسلم، امثال القرآن، ترجمان القرآن (تا سورۂ ہود)، تفسیر البیان (تا ابتداے سورۃ النساء)، وحدتِ قوانینِ کائنات، قانونِ انتخاب طبعی اور معنویتِ کائنات، غالب کے اردو دیوان پر تبصرہ شرفِ جہان قزوینی کے دیوان پر تبصرہ، نیز مضامین اور یادداشتوں کا ذخیرہ۔ آزاد کے الفاظ میں یہ ذخیرہ ''دماغ کا حاصل اور زندگی کا سرمایہ تھا'' (الہلال، ۲۴ جون ۱۹۲۷ء، ص ۳-۴).

زمانۂ نظر بندی میں رانچی کے مسلمانوں کو دعوتِ دین دیتے رہے۔ ایک مدرسہ جاری کیا، جو اب انٹرمیڈیٹ کالج ہے۔ متعدّد تصانیف مرتّب کیں، مثلاً تذکرہ (دو حصّے)، شیخ احمد سرہندیؒ کے سوانح (تذکرہ، ص ۲۳۱ ح)، سیرتِ امام احمد بن حنبل (تذکرہ، ص ۱۹۶ ح)، شرح حدیث غربت (تذکرہ، ص ۲۵۴ ح)، یہ تصانیف بھی باستثناے تذکرہ، حصّۂ اوّل، بعد کی تلاشیوں میں ضائع ہو گئیں.

جنوری ۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوے تو ملک میں آزادی اور تحفّظِ خلافت کی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ فروری ۱۹۲۰ء میں ''بنگال پراونشل خلافت کانفرنس'' کے صدر کی حیثیت میں 'مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب' پر سیر حاصل خطبہ دیا، جو اس موضوع پر حرفِ آخر ہے، اسی میں پہلے پہل مسلمانوں کو حکومت سے ترکِ موالات کی دعوت دی۔ پھر ہمہ تن اسی تحریک کے لیے وقف ہو گئے۔ عام تقریروں کے علاوہ مختلف کانفرنسوں میں خطبات دیے۔ تحریک کی دعوت کے لیے اپنی نگرانی میں ہفت روزہ پیغام جاری کیا.

اسی زمانے میں عوام کے اصرار پر بیعتِ امامت شروع کی، جس کی پانچ شرطیں تھیں: (۱) امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور توصیۂ صبر؛ (۲) الحبّ فی اللہ والبغض فی اللہ؛ (۳) لا یخافون فی اللہ لومۃَ لائم، یعنی سچائی کی راہ میں ہر شے سے بے پروائی؛ (۴) اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ محبوب رکھنا؛ (۵) اطاعت فی المعروف (آزاد کا پیغام عزیزانِ پنجاب کے نام)۔ بیعتِ امامت تمام صوبوں میں سرگرمی سے شروع ہو گئی تھی۔ آزاد کی اسیری کے زمانے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا.

۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر کے ان پر مقدّمہ چلایا گیا اور ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ اسی مقدّمے میں وہ بیان دیا جو قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا عربی ترجمہ ثورۃ الھند السیاسیۃ کے نام سے مطبع المنار، قاہرہ نے ۱۳۴۱ھ میں چھاپا تھا۔ ۶ فروری ۱۹۲۳ء کو قید سے رہا ہوے۔ اس وقت سے سیاسی کام بھی کرتے رہے اور علمی کاموں کے لیے بھی وقت نکالتے رہے۔ جون ۱۹۲۷ء میں دوبارہ الہلال جاری کیا، جو نصف ٹائپ میں چھپتا تھا اور نصف لیتھو میں۔ اس میں دورِ اوّل کے الہلال کے خلاف ''دعوت'' کے بجاے علمی رنگ زیادہ تھا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں سیاسی انہماک اتنا بڑھ گیا کہ اسے بند کر دینا پڑا.

دو مرتبہ کانگرس کے صدر بنے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد چار مرتبہ قید ہوے۔ رانچی کی نظر بندی سے جون ۱۹۴۵ء تک اسیری کی کل مدّت دس سال سات مہینے بنتی

ہے (غبارِ خاطر، طبع سوم، ص ۵۹)۔ ۱۹۴۷ء میں حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم بنے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ان کا انتقال ہوا اور انھیں جامع مسجد دہلی کے سامنے جو میدان ہے اس میں دفن کر دیا گیا۔

تصانیف: ۱۔ لسان الصدق، (ماہوار) تقریباً ایک سال کے پرچے؛

۲۔ الہلال، (ہفت روزہ) دورِ اوّل، پانچ مجلّدات از جولائی ۱۹۱۲ تا نومبر ۱۹۱۴ء (کچھ مدّت کے لیے الہلال ایک ورق پر روزانہ بھی نکلا تھا، جس میں صرف خبریں ہوتی تھیں)؛

۳۔ البلاغ، (ہفت روزہ) (الہلال کا دوسرا دور)، ایک جلد، از نومبر ۱۹۱۵ تا اپریل ۱۹۱۶ء؛

۴۔ پیغام، (ہفت روزہ)، ایک جلد، از ستمبر ۱۹۲۱ تا دسمبر ۱۹۲۱ء۔ (پیشانی پر مولانا کو نگران اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کو ایڈیٹر لکھا جاتا تھا، لیکن رسالے کے اکثر مضامین مولانا ہی کے قلم سے ہوتے تھے)؛

۵۔ الجامعہ، عربی (چند مہینے، پانزدہ روزہ، بعد ازاں ماہوار)، از یکم اپریل ۱۹۲۳ تا جون ۱۹۲۴ء۔ (اس کے بھی مولانا نگران تھے اور ایڈیٹر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، لیکن زیادہ تر چیزیں مولانا ہی لکھواتے تھے)؛

۶۔ الہلال، (ہفت روزہ) (تیسرا دَور)، ایک جلد از جون ۱۹۲۷ تا دسمبر ۱۹۲۷ء؛

۷۔ المرأۃ المسلمۃ، مطبع روز بازار، امرتسر؛

۸۔ حالاتِ سرمد، مطبوعۂ رحمانی پریس، دہلی (پہلی مرتبہ یہ حالات اور [حسین بن] منصور حلّاج کے حالات خواجہ حسن نظامی نے یکجا شائع کیے تھے اور کتاب کا نام تھا خونِ شہادت کے دو قطرے؛

۹۔ تذکرہ (حصّۂ اوّل)، مطبوعۂ البلاغ پریس، کلکتہ ۱۹۱۹ء (بعد میں اس کے دو ایڈیشن نکلے)؛

۱۰۔ مسئلۂ خلافت اور جزیرۃُ العرب (بنگال خلافت کانفرنس، منعقدۂ کلکتہ، فروری ۱۹۲۰ء کا خطبۂ صدارت)، مطبوعۂ البلاغ پریس، کلکتہ ۱۹۲۰ء (اس کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ چند ماہ بعد شائع ہوا)؛

۱۱ تا ۱۳۔ خطبۂ صدارت، پراونشل خلافت کانفرنس (اجلاس آگرہ، ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۱ء)؛ خطبۂ صدارت، تحریری، جمعیۃ العلماء (اجلاس لاہور، نومبر ۱۹۲۱ء)؛ خطبۂ صدارت، تقریری، جمعیۃ العلماء (اجلاس لاہور، نومبر ۱۹۲۱ء)۔ یہ تینوں خطبے الگ الگ سوراج پرنٹنگ ورکس، دہلی میں چھپے؛

۱۴۔ قولِ فیصل، (۱۹۲۱ء کے مقدمے میں مولانا کا تحریری بیان)، مطبوعۂ البلاغ پریس، کلکتہ (اس کے عربی ترجمے کا ذکر اوپر آ چکا ہے)۔

۱۵ و ۱۶۔ خطبۂ صدارت، کانگرس (اجلاس خاص منعقدۂ دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء)، طبع ہندوستان الیکٹرک پریس، دہلی؛ خطبۂ صدارت، آل انڈیا خلافت کانفرنس (اجلاس کان پور، دسمبر ۱۹۲۵ء)، طبع محبوب المطابع، مچھلی والاں، دہلی؛

۱۷۔ جامع الشواہد (مساجد میں غیر مسلموں کے داخلے کا مسئلہ)، (یہ تحریر پہلے رسالۂ معارف (اعظم گڑھ) کے مئی اور جون ۱۹۱۹ء کے دو شماروں میں شائع ہوئی تھی، پھر الگ کتابی صورت میں چھپ گئی)؛

۱۸ و ۱۹ و ۲۰۔ ترجمان القرآن، جلد اوّل (از ابتدا تا سورۃ الانعام) جیّد برقی پریس، دہلی، ستمبر ۱۹۳۱ء (اس کے ساتھ تفسیر سورۃ الفاتحہ کے کچھ حصّے بھی شائع ہوے تھے)۔ طبع دوم، زمزم کمپنی، لاہور ۱۹۴۷ء۔ اس میں سورۃ الفاتحہ کی تفسیر موسوم بہ ''اُمّ القرآن'' مکمّل چھپی، نیز ترجمان کے بعض حواشی میں اضافے کر دیے گئے؛ ترجمان القرآن، جلد دوم، (از سورۃ الاعراف تا سورۃ المؤمنون) مدینہ برقی پریس، بجنور، اپریل ۱۹۳۶ء؛ ترجمان القرآن جلد سوم اور مقدّمہ کی، جو قرآن حکیم کے ۲۴ بنیادی مباحث پر مشتمل ہے، طباعت کا انتظام ہو رہا تھا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا بالفعل ان کا سراغ نہیں ملتا؛

۲۰۔ خطبۂ صدارت، انڈین نیشنل کانگرس (اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰ء)، انڈین پریس لمیٹڈ، الٰہ آباد؛

۲۱۔ غبارِ خاطر (احمد نگر جیل سے مولانا کے مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام)، طبع اوّل، ۱۹۴۶ء (پہلے دو ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس نے چھاپے، تیسرا ایڈیشن اعلیٰ کاغذ پر مکتبۂ احرار نے شائع کیا، اس میں ایک مکتوب کا اضافہ ہے)؛

۲۲۔ ''مکاتیب'' مولانا کے کچھ اَور مکاتیب بھی چھپ چکے ہیں، مثلاً کاروانِ خیال، مطبوعۂ مدینہ پریس، بجنور، ۱۹۴۶ء؛ اتالیقِ خطوط نویسی، مطبوعۂ درویش پریس، دہلی، مارچ ۱۹۱۶ء؛ معارف (اعظم گڑھ)، بابت اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۵۳؛

۲۳۔ ''انڈیا ونز فریڈم'' *India Wins Freedom* بھی مولانا کی تصانیف میں محسوب ہے، مگر بصورت موجودہ صرف مطالب کے اعتبار سے اس کی یہ حیثیت تسلیم کی جا سکتی ہے نہ کہ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے۔ بہ الفاظِ دیگر اسے ''تصنیف'' نہیں، صرف ''ملفوظات'' قرار دیا جا سکتا ہے۔

الہلال اور البلاغ کے اکثر مضامین و مقالات اور مولانا کی متفرّق تقریریں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی تفصیل پیش کرنا ضروری نہیں۔

مآخذ: اُردو: (۱) مولانا کے مختلف جرائد، رسائل، مکاتیب، تصانیف؛ (۲) کاروانِ خیال (مکاتیب مولانا ابوالکلام و مولانا حبیب الرحمٰن شروانی)، مطبوعۂ مدینہ پریس، بجنور (یو۔ پی)؛ (۳) ابوسعید بزمی: مولانا ابوالکلام آزاد، شائع کردہ اقبال اکیڈمی، مطبوعۂ اتّحاد پریس، لاہور؛ (۴) قاضی محمد عبدالغفار: مولانا ابوالکلام آزاد، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، بمبئی ۱۹۴۹ء؛ (۵) عبداللہ بٹ: ابوالکلام آزاد، لاہور ۱۹۴۳ء؛ (۶) منشی عبدالرحمٰن شیدا: مولانا ابوالکلام آزاد، دریا گنج،

دہلی؛ (۷) مکاتیبِ شبلی، جلد اوّل و دوم، اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء؛ (۸) سیّد سلیمان: حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء؛ (۹) مولانا ابوالکلام کے مکاتیب بنام راقم الحروف، نیز مولانا سے مذاکرات کی یادداشتیں؛ (۱۰) رسالۂ معارف، بابت مارچ ۱۹۱۹ء، اکتوبر ۱۹۳۲ء، جنوری و مارچ ۱۹۳۳ء، اکتوبر-دسمبر ۱۹۵۳ء، جنوری و فروری ۱۹۵۴ء؛ (۱۱) روشن بی-اے: ابوالکلام آزاد، جے ہند پبلشرز، لاہور؛ انگریزی: (۱۲) A. B. Rajput: *Maulana Abul KalamAzad*، لائن پریس، لاہور ۱۹۴۶ء؛ (۱۳) H. L. Kumar: *The Apostle of Unity*، ہیرو پبلی کیشنز، ۱۹۴۲ء؛ (۱۴) S. Sataya Murthi: *Eminent Cont-emporaries*، Shukla Printing Press، لکھنؤ؛ (۱۵) Mehadev Desai: *Maulana Abulkalam Azad*، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۱۶) *Aspects of Abulkalam Azad*، مکتبۂ اردو، لاہور ۱۹۴۲ء؛ (۱۷) John Gunther: *Inside Asia*، لنڈن ۱۹۳۹ء؛ (۱۸) Louis Ficher: *Imperialism Unmasked*، بمبئی ۱۹۴۴ء.

(غلام رسول مہر)

⊗ **آزاد بِلگرامی**: میر غلام علی بن نوح الحُسَینی الواسِطی، الحَنفی، الچشتی از اولادِ مُوتم الاَشبال [ابو محمد، عیسٰی] ابن زید شہید [۱۶۹-۱۷۰ھ، عمدۃ الطالب، ص ۲۵۵ ببعد] بن امام زین العابدین (خزانۂ عامرہ، قلمی، ص ۱۳۱)۔ آزاد کے جدِّ اعلیٰ سیّد محمد صُغرٰی (حیاتِ جلیل، ۴۵ح، م ۶۴۵ھ) ۶۱۴ھ میں بزمانۂ سلطان اِلتُتمِش بِلگرام آئے تھے۔ علّامہ عبدالجلیل نے انھیں فاتح بِلگرام لکھا ہے [صَمَدَنی: حیاتِ جلیل، ص ۱۳۲]۔ غلام علی بِلگرام میں ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ/ ۲۹ جون ۱۷۰۴ء کو پیدا ہوے۔ درسی کتابیں شروع سے آخر تک میر طفیل محمد اُترَولَوی بلگرامی [م ۱۱۵۱ھ، نزھۃ الخواطر، ۶:۱۱۸] سے پڑھیں [سبحۃ المرجان، ص ۹۰ ببعد، ۱۱۸] اور ازاں بعد (فقہ، سِیَر، حدیث اور فنون ادبِ عربی و فارسی کی تعلیم) اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی سے پائی [کچھ بلگرام میں اور کچھ دہلی میں] اور عروض و قوافی اور بعض فنونِ ادب اپنے ماموں سیّد محمد (بن عبدالجلیل) سے حاصل کیے (خزانۂ عامرہ، مخطوطہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد، ص ۱۳۱؛ مطبوعہ، ص ۱۲۳)۔ پہلا سفرِ دہلی ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱-۲۲ء علّامہ عبدالجلیل بلگرامی سے تکمیلِ علم کی غرض سے ہوا۔ ان کے پاس دو سال رہ کر وہ بلگرام واپس آئے۔ ۱۱۳۷ھ میں میر سیّد لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا بلگرامی (م ۱۱۴۳ھ) سے بیعت ہوے۔ ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ میں بلگرام سے روانہ ہو کر براہِ دہلی، لاہور (اواخرِ محرّم ۱۱۴۳ھ میں، خزانۂ عامرہ، ص ۲۸)، ملتان و اُچ و بکّر، سندھ کے شہر سیُوستان [=سہوان] گئے، ۱۱۴۳ھ میں وہاں پہنچے اور چار سال اپنے ماموں سیّد محمد میر بخشی وقائع نگار کی، جو بلگرام واپس چلے گئے تھے، نیابت کی۔ آزاد ۱۱۴۷ھ میں دہلی واپس آئے اور اپنے اہلِ بیت سے ملنے کے لیے وطن اور ان اطراف کو گئے.

رجب ۱۱۵۰ھ/ نومبر ۱۷۳۷ء میں بلگرام سے وہ پا پیادہ سفرِ حج کے لیے نکلے۔ ''سفر خیر'' (=۱۱۵۰ھ) تاریخی مادّہ ہے۔ ۲۲ شعبان کو مالوے میں بمقام سِرَونج [از توابع مالوہ] نوّاب نظام الملک آصف جاہ (م ۱۱۶۱ھ) سے ملاقات ہوئی، جو مرہٹوں سے جنگ میں مصروف تھے۔ ایک مدحیّہ رباعی انھیں سنائی۔ نوّاب صاحب نے خوش ہو کر زادِ سفر عطا فرمایا اور اورنگ آباد آنے کی دعوت دی۔ آزاد بندر سورت سے حجّ کے لیے روانہ ہوے۔ چونکہ زمانۂ حجّ ختم ہو چکا تھا، اس لیے ۱۱۵۱ھ میں حجّ سے مشرف ہوے اور حجّ سے پہلے مدینۂ منوّرہ میں پہنچے، عین اس وقت جب وہ عمر کے چھتیسویں سال میں داخل ہوے۔ شیخ محمد حیات سندھی مدنی، حنفی سے الصحیح البخاری پڑھی اور سند لی اور صحاح ستّہ اور ان کے باقی مقروآت (خزانۂ عامرہ: مفردات، مگر دیکھیے اتحاف) کی اجازت لی اور مکّۂ معظّمہ میں مناسکِ حج سے فراغت کے بعد طائف بھی گئے۔ مکّۂ معظّمہ اور طائف میں بعض فوائدِ فنِّ حدیث انھوں نے شیخ عبدالوہّاب طَنطاوِی مصری (م ۱۱۵۷ھ) سے حاصل کیے۔ شیخ نے ان کے عربی اشعار سن کر بڑی تعریف کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ان کے قصیدہ مدحیّہ پر علماے مکّۂ معظّمہ نے انھیں حسّان الہند کا خطاب دیا (مقدّمۂ دیوان عربی، السبع السیارۃ، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۳)۔ (اپنے پانچوں استادوں اور اپنے مرشد کے تراجم آزاد نے مآثر الکرام اور سرو آزاد میں دیے ہیں)۔ حج سے واپسی کے بعد اَواخرِ ۱۱۵۲ھ میں وہ اورنگ آباد آ گئے ''سفر بخیر'' (=۱۱۵۲ھ) مادّۂ تاریخ ہے۔ اورنگ آباد میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنی عمر کے باقی ۴۸ سال دکن ہی میں گزارے۔ یہاں نظام الملک آصف جاہ تلمیذِ مرزا بیدل سے علمی صحبتیں رہیں؛ پھر وہ آصف جاہ کے دوسرے بیٹے نوّاب ناصر جنگ کے اتالیق مقرّر ہوے۔ جب آصف جاہ دہلی گئے تو ناصر جنگ نے، جو اپنے والد کے قائم مقام تھے، اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ ۱۱۵۴ھ میں باپ بیٹے میں جنگ ہوئی۔ ناصر جنگ ناکام رہے (بستانِ آصفیہ، ص ۴۶ و روایت سیّد علی اصغر بلگرامی)۔ آزاد نے اپنے اثر سے اس فتنۂ عظیم کو فرو کیا اور ناصر جنگ کا قصور معاف کرا دیا، ناصر جنگ [م ۱۱۶۴ھ] جب ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء میں اپنے باپ کے جانشین اور صوبہ دارِ دکن مقرّر ہوے تو اپنے استاد کا بے حد ادب ملحوظ رکھتے تھے اور انھیں بطور جاگیر ''آلتمغا'' موضع ہَرسُول، اورنگ آباد عطا کیا تھا۔ نوّاب سیّد محمد خان صلابت جنگ نے ان کی خدمات اور خیر خواہی ملک و رعایا کے صلے میں صدارتِ کل کی خدمت اور 'سراج المحدّثین' و 'رئیس العلماء' کا خطاب عطا فرمایا تھا (اصل سند بمہرِ بسالت جنگ دیوان شریف خان مؤرّخ ۱۱۷۳ھ، کتب خانۂ سیّد علی اصغر بلگرامی نبیرۂ آزاد، حیدرآباد دکن میں ہے)۔ اورنگ آباد میں ان کی وجہ سے بڑی علمی سرگرمی رہی۔ یہاں ان کے معاصرین میں مولوی سیّد قمر الدّین اورنگ آبادی مؤلفِ مظہر النور، میر قدرت اللہ بلیغ، حافظ غلام حسن گجراتی، مولانا فخر الدّین

ترمذی، میر رضی اقدس شُستری، موسوی خان جرأت، عارف الدّین خان عاجز، سراج الدّین سراج اورنگ آبادی وغیرہ تھے۔ ارشد تلامذہ میں لچھمی نرائن شفیق، میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی، عبدالوّہاب افتخار دولت آبادی مؤلفِ تذکرۂ بے نظیر، ضیاء الدّین پروانہ، میرزا عطا المتخلّص بہ ضیا برہانپوری الملقّب بہ خوش کلام خان، پیم چندعرف مٹھن لال وغیرہ تھے۔ امرا میں خصوصًا میر عبدالرّزّاق المخاطب بہ شاہنواز خان شہید [رک بہ صمصام الدولہ] سے بے حد خلوص اور محبّت تھی۔ جب صمصام الدولہ شاہ نواز کو قتل کر دیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا (رمضان ۱۱۷۱ھ/مئی ۱۷۵۸ء) تو آزاد نے اس کی تالیف مآثر الامراء کے نامکمّل مخطوطے کے بیشتر منتشر اجزا تلاش کر کے جمع کیے اور انھیں از سرِ نو ترتیب دے کر اور خطبہ و تمہید اور بعض مزید تراجم کے اضافے سے کتاب مکمّل کی۔

آزاد نے نہ صرف مآثر الامراء کی تصحیح و تکمیل کی بلکہ خانِ شہید کی دیگر تین تصانیف موسومہ بہ تذکرۂ بہارستانِ سخن (تذکرۂ شعرائے فارسی)، موائد الفوائد (عقائد) اور منشآتِ شہنواز خان کی بھی نظر ثانی و اصلاح کی۔ جب اس کے بیٹے عبدالحی خان 'صارم' نے بھی ۱۱۹۶ھ میں شہادت پائی تو آزاد ان دونوں کی تالیفات کی تصحیح کے بعد حیدرآباد سے اورنگ آباد گئے اور وہیں فوت ہوے۔ پیم چندعرف مٹھن لال تلمیذ نے لکھا ہے کہ ''میر صاحب عالی فطرت'' کو عبدالحیّ خان نے اپنے باپ کی اور اپنی چار تصنیفات کے متعلّق اورنگ آباد سے حیدرآباد آنے کی زحمت دی اور انھوں نے ان کتابوں کی تجدید و ترتیب و اصلاح کی (بہارستانِ سخن، قلمی، آصفیہ سنٹرل لائبریری، ص ۵)۔

[مآثر الامراء کا ایک صاف اور خوش خط قلمی نسخہ دانش گاہِ پنجاب میں موجود ہے۔ اس کی کتابت ربیع الآخر ۱۲۴۴ھ میں حیدرآباد دکن میں تمام ہوئی، کتاب کو ترقیمے میں ''تصنیفِ نوّاب صمصام الدولہ شہید و میر غلام علی آزاد مرحوم'' بتایا گیا ہے۔ شروع میں فہرستِ تراجم مرتّب بہ ترتیب تہجّی دی ہے۔ پھر ''تفصیل القاب (تیموریہ)'' اور اس کے بعد فہرستِ ''اولاد امجاد نوّاب آصف جاہ'']۔

اورنگ آباد میں انھوں نے شاہ مسافر غُجدُوانی معروف بہ بابا مسافر نقشبندی (م ۱۱۲۶ھ) کے تکیے میں، جو درگاہِ پن چکّی کے نام سے مشہور تھا، قیام کیا (ملفوظاتِ نقشبندیّہ)۔ انھوں نے ۲۱ ذوالقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء میں وفات پائی (T. W. Haig: *Historic Landmarks of the Deccan*، الٰہ آباد ۱۹۰۷ء، ص ۵۸)۔ ان کو خُلد آباد دکن، احاطۂ درگاہِ امیر حسنِ سنجَری دہلوی میں اس مقبرے کے اندر جو خود انھوں نے ''خواب گاہِ روشن'' کے نام سے ۱۱۹۱ھ میں تعمیر کرایا تھا، دفن کیا گیا۔ مادّۂ وفات ''آہ غلام علی آزاد'' [=۱۲۰۰ھ] ہے۔ مزار پر بہت لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں، مگر قبر پر کتبہ نہیں ہے۔

اُن کی مُہر پر ''فقیر آزاد'' کندہ تھا۔

اولاد: آزاد کے صاحبزادے نورالحسن نے ان کی زندگی میں وفات پائی، سیّد نورالحسن کے فرزند مفتی الممالک امیر حیدر بلگرامی کی اولاد حیدرآباد دکن، ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہے۔ یہ لوگ اب اثنا عشری شیعہ ہیں۔

تصنیفات: آزاد کی تصانیف حدیث، ادب، تاریخ، سوانح اور شعر کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ علامہ آزاد کی اہمّ تصانیف حسبِ ذیل ہیں:-

عربی میں: (۱) سُبحَة المَرجان فی آثار ھندوستان، تالیف ۱۱۷۷ھ/ ۱۷۶۳-۶۴ء، چاپ سنگی، بمبئی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء۔ اس میں چار فصلیں ہیں۔ پہلی اور دوسری فصل میں مصنّف کی دو مستقل اور جداگانہ کتابوں شمَامة العنبر اور تَسلِیة الفؤاد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب اُن حوالوں پر مشتمل ہے جو قرآن پاک کی تفاسیر اور احادیث میں ہندوستان کے متعلّق آئے ہیں اور دوسری مصنّف کے بعض قصائد و فوائد اور ہندوستان کے علماے دین اور دیگر اہلِ علم میں سے تینتالیس افراد کے سوانح حیات پر۔ تیسری فصل میں محسّناتِ کلام یعنی صنائع و بدائع (سنسکرت)، مصنّف کی دریافت یا ایجاد کردہ صنعتوں کا ذکر ہے اور چوتھی فصل میں نایکا بھید کا [فی بیان المعشوقات والعشّاق]۔ فصل ۳ و ۴ کا ترجمہ بعد میں خود مصنّف نے فارسی میں غِزلان الھند کے نام سے کیا تھا۔ آزاد نے سبحَہ میں اپنے سات سو اشعار مثال کے طور پر درج کیے ہیں (تذکرۂ علماے ہند، ص ۱۵۴)۔ قلمی نسخے مانچسٹر، کلکتہ مدرسہ، برٹش میوزیم میں ہیں، نیز دیکھیے مخطوطاتِ آصفیہ، ۱:۱۶۹، شمارہ ۲۱۳۵، برلن شمارہ ۱۰۵۱؛ دانش گاہِ پنجاب میں بھی سُبحة المرجان کا قلمی نسخہ ہے، جس کا کچھ حصّہ ۱۸۱۵ء میں اٹاوے میں نقل ہوا اور باقی ۱۸۳۷ء میں، اس کا خط نستعلیق ہے اور صاف ہے۔ (۲) مظہر البرکات عربی، تصوّف، بر وزن مثنوی معنوی (یعنی در بحر خفیف)۔ اس کے سات دفتر ہیں جو سترہ حکایات پر مشتمل ہیں۔ مصنّف کا خود نوشت مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ سنٹرل لائبریری میں ہے۔ حکیم عبدالحیّ نے اس کا نسخہ سیّد نورالحسن بن نوّاب سیّد صدیق حسن کے کتاب خانے میں دیکھا (نزھة الخواطر، ۶:۲۰۳)۔ دیگر نسخوں کے لیے دیکھیے سٹوری۔ (۳) دیوان ہاے عربی، الدواوین السبعة کا نسخہ نوّاب صدیق حسن خان کے پاس تھا (ابجد العلوم، ص ۹۲۶)۔ بظاہر یہی نسخہ بعد میں ان کے بیٹے نوّاب نورالحسن کے کتاب خانے میں لکھنؤ میں تھا، دیوانوں کا نسخہ بنام السبعة السیّارة صاحبِ نزھة الخواطر کے پاس بھی تھا۔ اسی نسخے کی بنا پر انھوں نے لکھا ہے کہ پہلے تین دیوان ان قصائد پر مشتمل ہیں جو (۱۱۷۹ھ سے) ۱۱۸۹ھ تک لکھے گئے۔ دانش گاہِ پنجاب میں الدیوان الاوّل و الثّانی و الثّالث کا مطبوعہ نسخہ ہے، اوّل و سوم مطبوعۂ کنز العلوم، حیدرآباد اور دوم مطبوعۂ لوح محفوظ، حیدرآباد۔ اوّل و سوم پر سالِ طباعت ۱۱۸۷ھ دیا ہے۔ چوتھا دیوان الدیوان المردّف ہے، یعنی اس میں ردیف والے قصیدے ہیں، جو آزاد نے اپنے پوتے امیر حیدر کے لیے تصنیف کیے (چند غیر مردّف قصائد بھی اس دیوان میں شامل ہیں)۔ پانچواں دیوان المستزاد ہے (تصنیف ۱۱۹۱ھ)۔ چھٹے دیوان میں ۱۳۴۰ بیت کے قصیدے ہیں اور ترجیع۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوے۔ ساتواں دیوان، وہ

قصائد جو ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۴ھ میں لکھے گئے۔ اور محرّم ۱۱۹۴ھ میں ختم ہوے۔

آزاد کے نویں اور دسویں دیوان کے نسخے دانش گاہِ علی گڑھ میں مجموعۂ سبحان اللہ میں موجود ہیں۔ ساتویں دیوان کے خطبے میں ہے کہ الدواوین السبعة میں مرآۃ الجمال شامل نہیں، جو سراپاے محبوب کے مضمون پر نونیہ قصیدہ ہے اور نہ ان میں وہ عربی مثنوی شامل ہے جو بحر خفیف میں ہے (جس کا اوپر ذکر ہوا، بنام مظہر البرکات)۔ ساتویں دیوان سمیت اشعار کی تعداد دس ہزار بیت ہے۔ چوتھے دیوان کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ آزاد ''حسّان الہند'' ہے۔

آزاد کے عربی اور فارسی کلام کے نمونے نزھة الخواطر، ص ۲۰۴ بعد؛ اتحاف النبلاء، ص ۳۳۱ - ۳۳۵؛ خزانۂ عامرہ، ص ۱۲۶ بعد؛ مردم دیدہ، ص ۳۵ - ۴۷ وغیرہ میں دیے ہیں۔

مطبوعہ دیوان کے لیے دیکھیے سٹوری، ۱:۸۶۱؛ مختار دیوان آزاد (انتخاب السبعة السیّارة)، لکھنؤ میں ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا (صَمَدَنی، ۲:۵۷۱ ح)۔ اس میں تین ہزار بیت ہیں۔ یہ مصنّف کے بیٹے سیّد نورالحسن نے مرتّب کیا (۱۱۶۸ھ)۔ (۴) ضوء الدّراری، شرح صحیح البخاری، بخاری کی شرح تا آخر کتاب الزکوٰۃ، نواب صدیق حسن، صاحبِ ابجد العلوم کو مصنّف کا خودنوشتہ نسخہ ملا تھا اور ان کے بیٹے سیّد نورالحسن کے کتاب خانے میں حکیم عبدالحیّ نے دیکھا تھا۔ کتاب میں متن بھی ہے اور شرح بھی (یعنی یہ شرح ممزوج ہے)۔ آزاد نے اس میں قَسْطَلّانی کی تلخیص دی ہے۔ یہ کتاب حرمَین شریفَین میں تصنیف کی گئی (نزھة الخواطر)۔ کتاب کا مخطوطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں شمارہ ۹۹ پر ہے؛ (۵) شفاء العلیل، کلامِ متنبّی پر اعتراضات، سیّد علی حسین بلگرامی کے کتاب خانے میں نسخہ ہے۔ (۶) کشکول، کتاب خانۂ آصفیہ کا نسخہ بخطِّ آزاد ہے۔ ندوے میں بھی نسخہ ہے (زبید احمد و شمس اللہ قادری)۔

فارسی میں: (۱) دیوان، ۹ ہزار بیت پر مشتمل (نزھة الخواطر، ۶:۲۰۳؛ اتحاف النبلاء؛ سٹوری، ۱:۸۶۲)۔ مصنّف کا اپنا نسخہ مکتبۂ رضا، رام پور میں ہے (فہرست خطّی، شمارہ ۳۷۴۷)۔ (۲) خزانۂ عامرہ (تالیف ۱۱۷۶ھ۔ کتاب میں ایک آدھ تاریخ اس کے بعد کی بھی ملتی ہے)۔ پرانے اور نئے تقریباً ۱۳۵ فارسی شعرا کا تذکرہ، جو حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا۔ اس میں آصف جاہ، اس کے بیٹوں اور بعض معاصر امرا کے تراجم، مرہٹوں کی مختصر سی تاریخ اور احمد شاہ ابدالی کا حال بھی آ گیا ہے۔ طبع کان پور ۱۸۷۱ء و ۱۹۰۰ء، عالی (نعمت خان) کے ترجمے میں آزاد نے اس کے مشہور قطعۂ ہجویّہ:

کد خدا شد بار دیگر خان عالی منزلت
با کمالِ عزّ و تمکین و وقار و زیب و زین

کی شرح لکھی ہے۔ یہ شرح قطعۂ نعمت خان عالی کے نام سے محرّم ۱۲۶۰ء میں طبع ہوئی (مطبع کا نام ندارد)۔ اس طباعت کا نسخہ کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب میں ہے اور شرح کا قلمی نسخہ کتاب خانۂ شفیعیّہ میں ہے (بدونِ تاریخ) اور دو نسخے رام پور میں ہیں (فہرست خطّی، شمارہ ۳۶۴۸ و ۳۶۴۹)۔ (۳) مآثر الکرام، در دو فصل، تالیف ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ - ۱۷۵۳ء، یہ کتاب بلگرام کے ۸۰ فقرا اور ۷۳ فضلا کے احوال پر مشتمل ہے (چاپ سنگی، آگرہ ۱۹۱۰ء)۔ (۴) سرو آزاد، در دو فصل، مآثر الکرام کی جلد دوم، تالیف ۱۱۶۶ھ، ہندوستان (بشمول بلگرام) کے رہنے والے یا ۱۰۰۰ھ کے بعد ہندوستان میں آنے والے ۱۴۳ فارسی اور اردو شعرا کے سوانح حیات، لاہور ۱۹۰۷ء (شمس اللہ: قاموس الاعلام، ص ۳۴، لاہور ۱۹۱۳ء)۔ (غلام حسن 'ثمین' صدیقی بلگرامی نے شرائفِ عثمانی، مآثر الکرام اور سرو آزاد کی مزعومہ غلطیوں کی تصحیح کے لیے لکھی، نسخہ در آصفیہ و کتاب خانۂ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ)۔ (۵) یدِ بیضاء (تالیف ۱۱۴۸ھ)، ۵۳۲ شعرا کی زندگی کے حالات مرتّبہ بہ ترتیب تہجّی، یہ کتاب ابتداءً سیوستان میں، جہاں آزاد نائب وقائع نگار تھے، ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء میں تالیف ہوئی۔ پھر ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ - ۱۷۳۶ء میں ترمیمات و زیادات کے بعد الٰہ آباد میں مکمّل ہوئی۔ آزاد حج سے واپس آئے تو اس میں مزید اضافے کیے، قلمی نسخے مخطوطاتِ آصفیہ، ۳:۱۶۲ اور فہرست انڈیا آفس لائبریری، شمارہ ۳۹۶۶ ب (سٹوری ۱: ۸۶۳ ببعد)۔ (۶) روضة الاولیاء، روضہ یا خلد آباد کے مدفون دس چشتی اولیاء اللہ کے حالات پر ایک مختصر سا رسالہ (روضہ اورنگ آباد سے تین میل پر ہے) طبع اورنگ آباد ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء۔ (۷) انیس المحقّقین اس کا ماخذ میر نوازش علی بلگرامی کی ایک بیاض ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اپنی مشہور کتابوں مآثر الکرام و سروِ آزاد میں اس سے مدد لی ہے۔ اس میں اولیاے بلگرام کے حالات کے علاوہ مکتوبات بھی ہیں (مخطوطۂ انیس المحقّقین، سنٹرل لائبریری حیدرآباد دکن میں ہے)؛ (۸) سند السعادات فی حسن خاتمة السادات، طبع ہوگئی ہے، بمبئ ۱۲۸۲ھ۔

آزاد کی تصانیف کی مفصّل فہرست کے لیے دیکھیے: (۱) *JASB*، ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۹ - ۱۳۰؛ (۲) شمس اللہ قادری: قاموس الاعلام، ۱: عمود ۳۳ - ۳۵؛ (۳) سٹوری (Storey)، ۱/۲: ۸۵۹ - ۸۶۶۔

آزاد کی عربی تحریر کی شیخ عبدالعلی بحرِینی نے بہت تعریف کی ہے؛ شفیق: گل رعنا۔ علّامہ باقر آگاہ مدراسی (۱۱۵۸ھ - ۱۲۲۰ھ) کے عربی قصیدۂ لامیّہ پر آزاد نے بعض اعتراضات کیے تھے جن کا جواب آگاہ نے اپنی تالیف چہارصد ایراد بر کلام آزاد میں مدلّل دیا ہے؛ آزاد نے جو اعتراضات جاہلی شاعر امرؤالقیس کے معلّقے اور بوصیری کے (؟) قصیدۂ بُردہ پر کیے تھے ان کا بھی جواب دیا ہے۔ مولوی مرتضٰی مدراسی، حیدرآبادی کی راے ہے کہ آزاد اور باقر آگاہ کی عربی تحریر شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی حجة اللہ البالغة کی عربی تحریر سے پست ہے اور اس سے عربی ادب میں کوئی مفید اضافہ نہیں ہوا (محمد مرتضٰی: مولوی محمّد باقر آگاہ، حیدرآباد دکن، ص ۸)۔

مآخذ: (۱) مصنّف کی خودنوشت سوانح عمری [اس کی اکثر کتابوں میں ہے،

خصوصًا دیکھیے:] سُبْحَۃ المَرْجان، ص ۱۱۸ - ۱۲۳ و خزانۂ عامرہ [کان پور ۱۸۷۱ء]، ص ۱۲۳-۱۴۵ (مخطوطۂ سنٹرل لائبریری، حیدرآباد، عدد ۲۶، ورق ۱۳۱) ومآثر الکرام، ص ۱۶۱ - ۱۶۴، ۳۰۳ - ۳۱۱؛ (۲) صدیق حسن خان: اتحاف النُبَلاء، ص ۳۳۰؛ (۳) وہی مصنّف: ابجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۵-۱۲۹۶ھ، ص ۹۲۰؛ (۴) فقیر محمد جیلمی: حدائق الحنفیّۃ، لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ص ۴۵۴؛ (۵) رحمٰن علی: تذکرۂ علماے ہند، ص ۵۴؛ (۶) وجیہ الدّین اشرف: بحر زخّار، (مخطوطہ) ورق ۳۱۵؛ (۷) Rieu: *Pers. Cat.*، ۱: ۳۷۳ب، ۳: ۹۷۶ب؛ (۸) ولیم چیمبرز (William Chambers): *Asiatic Miscellany*، کلکتہ ۱۷۸۵ء، ۱: ۴۹۶-۴۹۷؛ (۹) شبلی نعمانی: مقالات، ۵: ۱۱۸-۱۳۵؛ (۱۰) براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۲: ۶۰۰-۶۰۱؛ (۱۱) مقبول احمد صَمَدَنی: حیات جلیل بلگرامی (اردو)، الٰہ آباد ۱۹۲۹ء، ۲: ۱۶۳-۱۷۷ [نیز ۱: ۱۳۷ ببعد، ۲۴۹، ۲۷۱؛ ۲: ۴، ۱۶] ؛ (۱۲) ابراہیم خلیل: صُحُفِ ابراھیم، بذیل مادّہ؛ (۱۳) زبید احمد: *Contribution of India to Arabic Literature*، بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۱۴) کچھی نرائن شفیق: گلِ رعنا، بذیل مادّہ؛ (۱۵) محی الدّین زور: غلام علی آزاد بلگرامی، حیدرآباد دکن؛ (۱۶) غلام علی آزاد: غِزْلان الھند (مخطوطۂ سنٹرل لائبریری حیدرآباد، عدد ۱۶۴، ورق ۲)؛ (۱۷) علی اصغر بلگرامی (سیّد): فارسی بلگرام، (خطابہ در جامعۂ معارف) حیدرآباد دکن ۱۳۴۷ھ، ص ۲۶-۳۶؛ (۱۸) محمد مرتضٰی: مولوی باقر آگاہ، ص ۸۷ (سلسلۂ تالیفات انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم حیدرآباد، مطبوعۂ مطبع فیض الکریم، حیدرآباد دکن)؛ (۱۹) اصل سند، ۱۱۷۳ھ، بمہر میر محمد شریف خان المخاطب بہ بسالت جنگ امیر الامراء، شجاع الملک، ابن آصف جاہِ اوّل، دیوان حیدرآباد (کتب خانہ سیّد علی اصغر بلگرامی، حیدرآباد دکن)؛ (۲۰) مانک راؤ وٹھل راؤ: بستانِ آصفیہ (تاریخ)، مطبوعۂ انوارالاسلام، حیدرآباد دکن ۱۳۲۷ھ؛ (۲۱) شاہ محمود: ملفوظاتِ نقشبندیہ (حالات بابا شاہ مسافر غُجْدُوَانی)، محکمۂ امورِ مذہبی، حیدرآباد ۱۳۵۸ھ؛ (۲۲) عبدالرزّاق شہنواز خان: بہارستانِ سخن (تذکرۂ شعراے فارسی)، مقدّمہ از پیم چند عرف مٹھن لعل تلمیذ آزاد و میر رضی، مخطوطہ عدد ۱۹۳، سنٹرل لائبریری حیدرآباد؛ (۲۳) عبدالجبّار خان ملکا پوری: تذکرۂ شعراے دکن، مطبوعۂ حیدرآباد دکن؛ (۲۴) محمد باقر آگاہ: چہار صد ایراد بر کلام آزاد بلگرامی، (مخطوطے کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد و آصفیہ و جامعۂ علی گڑھ و مجموعۂ شروانی و انجمن ترقیِ اردو پاکستان، میں ہیں)؛ [(۲۵) عبدالحکیم حاکم: مردم دیدہ، تصحیح سیّد عبداللہ، لاہور ۱۳۳۹ش/ ۱۹۶۱ء، ص ۳۴ - ۵۱ و اشاریہ؛ (۲۶) علی شیر قانع: تحفۃ الکرام، دہلی ۱۳۰۴ھ، ۲: ۹۶؛ (۲۷) حکیم عبدالحیّ: نزھۃ الخواطر، حیدرآباد دکن ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء، ۶: ۲۰۱؛ (۲۸) رسالۂ معارف، اعظم گڑھ ۱۹۶۲ء؛ شمارہ ہاے رُبع اوّل، ۱۹۶۲ء، مقالۂ آزاد بلگرامی ۱ - ۳ و تصحیح و استدراک، مارچ و مئی ۱۹۶۲ء؛ (۲۹) مجلۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ۲/ ۲، دسمبر ۱۹۶۱ء، ص ۹۳ - ۱۲۰].

(ابوسعید بزمی، انصاری و سخاوت مرزا و ادارہ)

آزاد: تخلّص، مولوی محمد حسین المعروف بہ شمس العلماء، اصلی وطن دہلی، ⊗ [تاریخِ ولادت (پنشن کی درخواست کی رو سے)] ۵ جون ۱۸۳۵ء، [ذی الحجّہ ۱۲۴۵ھ/ جون ۱۸۳۰ء، مولانا کے لڑکے کے بیان کی رُو سے، دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۲۱ء، ۲۱ ج؛ ذوق نے تاریخِ پیدائش کہی تھی: ''ظہورِ اقبال'' وہ بھی = ۱۲۴۵ھ ہے]۔ ان کے نگڑ دادا مولانا محمد شکوہ شاہ عالم کے دورِ حکومت میں ہَمَدان سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوے اور اپنے علم و فضل کے باعث دربارِ شاہی کے وظیفہ خوار اور عوام کے نزدیک ذی مرتبت عالم و مجتہد قرار پائے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے محمد اشرف نے مسندِ اجتہاد کو زینت بخشی اور ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے محمد اکبر بھی مجتہد اور عالمِ دین ہوے۔ ان تینوں بزرگوں کی شادیاں ایرانی خواتین سے ہوئی تھیں۔ مولانا محمد اکبر تک بھی صحیح اردو نہ بول سکتے تھے۔ لیکن انھیں کے زمانے میں اس خاندان کی زبان اردو ہوگئی۔ مولانا محمد اکبر نے اپنے صاحبزادے محمد باقر کی شادی دہلی ہی کی ایک ایرانی نژاد خاتون سے کی، جس کے بطن سے مولوی محمد حسین آزاد پیدا ہوے۔ مولوی محمد باقر نے اپنے والد کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اپنے والد محترم کی زندگی ہی میں اس مدرسے میں درس بھی دینے لگے۔ سیّد رجب علی، جنھوں نے بعد میں ''ارسطو جاہ'' کا خطاب پایا، اسی مدرسے کے طالب علم تھے۔ مولوی محمد باقر نے فراغتِ تحصیل کے بعد سرکاری ملازمت کر لی [اور عدالت میں نظارت کے عہدے تک پہنچے] لیکن بعد میں مولانا محمد اکبر نے ان سے استعفٰی دلوادیا اور مسندِ اجتہاد پر اپنا جانشین مقرر کیا۔ قاری جعفر علی جو بعد میں مجتہد ہو گئے، مولوی محمد باقر کے ہم سبق تھے۔ مولانا محمد اکبر کے انتقال کے بعد بعض وجوہ سے مولوی محمد باقر اور قاری جعفر علی میں مذہبی اختلافات رونما ہوے اور دونوں کے مدّاحوں کی الگ الگ جماعتیں باقری اور جعفری کے ناموں سے بن گئیں۔ مولوی محمد باقر تو اپنی ذاتی اور خاندانی وجاہتِ علمی کی وجہ سے معزّز تھے لیکن قاری جعفر علی کی اہمیّت زیادہ تر نوّاب حامد علی خان کی سرپرستی کی وجہ سے تھی، جو اس وقت بہادر شاہ کے دربار میں مختار تھے اور دہلی میں ان کا بڑا رسوخ و اقتدار تھا۔

ان دنوں دہلی کالج بہت زوروں پر تھا۔ اس میں دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علومِ متداولہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس کے پرنسپل ایک انگریز مسٹر ٹیلر (Taylor) تھے، جنھوں نے اپنی نگرانی میں انگریزی، ریاضی، جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ مولوی محمد باقر نے اپنے صاحبزادے محمد حسین کو علومِ دینیہ کی تعلیم دی لیکن بعد میں مسٹر ٹیلر کی ترغیب پر انھیں دہلی کالج میں داخل کرا دیا۔ یہاں قاری جعفر علی شیعہ دینیات کے معلّم تھے۔ مولوی محمد باقر بپاسِ پابندیِ وضع کبھی قاری صاحب سے دو بدو نہیں ہوے لیکن اپنے شاگردوں سے ان پر اعتراضات کرا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ محمد حسین نے بھی آئے دن قاری صاحب کی تقاریر پر اعتراضات شروع کیے، قاری صاحب کی شکایت پر پرنسپل نے حکم دیا کہ وہ سنّی فقہ کی جماعت میں شامل ہوا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی محمد

حسین سنّی وشیعہ دونوں مذہبوں کی فقہ سے واقف ہو گئے۔ [۲۳ برس کی عمر میں کالج سے کتبِ درسیہ عربی کی پڑھ کر نکلے]۔

مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ مولوی محمد حسین نے مضمون نگاری کی اوّلین تربیّت بھی گھر ہی سے حاصل کی۔ مولوی محمد باقر علم واجتہاد کے باوجود ادب وشعر میں درخورِ وافی رکھتے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق سے ان کے روابط زمانۂ طالب علمی ہی سے چلے آتے تھے۔ جوروز بروز زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ انھوں نے اپنے صاحبزادے مولوی محمد حسین کو بچپن ہی سے ذوق کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ذوق محمد حسین آزاد کے حال پر بے حد شفقت فرماتے اور ہر مشاعرے اور جلسے میں انھیں اپنے ساتھ رکھتے۔ صفر ۱۲۷۱ھ/نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا؛ جس کے بعد محمد حسین آزاد نے حکیم آغا جان عیش سے رجوع کیا، جو خاندانی اور شاہی طبیب ہونے کے علاوہ ادب وشعر میں بھی صاحبِ فضل وکمال تھے؛ لیکن محمد حسین آزاد ان سے صرف ڈھائی سال استفادہ کر سکے۔ غدر کے چند روز بعد حکیم عیش کا انتقال ہو گیا۔

مولوی محمد باقر کی جائداد دہلی میں خاصی تھی۔ کتب خانہ، اخبار کا دفتر اور مطبع بھی تھا اور ان کا خاندان فراغت سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں دہلی میں قتل وخون اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم ہوا۔ دہلی کالج کے مسٹر ٹیلر جان بچا کر بھاگے اور سیدھے مولوی محمد باقر کے پاس پہنچے، جن سے سالہا سال کے مخلصانہ تعلّقات تھے۔ مولانا نے انھیں کئی دن تک امام باڑے میں چھپائے رکھا لیکن ہندوستانی سپاہیوں کو خبر مل گئی اور ان کے ہاتھوں مسٹر ٹیلر مارے گئے۔ جب دہلی پر انگریزی فوج کا تسلّط ہوا تو مولانا باقر کو مسٹر ٹیلر کے قتل کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔

مولوی محمد حسین آزاد کی عمر اس وقت کوئی تیس سال کی تھی۔ ان کے ساتھ بائیس آدمیوں کا کنبہ تھا۔ اس خاندان نے اپنا سارا اثاثہ وہیں چھوڑا اور جانیں لے کر نکل کھڑے ہوے۔ مطبع کے منتظم بڑے بھروسے کے آدمی تھے، کنبے کو ان کے سپرد کیا کہ سونی پت لے جائیں اور مولانا محمد حسین آزاد، بقول ان کے، محض استاد ذوق کی غزلوں کا ایک پلندا بغل میں دبائے آوارۂ روزگار ہو گئے۔ کچھ مدّت وسطِ ہند میں ٹکریں مارتے رہے، پھر پنجاب کا رخ کیا اور شاعری کی بدولت ریاست جیند کے راجا سے انعام واکرام حاصل کیے۔ کوئی چھے ماہ یہاں رہ کر لدھیانے چلے گئے، جہاں ارسطو جاہ سیّد رجب علی میر منشی گورنر پنجاب نے ''مجمع البحرین'' کے نام سے ایک مطبع جاری کر رکھا تھا۔ یہاں آزاد کتابت پر اور ارسطو جاہ کے بچوں کی تعلیم پر مامور ہوے۔ اطمینانِ خاطر میسّر ہوا تو اہلِ خاندان کو بھی سونی پت سے لدھیانے میں بلوالیا۔

لیکن یہاں بھی زیادہ دیر ٹھیرنا نصیب نہ ہوا۔ لاہور گئے اور ڈاک خانے میں ایک ملازمت کر لی۔ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب سے مولانا محمد حسین آزاد کی ملاقات ۱۸۶۰ء میں لدھیانے کے ڈاک بنگلے میں ہو چکی تھی۔ ۲۵ مئی ۱۸۶۱ء کو انھوں نے ڈائرکٹر کو ایک خط لکھا، جو مکتوباتِ آزاد میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد آزاد ڈاک خانے کی پندرہ روپے ماہوار کی ملازمت چھوڑ کر محکمۂ تعلیم میں آ گئے، [اس ملازمت کا آغاز یکم جنوری ۱۸۶۴ء سے ہوا۔ اوّلاً وہ ۳۵ روپے ماہوار پر نائب سررشتہ دار مقرّر ہوے پھر محرّر]۔ ڈائرکٹر تعلیمات میجر فلر (Fuller) محکمے کی طرف سے ایک تعلیمی اخبار بھی جاری کرنا چاہتے تھے اور ایک تعلیمی انجمن بھی قائم کرنے کے خواہش مند تھے؛ چنانچہ اتالیقِ پنجاب کے نام سے ایک اخبار جاری کیا گیا اور ''انجمن پنجاب'' کے نام سے انجمن قائم کی گئی۔ ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی اس اخبار کے ایڈیٹر اور آزاد اس کے سب ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ کچھ مدّت آزاد تصنیف وتالیف کے کام کے لیے علٰیحدہ ہو گئے اور ان کی جگہ سب ایڈیٹری پر خواجہ الطاف حسین حالی مقرّر ہوے۔

۱۸۶۵ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے ایک جماعت بعض سیاسی معلومات فراہم کرنے کی غرض سے وسطِ ایشیا کے ملکوں میں بھیجی گئی، جس میں مولوی محمد حسین آزاد بھی شامل تھے۔ بارہا جاسوسی کے شبہہ کی وجہ سے جان کا خطرہ بھی لاحق ہوا لیکن بالآخر [تقریباً آٹھ ماہ (۲۳ جولائی ۱۸۶۵ - ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء)] کے بعد وہ ضروری معلومات لے کر لوٹے۔ اب آزاد کی شخصیت سرکاری حلقوں میں بہت وقیع واہمّ ہو گئی تھی۔ [واپسی پر سوا دو سال تک وہ ''یونیورسٹی کالج'' میں مدرّسِ عربی وریاضی رہے۔ پھر تقریباً ایک سال پچھتر روپے ماہوار پر گورنمنٹ سنٹرل بک ڈپو میں مترجم کا کام کرتے رہے]، آخر [۵ جولائی ۱۸۶۹ء سے] آزاد کی خدمات [گورنمنٹ کالج، لاہور] میں منتقل کر دی گئیں اور وہ عربی کے [اسسٹنٹ] پروفیسر مقرر ہوے [تقریباً دس ماہ تک قائم مقام اور پھر مستقل]۔ [اکتوبر ۱۸۸۴ء سے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اورینٹل کالج متعیّن ہوے اور چند مہینوں کی فرلو کے بعد پھر گورنمنٹ کالج میں واپس آ گئے۔ اورینٹل کالج کی روئدادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶ فروری ۱۸۸۷ء کو مولانا فیض الحسن سہارن پوری نے وفات پائی تو مولوی محمد حسین آزاد شعبۂ عربی کے سپرنٹنڈنٹ مقرّر ہوے]۔

مسلسل دماغی محنت، بعض عوارض، مثلاً بواسیر وغیرہ، بچوں کی مسلسل اموات — ان سب نے مل کر آزاد کو دائم المرض بنا دیا۔ ۱۸۸۵ء میں انھوں نے دوبارہ سفرِ ایران اختیار کیا۔ ایک سال بعد واپس آئے اور کتب خانۂ آزاد کے نام سے نہایت بیش بہا قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم کیا۔ ۱۸۸۷ء میں ملکۂ وکٹوریا کی جوبلی کے موقع پر آزاد کو شمس العلماء کا خطاب اور خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں آزاد کا دماغی توازن بگڑ گیا [اور ۱۶/اکتوبر ۱۸۸۹ء سے وہ رخصتِ علالت پر چلے گئے] اور ایسا جنون لاحق ہوا کہ مرتے دم تک رہا۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو کہ شبِ عاشورہ تھی شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کا انتقال ہو گیا اور کربلاے گامے شاہ، لاہور میں دفن کیے گئے۔

مولوی محمد حسین آزاد کا درجہ اردو کے نثر نگاروں میں نہایت بلند ہے۔ وہ

اعلیٰ درجے کے زبان دان اور ادیب تھے۔ اردو پر پوری قدرت رکھتے تھے اور فارسی کے ذوقِ صحیح کی وجہ سے اردو زبان کو وسیع اور مالا مال کرنے کی اہلیّت رکھتے تھے۔ وہ نثر میں نہایت دل آویز اسلوب کے مالک ہیں۔ متانت و پختگی کے ساتھ شیرینی و دل آویزی کو جمع کرنا آزاد ہی کا کمال ہے۔ ان کے منظوم کلام کی عام خصوصیات ہیں: ''سادگی، خوبصورت تشبیہات و استعارات، صحت مند اخلاقی رنگ اور متکلّفانہ تزیینِ کلام سے احتراز''.

آزاد کی تصانیف سولہ سترہ سے زیادہ ہیں، جن کی کیفیت درج ذیل ہے:-

۱- نصیحت کا کرن پھول (لڑکیوں کے لیے)، ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی اور چند سال بعد شائع ہوئی (طبع ثانی ۱۹۱۷ء میں)؛

۲- قَصَصِ ہند، حِصّۂ دوم، صرف مسلمانوں کا حال، لاہور ۱۸۷۲ء، [طبع لاہور ۱۹۶۱ء (تعارف از خلیل الرحمٰن داؤدی)]؛

۳- نگارستانِ فارس، ۱۸۶۷ سے ۱۸۷۲ء تک لکھی گئی اور آزاد کے پوتے آغا طاہر نے ۱۹۲۲ء میں شائع کی؛

۴- سخندانِ فارس، پہلے حصّے کے بعد دوسرا حصّہ ۱۸۷۷ء میں ترتیب پایا۔ ۱۸۸۷ء میں ترمیم ہوئی اور آغا ابراہیم (خلفِ آزاد) نے ۱۹۰۷ء میں شائع کی؛

۵- نیرنگِ خیال، ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی اور ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی (طبع ثانی مع زیادات ۱۸۸۳ء)؛ جولائی ۱۸۷۶ء میں رسالۂ انجمن قصور میں اس کا ایک مضمون چھپا؛

۶- نظمِ آزاد، زیادہ تر نظمیں ۱۸۷۴ء میں لکھی گئیں۔ مجموعہ آغا ابراہیم نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا؛ طبع ثالث ۱۹۲۶ء میں؛

۷- آبِ حیات، ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی؛

۸- قندِ پارسی، ۱۸۸۰-۱۸۸۱ء میں لکھی گئی۔ مسوّدہ ایران لے گئے، جہاں حاجی محمد نے اصلاح کی۔ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی؛

۹- جامع القواعد، ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی؛

۱۰- دربارِ اکبری، ۱۸۸۲ سے ۱۸۸۷ء تک لکھی اور ۱۸۹۸ء میں شائع کی گئی [مگر آزاد نے ۱۸۷۶ء میں عبدالرحیم خانخاناں اور بیربر پر رسالۂ انجمن قصور میں مقالات شائع کیے۔ یعنی اکبری مشاہیر کا مطالعہ برسوں پہلے شروع کر دیا تھا]؛

۱۱- دیوانِ ذوق، طبع اوّل ۱۸۹۰ء، طبع دوم ۱۹۲۲ء؛

۱۲- لغتِ آزاد، بعد مراجعت از ایران ۱۸۸۷ء میں لکھی، ان کے انتقال کے بعد ۱۹۲۴ء میں آغا طاہر نے لاہور سے شائع کی؛

۱۳- ڈراما اکبر، ۱۸۸۸ء کے قریب یہ ڈراما نامکمّل صورت میں تحریر ہوا، ۱۹۰۶ء میں مخزن میں شائع ہوا، ۱۹۲۲ء میں سیّد ناصر نذیر فراق نے مکمّل کیا اور لاہور سے ۱۹۲۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا؛

۱۴- آموز گارِ پارسی، بعد مراجعت از ایران ۱۸۸۷ء میں تصنیف ہوئی؛

۱۵- مکتوباتِ آزاد، طبع اوّل، مخزن پریس لاہور ۱۹۰۷ء، مرتّب سیّد جالب دہلوی، طباعت ثانی، بہ ترمیم و اضافہ ۱۹۲۳ء میں آغا طاہر نے شائع کی، خواجہ حسن نظامی اور سیّد ناصر نذیر فراق نے دیباچے لکھے؛

۱۶- اردو فارسی کی ابتدائی کتبِ درسی یعنی اردو کی پہلی اور دوسری (سلسلۂ قدیم)؛ فارسی کی پہلی اور دوسری؛ اردو کی ریڈریں پہلی سے چوتھی تک؛

۱۷- سنینِ اسلام، ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) کے ساتھ مل کر لکھی؛

۱۸ - ۲۰- زمانۂ جنون میں بھی آزاد نے بعض چیزیں لکھیں، جن میں جانور ستان اور رسائل سِپاک و نماک [طبع دارالاشاعت لاہور، طبع ثانی لاہور ۱۹۲۷ء][اور فلسفۂ الٰہیات (لاہور ۱۹۲۶ء)] شامل ہیں؛

۲۱- سیرِ ایران، لاہور، سنۂ طباعت درج نہیں؛

۲۲- خُمکدۂ آزاد، قطعات، غزلیات وغیرہ کا مجموعہ، دہلی ۱۹۳۰ء.

مآخذ: (۱) آغا محمد باقر کا مقالہ، ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۳۹ء، ص ۴۱؛ (۲) رام بابو سکسینہ و محمد عسکری: تاریخ ادبِ اردو، لکھنؤ، ص ۴۹۰-۴۹۷، تذکرۂ مولوی محمد حسین آزاد؛ (۳) محمد یحییٰ تنہا: سِیَر المصنّفین، حصّۂ دوم، ص ۱۵۸ ببعد؛ (۴) شیخ عبدالقادر: *New School of Urdu Literature*، لاہور ۱۹۲۱ء، ص ۳۱-۴۹؛ [(۵) ڈاکٹر محمد صادق: (ا) *Muhammad Husain Azaad*، رسالۂ دکتری، غیر مطبوعہ، کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب؛ (ب) مقالہ ''آزاد معاصرین کی نظر میں''، در مجلّۂ نئی تحریریں، لاہور، ص ۲۲-۴۱؛ (ج) مقالہ ''آزاد کی حمایت میں''، در صحیفہ، لاہور، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۶۳-۸۵؛ (۶) غلام حسین، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۹ ببعد، فروری ۱۹۶۲ء، (۷) محمد شفیع: ''شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد''، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۹-۲۹؛ (۸) جہاں بانو بیگم نقوی: محمّد حسین آزاد، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۰ء؛ (۹) رسالۂ انجمن قصور، جولائی و مئی و اگست ۱۸۷۶ء].

(عبدالمجید سالک)

آزاق: روسی زبان میں: آزوف (Azov)، اطالوی اسے قدیم [یونانی] نام تاناییس (Tanaïs) (بارْبُرو Jos.Barbaro کا "Old-Tana") کے تتبّع میں تانہ (Tana) کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ مقام سب سے پہلے ۱۳۰۶ء کے ایک اطالوی نقشے میں نظر آتا ہے۔ ترکی نام آزاق ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء سے سکّوں پر منقوش نظر آتا ہے۔ آزاق میں پہلے جنویوں نے ۱۳۱۶ء کے قریب، پھر اہلِ وَینِس نے ۱۳۳۲ء میں اپنی تجارتی بستیاں قائم کیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقۃً مسلمان تاتاریوں ہی کا شہر رہا، جس پر والیانِ تاتاری حکومت کرتے تھے؛ مثلاً ۱۳۳۴ء کے قریب محمد خواجہ، ۱۳۴۷ء اور ۱۳۴۹ء میں سچی بیگ اور ۱۳۵۸ء میں تُوْلُوبِک۔ یہاں خوانین کی ایک ٹکسال ۱۴۱۱ء تک کام کر رہی تھی۔ *

آزاق چودھویں صدی میں مشرق ومغرب کی باہمی تجارت کی بڑی منڈی تھا، اُس کے زوال کا سبب شاید زیادہ تر جنوی (Genoese) شہر کَفَّہ (Kaffa) سے مقابلہ تھا نہ یہ کہ جانی بیگ (۱۳۴۳ - ۱۳۵۸ء) کی روش اطالوی نوآبادیوں کی جانب معاندانہ تھی یا یہ کہ تیمور نے اُسے تاخت وتاراج کیا (ستمبر ۱۳۹۶ء)۔ عثمانیوں نے یہ شہر ۱۴۷۵ء میں فتح کیا اور ۱۵۴۵ء کے 'دِفتر' میں آزاق کو کَفَّہ کی سَنْجَاق کی ایک 'قضا' بتایا گیا ہے۔ یہ شہر تین حصّوں پر مشتمل تھا: (۱) وِنْدِیک قَلْعِہ سِی (اِوْلِیاء چِلِبی میں: فْرِنْگ حِصاری)، جس میں قَلْعہ نشین فوج سمیت ایک سو اٹھانوے مسلمان خاندان آباد تھے؛ (۲) جِینِیوِیز قَلْعہ سِی [بعد میں اَوْرَتہ حصار]، جس میں قلعہ نشین فوج سمیت ایک سو نو مسلمان خاندان آباد تھے؛ (۳) طُوپْراق قَلْعِہ، جس میں پانچ سو تاتاری آقِینْجِی، ایک سو چار خاندان ماہی گیروں کے اور ستاون یونانی خاندان آباد تھے۔ اس دور میں اس شہر کے اہم وسائلِ معاش وسیع پیمانے پر ماہی گیری، مچھلی کے اچار (caviar) کی بڑی مقدار میں تیاری اور غلاموں کی تجارت پر مشتمل تھے۔ بعد کے دور میں جب اسے قزاقوں (Cossacks)، چرکسوں اور روسیوں کے حملوں کا خطرہ لاحق ہونے لگا تو عثمانیوں نے آزاق کو شمال میں اپنا اہمّ فوجی مستقرّ بنا لیا۔ محاصرے کا پہلا خطرناک اقدام ۱۵۵۹ء میں قزاقوں کے ایک سردار دِمِتْرَش نے کیا۔ آخر کار گو ۱۶۳۷ء میں قزاقوں نے اس پر قبضہ کرلیا، ۱۶۴۲ء میں وہ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ چونکہ بعد کے سالوں، بالخصوص ۱۶۵۶ اور ۱۶۵۹ء، میں قزاقوں نے ازسرِ نو حملے شروع کردیے۔ اس لیے عثمانیوں نے اسے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنا دیا۔ (۱۶۶۶ء میں اِوْلِیاء چِلِبی نے اس میں تیرہ ہزار قلعہ نشین فوج اور بہت سی توپیں دیکھیں)۔ بعدازاں انھوں نے اس کے اردگرد مزید استحکامات بھی بنا دیے، مثلاً سدِّ اسلام۔ ۱۶۹۵ء میں آزاق پر پیٹر اعظم نے ایک ناکام حملہ کیا مگر ۶/اگست ۱۶۹۶ء کو اُس نے اس شہر کو سَر کرلیا اور گو معاہدہ پُروت (Prut [۱۱۲۳ھ]/۱۷۱۱ء) کی رُو سے وہ اس شہر کو عثمانیوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگیا، تاہم اس نے اس شہر کو دو سال بعد خالی کیا۔ روسیوں نے یہ شہر ۱۷۳۶ء میں دوبارہ فتح کرلیا۔

[۱۹۳۵ء کی سرشماری کے مطابق آزاق کی آبادی ۱۹،۷۹۶ نفوس پر مشتمل تھی]۔

مآخذ: (۱) A. S. Orlov: *Skazočnia povsti ob Azov*، وارسا ۱۹۰۶ء؛ (۲) اِوْلِیاء چِلِبی: سیاحت نامہ، ج ۲ و ۷؛ (۳) I. Bykadorov: *Donskoe Voisk...1540-1646*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۴) B. H. Sumner: *Peter the Great and the Ottoman Empire*، اوکسفرڈ ۱۹۴۹ء؛ (۵) W. Heyd: *Hist.du Commerce du Levant*، ج ۲؛ (۶) A. Refik، در *TOEM*، ۱۶: ۲۶۱-۲۷۵؛ (۷) A. N. Kurat: *Isveç Kîraî, XII Karl....*، استانبول ۱۹۴۳ء؛ (۸) C. Baysun: *Azak*، در *I.A.*.

(اِینالجِک H. INALCIK)

آزر: نام کی صراحت کے ساتھ اس کا ذکر قرآن مجید میں ایک ہی جگہ آیا ہے۔ سورۂ ۶ [الانعام]: ۷۴ میں ہے: وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ ءَازَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً صفاتی ذکر، یعنی حضرت ابراہیمؑ کے والد کا ذکر دو جگہ اَور بھی آیا ہے، سورۃ البراءۃ [۹: ۱۱۴] اور سورۃ الزُّخْرُف [۴۳: ۲۶] میں۔ بائبل میں ہے کہ ابراہیمؑ کے علاوہ تارَح (Terah) کے اَور بیٹے ناحُور (Nahor) اور ہاران (Haran) بھی تھے (التکوین، ۱۱: ۲۶)۔ آزَر نے ۲۰۵ سال کی عمر پائی اور اس کی وفات شام کے مشہور و قدیم شہر حرّان میں ہوئی (التکوین، ۱۱: ۳۲)۔ بائبل میں یہ بھی ہے کہ تارَح نے جب اپنے بھتیجے لوط کے ہمراہ اُوْر (Ur) سے ارضِ کنعان کی طرف ہجرت کی تو ابراہیمؑ اور گھرانے کے دیگر لوگ بھی ان کے ہمراہ تھے [التکوین، ۱۱: ۳۱]۔ [بظاہر یہودی علما کی روایت پر انحصار کرتے ہوے] عرب مؤرّخ ابن حبیب نے ان کی عمر ۲۵۰ سال لکھی ہے (کتاب المحبَّر، ص ۴)۔ عربی تورات میں اس نام کا املا تارَح ہے۔ ابن حبیب کی کتاب المحبَّر میں ہے: ''تارح وھو آزر'' اور راغب کی مفردات القرآن میں ہے: ''کان اسم ابیہ تارح فَعُرِّبَ فُجُعِلَ آزر'' (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح تھا، جب اُسے مُعَرّب کیا گیا تو آزر ہوگیا)۔

[تارح اور آزر کے متعلّق مفصّل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر المنار، ۷: ۵۲۵ ببعد۔ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے مُفسّروں، مؤرّخوں اور اہلِ لغت کا قول ہے کہ ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ یا تارح اور آزر لقب تھا یا آزر اس کے بھائی یا باپ یا بُت کا نام تھا؛ الزّجّاج، اور الفَرّاء سے منقول ہے کہ نسّابوں اور مؤرّخوں میں اختلاف نہیں ہے کہ ابوابراہیمؑ کا نام تارخ یا تارح ہے، لیکن ان اقوال کی اصل جو نبیؑ تک پہنچتی ہو یا عرب اوّلین سے منقول ہو، موجود نہیں۔ محدّثین اور مؤرّخین کے اقوال نقل کرنے کے بعد صاحب المنار کہتے ہیں: اگر ان دو اقوال کو جمع کیا جاسکتا ہے تو فبہا ورنہ ہم مؤرّخین کے قول اور سِفْرالتکوین کو ردّ کرتے ہیں اس لیے کہ وہ ہمارے نزدیک حجت نہیں کہ ہم اُس کے اور ظواہرِ قرآن کے درمیان تعارض کو حساب میں لیں۔ نہیں بلکہ قرآن سابقہ چیزوں کا محافظ ہے، جس کی وہ تصدیق کرتا ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور جس کی وہ تکذیب کرتا ہے اس کی تکذیب۔ دو قولوں کو جمع کرنے کے متعلّق اقوال میں ضعیف ترین قول یہ ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے چچا کا نام تھا [قبؔ سیّد احمد خان: تفسیر القرآن، آگرہ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء، ۳: ۵۶؛ ابوالکلام: ترجمان القرآن، دہلی ۱۹۳۱ء، ۱: ۴۳۱ح] اور عرب چچا کو مجازاً باپ کہتے ہیں مگر یہ مجازی استعمال وہیں صحیح ہوتا ہے جہاں قرینہ موجود ہو جو مراد پر دلالت کرے؛ آیات میں وہ قرینہ موجود نہیں۔ ضعف میں اس سے قریب وہ قول ہے کہ آزر خادم الصنم تھا، مضاف (خادم) حذف ہوا، مضاف الیہ (آزر) کو اس کی جگہ رکھا؛ قوی ترین قول یہ ہے کہ تارح (بمعنی متکاسل) لقب ہے اور آزَر عَلَم (بمعنی خطا کار یا اعوج یا اعرج) یا بالعکس (یعنی آزر لقب اور تارح علم)۔ یا شاید آزر تحریف تارح ہو۔

[ایل یعازر جسے کتاب تکوین میں ابراہیمؑ ''مالکُ بَیتِی'' کہتے ہیں اس کا ربط آزر سے جیسا کہ مادّہ آزر کے مقالہ نگار نے، آ کے طبع جدید میں تجویز کیا ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ ترجمۂ سیل (Sale)، ص ۹۵ کے حواشی بھی دیکھیے، وہاں یُوسِی بِی اس (Eusebius) اور تالمود سے لے کر آزر سے ملتے جلتے نام ابراہیمؑ کے باپ کے دیے ہیں، مگر دونوں ماخذوں کا پورا حوالہ نہیں دیا]۔ [اس سلسلے میں استاذ امین الخولی نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ۲/۱: ۳۹ میں لکھا ہے]:

یہ کہنا کہ اس آیت [الانعام: ۷۴] میں آزر مطلقاً ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے صحیح نہیں، کیونکہ آیت کی قراءت کئی طرح کی گئی ہے، جس سے لفظ آزر کے معانی اور اعراب بدل جاتے ہیں۔ ان قراءتوں میں سے بعض میں یہ متعیّن طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے والد کا نام نہیں اور بعض میں احتمال باقی رہتا ہے۔ ان قراءتوں اور اعرابوں کا مختصر بیان یہ ہے:

یہ لفظ مصحف میں اس طرح لکھا گیا ہے: ''ءَازَرَ اتَتَّخِذُ اصْنَامًا.....'' اور یوں پڑھا گیا ہے ''أَأَزَرًا'' نصب اور تنوین کے ساتھ اور ''آزرَ'' نصب بلا تنوین کے ساتھ اور ''آزرُ'' ضم کے ساتھ۔ پہلی قراءت کے لحاظ سے اس لفظ کی تفسیر یوں کی جاتی ہے کہ یہ لفظ عربی ہے اور اس کے معنے قوّت ہیں اور پہلا ہمزہ استفہام انکاری کا ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ: ''کیا قوّت کے سبب تو بت بناتا ہے؟ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''أَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ'' (سورۂ ۴ [النساء]: ۱۳۹)۔ اس قراءت کی رو سے اگر ''آزر'' کو اسمِ علم قرار دیا جائے تو اس کی تفسیر یہ نہ ہوگی کہ وہ ابراہیمؑ کا باپ تھا.

اگر نصب بلا تنوین پڑھا جائے تو اس میں کبھی نعت کا پہلو پیدا ہو جائے گا اور کبھی بدل یا عطف بیان ہو جائے گا اور اس وقت یہ احتمال باقی رہے گا کہ اس کا نام بھی ہے اور بالضم قراءت میں، جو ندا کی وجہ سے ہے، یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ ان کا نام ہوگا.

یہ چار وجہیں ہیں جو آیتوں کی قراءتوں کی تخریج کے سلسلے میں نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض پر نظر کرنے سے متعیّن ہوتا ہے کہ دو میں آزر ابراہیمؑ کے باپ کا نام نہیں اور دو میں احتمال باقی رہتا ہے کہ نام ہے۔ اس لیے یہ علمی انداز نہیں ہے کہ کوئی ناقل قرآن سے مطلقاً یہ قول لکھ دے کہ سورۂ ۶ [الانعام]: ۷۴ میں آزر ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے.

آزر کی بت پرستی کا ذکر قرآن مجید کے علاوہ بائبل میں بھی ہے (یشوع، ۲:۲۴) اور اسلامی اور یہودی دونوں روایتوں میں آتا ہے کہ یہ علاوہ بت پرست ہونے کے بت ساز اور بت فروش بھی تھا [دیکھیے سیل کا ترجمۂ قرآن، ص ۹۵، حواشی]۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی فہمائش اور تبلیغ کے باوجود یہ آخر تک ایمان نہ لایا اور حدیث میں اس کے دوزخ میں معذّب ہونے کا ذکر بہ تصریح موجود ہے.

مآخذ: (۱) قرآن مجید؛ (۲) احادیث نبوی؛ (۳) بائبل؛ (۴) *Jewish Encyclopaedia*، ۱۲: ۱۰۷؛ (۵) راغب: المفردات فی غریب القرآن؛ (۶) ابن حبیب: کتاب المحبَّر؛ [(۷) ابن منظور: لسان العرب، ۵: ۷۶؛ (۸) طبری: تأریخ، ۱: ۲۵۳ ببعد؛ (۹) ثعلبی: قِصَص الانبیاء، قاہرہ ۱۳۳۹ھ، ص ۵۱؛ (۱۰) سُیُوطی: اِتقان، ۳۱۸؛ (۱۱) ابن کثیر: البِدایۃ و النِّہایۃ، ۱: ۱۴۲؛ (۱۲) ابن عساکر: التأریخ الکبیر (یعنی تاریخ دمشق؟)، ۲: ۱۳۴؛ (۱۳) S. Fraenkel، در *ZDMG*، [۱۰۶]: ۷۲؛ (۱۴) A. Jeffery: *Foreign Vocabulary of the Qur'ān*، ۵۳-۵۵؛ (۱۵) J. Horovitz: *Koranische Unters-uchûngen*، ۸۵، ۸۶؛ [(۱۶) محمد عبدہ: تفسیر المنار، قاہرہ ۱۳۴۷ھ، ۷: ۵۳۵-۵۳۸؛ (۱۷) سیل (Sale): ترجمۂ قرآن بانگریزی، ۹۵ ح؛ (۱۸) دائرۃ المعارفِ الاسلامیۃ، ۲/۱: ۳۹].

(عبدالماجد در یابادی و ادارہ)

آزُردَہ: تخلّص محمد صدرالدّین، خان بہادر، مفتی، مولوی، صدر الصدور ⊗ کا [ایک تحریر پر ان کی مہر اور دستخط یوں ثبت ہے، مُہر: محمد صدرالدّین ۱۲۴۱ھ؛ اور دستخط: ''محمد صدرالدّین الملقّب بصدر الصدور واللہ علیم بذات الصدور''۔ اس تحریر کے عکس کے لیے دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۶۲ء]، مولوی لطف اللہ کشمیری ساکن دہلی کے فرزند اور بیتِ علم وصلاح میں سے تھے [ان کے دادا کے بارے میں شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں: ''جدّ امجدِ ایشان از فضلای معتبرو خُلّص اصحاب و تلامذہ و احبابِ حضرت والدِ ماجد فقیر بودہ اند''؛ اِتحاف النبلاء، ص ۲۶۱]۔ دہلی میں ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوے۔ لفظ ''چراغ'' تاریخ ولادت ہے۔ فقہ، اصول وغیرہ علومِ شرعی مولانا رفیع الدین بن ولی اللہ دہلوی سے پڑھے اور اثنائے تحصیل میں شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ سے بھی استفادہ کیا۔ حدیث مولانا عبدالقادر بن ولی اللہ سے پڑھی، اُن کے بھانجے مولوی محمد اسحٰق (مہاجر) سے سندِ حدیث لی۔ معقولات کی منتہی کتابیں مولانا فضل امام خیر آبادی سے پڑھیں۔ یہ حضرات اس زمانے کے بہترین اساتذہ مانے جاتے تھے۔ خود صدرالدّین خان کے علم وفضل اور ذہن و ذکا کی تعریف میں سبھی معاصرین اور تذکرہ نویس، رطب اللسان پائے جاتے ہیں (مثلاً دیکھیے: سیّد احمد خان، در آثار الصنادید؛ (نوّاب) مصطفٰی خان شیفتہ، در گلشنِ بے خار؛ مولوی فقیر محمد جیلمی، در حدائق الحنفیّۃ۔ مولانا حالی کی تصنیف یادگار غالب میں جا بجا (نیز حیاتِ جاوید میں) مفتی صاحب موصوف کا ذکر آیا ہے۔ [اِتحاف النبلاء، ص ۱۶۲ میں ہے کہ غالب (دیکھیے کلیات، نول کشور ۱۲۷۹ھ، ص ۳۴۲)، حسرتی (رہ آورد = ترغیب السالک الی احسن المسالک، دہلی ۱۲۸۳ھ، ص ۱۴۰ ببعد؛ دیوان فارسی، لاہور ۱۸۹۸ء، ص ۱۸۴ و ۵۰۵)، مومن وغیرہ شعرائے دہلی نے قصائد و اشعار ان کی تعریف میں کہے ہیں].

اسی علمی فضیلت اور اِفتاء میں شہرت کے باعث انھیں ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء

میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے دہلی میں صدر الصدور (یا صدر امین۔ دِتاسی) مقرّر کیا۔ یہ تنخواہ ومنصب میں انگریزی سب جج کے برابر لیکن سب سے معزّز عدالتی عہدہ تھا جو ان دنوں کمپنی کسی ہندوستانی کو دیتی تھی [قبؔ ولسن (H. H. Wilson): *Glossary*، لنڈن ۱۸۵۵ء، ص ۴۵۱؛ سِیَر المتأخِّرین، ۲: ۸۲۸ ببعد]۔ افتای ممالکِ اطرافِ دہلی، امتحانِ مدارس، صدارتِ حکومتِ دیوانی یہ سب فرائض ادا کرنے کے علاوہ مفتی صاحب اپنے مکان پر طلبہ کو سب علوم (صرف ونحو، منطق، ریاضیّات، ادب، فقہ وتفسیر) میں درس بھی دیتے تھے۔ اس زمانے کے متعدّد مشاہیر نے اُن کے تلمّذ سے فیض حاصل کیا۔ ان میں سیّد احمد خان (بعد میں سرسیّد)، نوّاب صدّیق حسن خان (جو تقریباً دو سال تک ان سے استفادہ کرتے رہے)، فقیر محمد جہلمی (پنجاب)، یوسف علی خان، جو آگے چل کر رام پور کے رئیس ہوئے، شامل ہیں۔ مدرسۂ دارالبقاء زیرِ جامع مسجد دہلی کے بہت سے طلبہ کو مفتی صاحب وظائف دیتے اور ان کی ضروریات کی کفالت کرتے تھے۔

فضیلتِ حسن تحریر ومتانتِ تقریر کے ساتھ مُروّت واخلاق واحسان کو جمع کرتے تھے۔ ہر قسم کے فضلا وشعرا کی مجلس ان کے ہاں لگتی تھی۔ ان کی ہر دل عزیزی کا ایک اَور سبب شاعری کا ذوق وشوق تھا اور اپنے تخلّص آزردہ ہی سے آج تک ہمارے ادبیات میں معروف ہیں۔ اردو، فارسی اور کبھی کبھی عربی میں شعر کہتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ سننے والوں، جیسے مولانا حالی اور صاحب حدائق الحنفیّۃ کا بیان ہے کہ وہ دل شگاف لحن، غمناک اور درد انگیز آواز سے شعر خوانی کرتے تھے۔ مفتی صاحب اقرار کرتے ہیں کہ اگرچہ کثرتِ مشاغل سخن طرازی کی فرصت نہیں دیتی لیکن ''آن صناعت را با گوہرم سرشتہ اند'' لہٰذا کبھی کبھی شعر کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دیوان بظاہر مکمل نہیں ہوا لیکن تذکروں کے انتخابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر حرفوں کی ردیف میں اردو اور کم تر فارسی غزلیں لکھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ''مسدّسِ دہلی'' بھی ان سے یادگار ہے، جس میں مسلمانانِ دہلی کے قتلِ عام (۱۸۵۷-۱۸۵۸ء) پر آنسو بہانے سے باز نہیں رہ سکے۔ مسدّس کا یہ شعر زبان زد ہو گیا تھا:

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اردو شاعری میں مفتی صاحب شاہ نصیر دہلوی، مجرم اکبر آبادی اور آخر میں ممنون دہلوی سے مشورہ لیتے تھے (خم خانۂ جاوید، ۱: ۵۳)۔ مومن اور غالب جیسے نامور ہم عصروں کے سامنے مفتی صاحب کی شاعری نہیں چمک سکی لیکن شعر فہمی اور سخن سنجی میں سب انھیں مانتے تھے اور وہ صاف وسلیس اردو اور عاشقانہ غزل گوئی کے قائل تھے۔ چنانچہ غالب کی دشوار نویسی انھیں ناپسند تھی، جس کے کئی لطیفے یادگارِ غالب میں مذکور ہیں (ص ۱۲۷۔ قبؔ خم خانۂ جاوید، ۱: ۵۶، نیز مقدّمۂ دیوانِ حالی، ص ۱۰۳)۔ تاہم غالب پر قرض خواہوں نے مفتی صاحب کی عدالت میں دعویٰ کیا اور شاعر نے وہاں ''قرض کی پیتے تھے مے.....الخ'' پڑھ کر فاقہ مستی کا عذر پیش کیا تو قدر شناس عدالت نے خود قرضہ ادا کر کے مرزا صاحب کو نجات دلائی۔ مفتی صاحب طبعًا صاحبِ وقار وتمکنت تھے حتّٰی کہ (شمس العلماء) مولوی نذیر احمد نے، جنھیں مفتی صاحب کے امتحان کے بعد دہلی کالج میں داخلے کے لیے وظیفہ ملا تھا، اپنے لڑکپن میں ان کی نخوت و درشتی کا تأثّر لیا (افتخار مارہروی، حیات النذیر، ۱۹، قبؔ فرحت اللہ بیگ دہلوی: 'نذیر احمد کی کہانی.....''، رسالۂ اردو، جولائی ۱۹۲۷ء، ص ۴۰۶ ببعد)۔

۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں علمائے اسلام سے جہاد کا فتوٰی لیا گیا تو مفتی صاحب کو بھی دستخط کرنا پڑے۔ اس بنا پر انگریزوں نے فتح پانے کے بعد انھیں گرفتار کیا۔ چند ماہ تک نظر بند رہے۔ مال اسباب اور جائداد جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی تھی سب ضبط کر لی۔ بارے پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس (J. Lawrence) نے، جو دہلی میں مفتی صاحب پر مہربان تھا، انھیں الزامِ بغاوت سے بری کیا۔ معلوم ہوا کہ فتوائے جہاد پر انھوں نے نام کے ساتھ ''بالخیر'' کی صورت میں دراصل ''بالجبر'' تحریر کیا تھا۔ ان کا سامان اور بیش بہا کتب خانہ غارت ہو چکا تھا۔ ''کتابیں ان کے پاس ہر طرح کی اور ہر فن کی موجود ہیں'' کریم الدین: فرائد الدہر)۔ غیر منقولہ املاک واگزار ہو گئیں اور چندے (۱۲۷۶ھ میں) بستی نظام الدّین میں رہنے کے بعد وہ پھر اپنی دہلی کی حویلی میں چلے آئے۔ درس وافادہ کا مشغلہ جاری رکھا۔ آخر میں فالج کا حملہ ہوا اور ایک دو سال علیل رہ کر ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ چراغِ دہلی میں مدفون ہوئے (۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ/ ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء)۔ ''چراغِ دو جہان بود'' تاریخِ وفات ہے۔ مرحوم نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ایک بھانجے کو متبنّٰی کر لیا تھا۔

کتابی تصانیف میں [ایک ''تذکرۂ مختصر در حال ریختی گویانِ ہند'' ہے، دیکھیے گلشن بے خار، ص ۱۳۲ (بذیل سودا)۔ شپرنگر نے، جو صاحبِ تذکرہ کو ذاتی طور پر جانتا تھا، اس کتاب کا ذکر نہیں کیا مگر اس کا ایک نسخہ کیمبرج میں ہے (دیکھیے براؤن: تکملہ، ص ۳۰۴ (نسخۂ ناتمام، تا حرف ق)، نیز سٹوری، ۱/ ۲، ص ۹۲۲)]۔ فتاوٰی کے علاوہ دو رسالے عربی میں لکھے (۱) رسالة منتهى المقال فى شرح حديث: ''لا تُشَدّالرِحال''، جس میں ابن تیمیہ اور دوسرے علمائے حدیث کے اس نظریے کی کہ تین مقدّس مقامات کے سوا اَور کسی زیارت گاہ کے لیے سفر کرنا جائز نہیں تردید کی ہے۔ آثار الصّنادید میں اس رسالے کا دیباچہ نقل ہوا ہے۔ صدّیق حسن خان نے اس رسالے پر نکتہ چینی کی ہے؛ (۲) الدُّرّ المنضود فى حكم امرأة المفقود، گم شدہ شخص کی زوجہ کے بارے میں شریعت کے احکام۔ یہ دونوں رسالے بھی اب نایاب ہیں۔ بہت سے فتوے، نثر ونظم (عربی وفارسی) اور غزلوں کے نمونے آثار الصنادید اور تذکراتِ شعرا میں مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔ حاشیۂ قاضی مبارک بھی انھوں نے لکھا (فرائد الدہر، بزبانی آزردہ)۔ ایک کتاب صنائع بدائع پر لکھنا شروع کی؛ معلوم نہیں تمام ہوئی یا

نہیں (وہی کتاب).

مآخذ: (۱) سیّد احمد خان: آثار الصنادید، دہلی ۱۸۴۶ء، باب چہارم، تحت مادّہ۔ باب چہارم کی جداگانہ طباعت موسوم بہ تذکرۂ اہل دہلی، طبع انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۵۷-۷۰؛ (۲) مصطفٰی خان شیفتہ: گلشن بے خار، دہلی ۱۸۳۷ء، ص ۱۳ ببعد (تحت مادّہ)؛ (۳) کریم الدّین وفیلن: طبقات الشعراء، دہلی ۱۸۴۸ء، ص ۴۴۶ ببعد؛ (۴) صابر: گلستان سخن، دہلی ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ (۵) عبدالغفور خان نسّاخ: سخن شعراء، نول کشور ۱۲۹۱ھ، ص ۲۳ ببعد؛ (۶) (نوّاب) صدّیق حسن خان: ابجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۵ھ، ۳: ۹۱۷؛ (۷) وہی مصنّف: اِتحاف النبلاء، کان پور ۱۲۸۸ھ، ص ۲۶۰ - ۲۶۳ (اس میں ان کی دو تحریریں اور شاہ عبدالعزیز کا خط ان کے متعلّق نقل ہوا ہے)؛ (۸) مولوی فقیر محمد جیلمی: حدائق الحنفیۃ، نول کشور ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء، ص ۴۸۱-۴۸۴؛ (۹) رحمان علی: تذکرۂ علمائے ہند، نول کشور، طبع دوم، ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء، ص ۹۳ و ۹۴؛ (۱۰) لالہ سری رام: خم خانۂ جاوید، لاہور ۱۹۰۸ء، ۱: ۵۳ ببعد؛ (۱۱) الطاف حسین حالی: یادگار غالب، ریاض ہند، علی گڑھ، ص ۵۵، ۱۲۷، ۱۸۲ وغیرہ؛ (۱۲) وہی مصنّف: حیات جاوید، انجمن ترقّی اردو، دہلی ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۹؛ ۲: ۲۵۳، ۳۰۰؛ (۱۳) وہی مصنّف: مقدّمۂ دیوان حالی، جداگانہ، لاہور، بلا تاریخ، ص ۱۰۳؛ (۱۴) افتخار مارہروی: حیات النذیر، دہلی ۱۹۱۲ء، ص ۱۹ ببعد؛ (۱۵) فرحت اللہ بیگ: ’نذیر احمد کی کہانی.....‘، در رسالۂ اردو، جولائی ۱۹۲۷ء؛ [(۱۶) بشیر الدّین احمد دہلوی: واقعات دار الحکومت دہلی، آگرہ ۱۹۱۹ء، ۲: ۱۴۸ ببعد؛ (۱۷) محمد بن یحیٰی المعروف بالحسن التیمی: الیانع الجنی، دیوبند ۱۳۴۹ھ، ص ۷۷ (برہامش)]؛ (۱۸) خواجہ احمد فاروقی: کلاسیکی ادب، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۷۷-۷۸؛ (۱۹) غلام رسول مہر: غالب، لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۲۷۸-۲۸۵؛ (۲۰) فضل حسین: الحیاۃ بعد المماۃ، آگرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۴۴؛ (۲۱) طفیل احمد: یادگار شعراء، الٰہ آباد ۱۹۴۳ء، ص ۱۵؛ (۲۲) عبدالحیّ: نزھۃ الخواطر، ۷: ۲۲۰ ببعد؛ (۲۳) M. Garcin de Tassy: *Histoire de la Litter. Hind.*، طبع دوم، پیرس ۱۸۷۰ء، ۱: ۲۷۲؛ (۲۴) صفیر بلگرامی: تذکرۂ جلوۂ خضر، آرہ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء، ۱: ۲۱۶ ببعد؛ (۲۵) (آزاد، طبع دوم، بذیل مادّہ؛ [(۲۶) کریم الدین (شاگرد آزردہ): فرائد الدہر، دہلی ۱۸۴۷ء، ص ۳۹۶].

(سیّد ہاشمی فرید آبادی)

---

* **آسام** (Assam): جمہوریۂ ہندوستان کا انتہائی مشرقی صوبہ، جو مشرقی پاکستان اور برما کے مابین واقع ہے۔ ۲۲ درجہ ۱۹ دقیقہ اور ۲۸ درجہ ۱۶ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۸۹ درجہ ۴۲ دقیقہ اور ۹۷ درجہ ۱۲ دقیقہ طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے۔ یہ وادی برہم پُتْرا اور پہاڑیوں کے سلسلوں پر، جو چھوٹے چھوٹے مرتفع میدانوں کو گھیرے ہوئے ہیں، مشتمل ہے۔ یہ میدان بہت سے پہاڑی قبیلوں کا ملجأ و مأوٰی اور اردوہائے مغول (Mongol) کے لیے پناہ گاہ رہے ہیں۔ صوبہ آسام ۸۵,۰۱۲ انگریزی مربّع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی آبادی ۹۰,۴۳,۷۰۷ نفوس تھی، جن میں سے ۱۹,۹۶,۴۵۶ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی تین چوتھائی آبادی گوال پارا اور کامْرُوپ کے مغربی ضلعوں میں، جو شمالی بنگال سے ملے ہوئے ہیں اور کچھار کے ضلع میں، جو پاکستانی [بنگلہ دیشی] سلہٹ سے متّصل ہے، آباد ہے۔ ۱۹۲۰ء سے ان کا فی صد تناسب دیگر متّصلہ اضلاع میں بھی بہت بڑھ گیا ہے، کیونکہ بنگال کے لوگ ہجرت کر کے وہاں آن بسے ہیں۔ مگر وادی کا مشرقی حصّہ زیادت سے متأثّر نہیں ہوا ہے۔

سنسکرت کے اسناد و اوراق میں اس وادی کا نام ’’لَوہِتْیا‘‘ (Lawhitya)، ’’پُراگ جیوتِش‘‘ (Prāg-Jyotisha) یا ’’کامروپ‘‘ (Kāmrūpa) درج ہے۔ لفظ آسام کا تعلق (جس کی صحیح شکل ’آسامہ‘ اور مقامی تلفّظ آہْوم ہے) شانوں (Shans) یا تائیوں (Tais) سے ہے، جو تبّتی - برمی لوگوں کا ایک گروہ ہیں اور آٹھویں صدی عیسوی کے قریب سیام میں آ بسے، پھر بالائی برما اور آخرکار اِس صوبے میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس لفظ کا اشتقاق سنسکرت کے اَ+سامہ (= بے مثال) سے تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ آہْوم مہاجروں میں تاریخ نویسی کا کچھ ذوق بھی تھا؛ چنانچہ انھوں نے چند کتابیں تصنیف کیں، جنھیں بُرَنْجی (Buranji) کہتے ہیں۔ پہلا بادشاہ، جس کا حال معلوم ہے، سُکَپھا (Sukapha) تھا۔ اس نے ۱۲۲۸ء میں بالائی وادی کے کچھ حصّے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جانشینوں نے رفتہ رفتہ پڑوس کے قبیلوں کو مُطیع کیا اور آہوم کی مملکت قائم کی۔ مغربی وادی، جس میں شہر گوہاٹی واقع ہے اور جو ان بادشاہوں کی سلطنت سے خارج تھی، بدستور کامروپ کہلاتی رہی۔ اس پر چھوٹے چھوٹے زمیندار حکمران تھے، جنھیں مجموعی طور پر ’بارَہ بھُوئنیا‘ (Barabhuinya) کہتے تھے۔ انھیں دو دفعہ باہم متّحد کر کے کامروپ - کامتا کی بادشاہت، پہلے پہلے کھینوں [Khens] کے اور اس کے بعد کوچوں [Kochas] کے ماتحت، قائم کی گئی۔ یہ دونوں مسلمان سلاطین کے ہمسائے اور حریف تھے۔

کامروپ میں مسلمانوں کی چڑھائی تین مرحلوں میں ہوئی، پہلا مرحلہ ۱۲۰۶ء میں بختیار خلجی کے حملے سے شروع ہوا، یہ دَورِ غزووں کا تھا، یعنی حملہ آوروں نے وقتی طور پر تصرّف کیا اور خراج عائد کر دیا۔ یہ دور ۱۳۵۷ء میں ختم ہوا، جب کہ سکندر شاہ نے ’’چولستان عُرف کامْرُو‘‘ (ممکن ہے گوہاٹی مراد ہو) میں ٹکسال قائم کی: شاید اسی کے قرب و جوار کے کسی ایک غار میں ابن بَطُّوطہ نے مشہور صوفی بزرگ شاہ جلال تبریزی [رک بآں] سے ملاقات کی۔ دوسرا دَور اس وقت شروع ہوا جب بارْبَک شاہ نے کامتا کے بادشاہ کام اِیشوَر کو شکست دی اور آخر علاء الدّین حسین شاہ نے کھین [Khen] راجہ نِیلَمبَر کو مغلوب کر کے ۱۴۹۸ء میں کامروپ پر قبضہ کر لیا۔ اب تک مسلمانوں نے آہْوموں سے تماس پیدا نہ کیا تھا، چنانچہ اس زمانے کے اسلامی اوراق و اسناد میں فقط کامروپ کا ذکر آیا ہے۔

بُرنجیوں میں مسلمانوں کے پہلے حملے کی تاریخ ۱۵۳۲ء دی ہے اور حملہ کرنے والے کا نام تُرْبَک لکھا ہے (شاید تَرْبک = بحری افسر)۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی سرکاری عہدیدار تھا جو کامروپ میں متعیّن تھا، لیکن حملہ آور لشکر کو شکستِ فاش ہوئی۔ ۱۵۳۸ء میں جب حسین شاہی خاندان کا خاتمہ ہوگیا تو کوچوں (Kochas) نے سر اُٹھایا اور اپنی بادشاہت قائم کرلی۔ اس عہد کی ایک اہمّ یادگار سلطان غیاث الدّین اولیا کا مقبرہ ہے، جو ہاجو (Hājo) میں واقع ہے۔ تیسرا دَور ۱۶۱۲ء سے شروع ہوا، جب بنگال کے مغل صوبیدار اسلام خان نے کوچوں کو زیر کر کے کامرُوپ پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد آہوموں سے اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں اور فارسی وقائع ناموں میں آسام کا تذکرہ بکثرت ہونے لگا۔ ۱۶۶۲ء میں میر جُملہ نے آہوم راجہ کو قطعی طور پر مطیع کرلیا اور اس پر سالانہ خراج لگا دیا۔ بعد میں مغلوں کی کمزوری سے آہوموں کی ہمت بڑھ گئی اور ۱۶۸۲ء میں انھوں نے بُرہم پُترا کی پوری وادی پر قبضہ جما لیا اور ۱۸۲۴ء تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ اس سال برمیوں کے حملے کا خطرہ دور کرنے کے لیے برطانوی یہاں کے معاملات میں دخل انداز ہوے اور انھوں نے آسام کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ آہوم مسلمانوں کی خدمات سے بدستور فائدہ اٹھاتے رہے، کیونکہ مسلمان صنعت وحرفت میں ماہر تھے۔ مَرِیَہ (Marias) [ٹھٹھیرے] اور گَرِیَہ (Garias) [پیشہ ور درزی] اب بھی بعض اضلاع میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے پر ''فرائضی'' تحریک کا اثر پڑا۔ ادنٰی درجے کے کاشتکاروں نے یہاں ایک مخصوص مقامی تمدّن کی تشکیل کرلی ہے، جس میں انھوں نے اسلامی عقیدے کے ساتھ اس علاقے کے رسم و رواج اور قومی تہواروں کو بھی شامل کرلیا ہے۔

مآخذ: (۱) گیٹ (E. A. Gait): *A History of Assam*، کلکتہ ۱۹۰۶ء؛ (۲) K. L. Barua: *Early History of Kāmarūpa*، شِلانگ ۱۹۳۳ء؛ (۳) ہنٹر (W. W. Hunter): *A Statistical Account of Assam*، لنڈن ۱۸۷۹ء، ۲ جلد؛ (۴) ایلن (B. C. (Allen): *Assam District Gazetteers*، کلکتہ اور الٰہ آباد ۱۹۰۵-۱۹۰۶ء، ۸ جلد؛ (۵) بلخمن (H. Blochmann): *Koch Bihar, Koch Hajo and Assam*، در *JASB*، ۱۸۷۲ء، ص ۴۹-۱۰۱؛ (۶) بِرِنچی کُمار بَرُوآ (Birinchi Kumar Baru): *A note on the word Assam*، در *Journal of the Assam Research Society*، ج ۲/۱، گوہاٹی ۱۹۳۴ء، ص ۴۱ ببعد؛ (۷) M. Glanius: *A relation of an unfortunate voyage to the kingdom of Bengala*، لنڈن ۱۶۸۲ء؛ (۸) M. I. Borah: بہارستان غیبی از مرزا ناتھن، گوہاٹی ۱۹۳۶ء؛ (۹) شہاب الدّین طالش: [فتحیۂ عِبریہ]، مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ؛ (۱۰) S. K. Bhuyan: *Annals of the Delhi Badshahat*، گوہاٹی ۱۹۴۷ء؛ (۱۱) وہی مصنّف: *Deodhai Asam Buranji*، گوہاٹی ۱۹۳۲ء؛ (۱۲) وہی مصنّف: *Tungkhungia Buranji*، اوکسفرڈ ۱۹۳۳ء؛ (۱۳) وہی مصنّف: *Asam Buranji*، گوہاٹی ۱۹۳۰ء؛ (۱۴) Golap Chandra Barua: *Ahom-Buranji*، کلکتہ ۱۹۳۰ء.

(A. H. DANI دانی)

آستانہ: رک بہ قُسطُنطِینِیَّہ. *

آسَفی: رک بہ سَفی (Safi). *

آسِیہ: فرعون کی بیوی، جو مؤمنہ اور پاکباز عورت تھیں، بنو اسرائیل ⊗ سے تعلّق رکھتی تھیں۔ ابن عبّاس ؓ سے مروی ہے کہ آسیہ ؓ حضرت موسٰی ؑ کی عمّہ (یعنی چچی یا پھوپھی) تھیں.

آسیہ کا نام قرآن مجید میں نہیں آیا۔ البتہ ان کا ذکر ''اِمْرَاَتُ فِرْعَوْنَ'' (یعنی فرعون کی بیوی) کے لفظ سے دو جگہ آیا ہے: قرآن مجید، ۲۸ [القصص]:۹، اور ۶۶ [التحریم]:۱۱ میں؛ [مگر نیز قب ۲۸:۸].

فرعون نے بنو اسرائیل کو ضعیف کرنے اور دبائے رکھنے کے لیے ایک بار یہ تدبیر سوچی کہ ان کے یہاں آئندہ جو لڑکے پیدا ہوں انھیں 'ذبح' کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ اس اثنا میں حضرت موسٰی ؑ [رک بآن] پیدا ہوے تو ان کی والدہ کو اندیشہ لاحق ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالٰی کی ہدایت کے مطابق ان کی والدہ نے انھیں (لکڑی کے صندوق میں رکھ کر) دریا میں چھوڑ دیا (یہ صندوق بہتا ہوا ایسی جگہ جا لگا جہاں سے) وہ آلِ فرعون کے ہاتھ لگ گیا۔ انھیں بچے پر رحم آیا، اُسے اُٹھا لیا اور ''اِمْرَاَت فرعون'' نے کہا کہ یہ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا، اسے قتل مت کیجیو.

اس طرح آسیہ نے نہ صرف فرعونیوں سے موسٰی ؑ کو بچایا، بلکہ فرعون کے محلّ میں ان کی پرورش کا انتظام بھی کیا.

سورۃ التحریم میں حضرت آسیہ ؓ کے ایمان کا تذکرہ ہے، مفسّرین کہتے ہیں کہ جب [حضرت] موسٰی ؑ نے فرعون کے جادوگروں کو نیچا دکھا دیا تو آسیہ اُن پر ایمان لے آئیں۔ یہ دیکھ کر فرعون نے انھیں مشقِ ستم کا نشانہ بنایا اور طرح طرح کی اذیّتیں دیں۔ انجام کار فرعون کے حکم سے آسیہ پر ایک چٹان گرائی گئی، جس پر انھوں نے وہ دعا مانگی جو قرآن مجید، ۶۶:۱۱ میں دی ہے: چنانچہ بھاری پتّھر کے نیچے کچل جانے سے پیشتر ہی اللہ تعالٰی نے [حضرت] آسیہ ؓ کی روح کو اپنی طرف اٹھا لیا.

حضرت عبداللہ بن عبّاس ؓ سے روایت ہے کہ ایک بار جب آسیہ ؓ پر مظالم توڑے جا رہے تھے تو حضرت موسٰی ؑ پاس سے گزرے۔ انھوں نے دعا کی کہ اے اللہ رنج و درد آسیہ سے اٹھا لے؛ پس اللہ تعالٰی نے حضرت آسیہ ؓ کو جنّت میں

ان کا محلّ دکھایا، جس پر وہ مسکرائیں، پھر اللہ نے ان کی روح کو اپنی طرف اُٹھا لیا (دیکھیے محمد باقر مجلسی: حیات القلوب، ص ۳۷۹).

آسیہؓ کا شمار جنّت کی سب سے افضل خواتین میں ہوتا ہے۔ ہوروِتس (J. Horovitz) کے نزدیک ''آسیہ'' اَسنات (Āsenath) کی بگڑی ہوئی شکل ہے، مگر کتاب پیدائش (۴۱:۴۵ و ۴۶:۲۰) میں وہ یوسفؑ کی بیوی کا نام ہے نہ کہ فرعون کی بیوی کا.

مآخذ: (۱) القرآن الحکیم (۲۸:۹؛ ۶۶:۱۱) اور مختلف تفاسیر، بالخصوص مفصّلۂ ذیل:- (الف) ابن عبّاس: تنویر، قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ص ۳۲۵، ۴۷۷ ببعد؛ (ب) الطبری، تفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲۰: ۱۹-۲۰؛ ۲۸:۹۸؛ (ج) ابن کثیر: تفسیر، قاہرہ ۱۳۴۷ھ، ۶:۳۳۲؛ ۸:۴۱۹-۴۲۱؛ (د) محمد ثناء اللہ پانی پتی: تفسیر مظہری، دہلی بدون تاریخ، ۷:۱۴۵ ببعد، ۹:۳۴۷؛ (ہ) الآلوسی: تفسیر، قاہرہ ۱۳۰۷ھ، ۲۰:۴۷؛ ۲۸:۱۶۵؛ (۲) البخاری: الجامع الصحیح (کتاب الانبیاء)؛ (۳) الحاکم: مُستدرَک، حیدرآباد ۱۳۴۰ھ، ۲:۴۹۷ (وبہامشہ الذّھبی: تلخیص، ۲:۴۹۶-۴۹۷)؛ (۴) احمد بن حنبل: مُسند، قاہرہ ۱۳۱۳ھ، ۳:۶۴، ۸۰، ۱۳۵؛ (۵) ابن قتیبہ: المعارف، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ص ۲۰؛ (۶) الطبری: تأریخ، ۱:۴۴۴، ۴۴۸ ببعد؛ (۷) الثّعلبی: قَصَص الانبیاء (=العرائس)، قاہرہ ۱۳۰۱ھ ص ۱۴۶ ببعد؛ (۸) الکِسائی: قَصَص الانبیاء، لائڈن ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء، ص ۱۱۹ ببعد؛ (۹) محمد باقر مجلسی: حیات القلوب، لکھنؤ ۱۲۹۵ھ، ص ۳۳۴ ببعد، ۳۷۹ - ۳۸۰؛ (۱۰) ابن العربی: الفتوحات المکّیّة، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ۲:۶۹؛ (۱۱) پِنّوک (Pinnock): *Analysis of Scripture History*، کیمبرج، ص ۴۸، ۳۴۰؛ (۱۲) آ، طبع دوم، بذیل مادّہ.

(احسان الٰہی رانا)

⊗ **آشنا:** محمد طاہر نام، ''عنایت خان'' خطاب تھا۔ عہدِ شاہجہان کے امیر اور فنونِ لطیفہ کے مربّی نوّاب ظفر خان (خواجہ احسن اللہ 'احسن') کا فرزند [ظفر خان عہد شاہجہان میں ناظمِ صوبۂ کشمیر تھا، دیکھیے، مآثر الامراء، ۲:۷۵ ببعد و محمد اعظم: واقعاتِ کشمیر، نسخۂ خطّی، کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب: فہرست مخطوطات تاریخی، شمارہ ۱۷۴، بذیل صوبہ داران عہدِ شاہجہان]۔ مآثر الامراء (۲:۷۶ ببعد) کے بیان کے مطابق اس کی ماں بزرگ خانم، ملکۂ ممتاز محلّ کی بھانجی تھی۔ آشنا کی صحیح تاریخِ ولادت نہیں ملتی، شاہجہان بادشاہ کے عہد میں اسے ہزاروپانصدی کا منصب اور ''عنایت خان'' کا خطاب ملا اور وہ پہلے داروغۂ حضور اور پھر [آخرِ عہدِ شاہجہانی میں] داروغۂ کتاب خانہ کے عہدے پر مقرّر کیا گیا۔ پہلا عہدہ دربار کے صرف خاص امیرزادوں کو ملا کرتا تھا (وہی کتاب)۔ مجذوب فقیر یا صوفی سَرمد کا چرچا سن کر شاہجہان نے صحیح حالات معلوم کرنے کی غرض سے اسی عنایت خان کو بھیجا تھا۔ اس نے واپس آ کر فی البدیہہ وہ بیت سنائی جو تاریخی ہوگئی ہے:

''بر سرِ مدِ برہنہ کرامات تہمت است.....الخ''

[احسن اور آشنا دونوں داراشکوہ کے طرفداروں میں تھے۔ دارا اور اورنگ زیب میں لڑائی ہوئی تو ظفر خان پانچ ہزار سواروں کے ساتھ دارا کے میسرۂ قُول کی کمان پر تھا۔ اورنگ زیب نے فتح پائی تو خاندانی خدمات کا لحاظ کر کے پنشن دے کر الگ کر دیا۔ ظفر خان لاہور میں آ بسا اور یہیں ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی۔ باپ کی طرح آشنا نے بھی گوشہ نشینی اختیار کی۔ باپ فوت ہوا تو ۴۴ ہزار روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرّر ہوئی] اور ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰ء میں وفات پائی [سروِ آزاد، ص ۹۵؛ مآثر الامراء، ۲:۷۶۲].

آشنا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ دیوان میں قصائد، غزلیات اور رباعیات کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں (:''مثنوی ہائے قصیر، متعدّد.....'' آزاد بلگرامی: سروِ آزاد، ۲، ۹۷ [ان میں سے دو مثنویوں کے لیے، جو داراشکوہ کے لاہوری آئینہ محلّ سے متعلّق ہیں، دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۲۶ء، ص ۱۱ ببعد] اور ان کے شروع میں (اِیتے (Éthé): فہرستِ مخطوطات فارسی، انڈیا آفس، لنڈن، ص ۸۶۶) ساقی نامہ ہے۔ [دیوان کا نسخہ کتاب خانۂ رضا، رام پور میں بھی ہے اور ۱۰۶ ورق پر ختم ہوا ہے، فہرست خطّی شمارہ ۲۵۲۳]۔ یہ دیوان تقریباً ڈیڑھ صدی تک خاصا مقبول رہا، جیسا کہ بارھویں صدی اور تیرھویں صدی ہجری نصفِ اوّل کے تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے (مثلاً: مرآۃ العالم، ریاض الشعراء، کلمات الشعراء، مجمع النّفائس، سروِ آزاد وغیرہ)۔ انڈیا آفس کا نسخۂ دیوان شوّال ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کا مکتوبہ اور غالباً خود مصنّف کا لکھا یا اپنے لیے لکھوایا ہوا ہے (اِیتے (Éthé): وہی کتاب)، جس میں آئندہ اضافوں کے لیے صفحات سادہ چھوڑے گئے ہیں.

نثر میں آشنا کی یادگار سی سالہ عہد شاہجہان کی تاریخ موسوم بہ 'ملخّص' ہے (مآثر الکرام، ۲:۹۶؛ مجمع النفائس، قلمی، ورق ۲۱)، جسے اس نے بادشاہ نامۂ عبدالحمید و محمد وارث اور بادشاہ نامۂ محمد امین سے اخذ کیا اور [جس کا ایک حصّہ] قَرنیۂ شاہجہان بادشاہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ فُلّر (Major Fuller) نے کیا اور طولانی اقتباس ایلیٹ (H. Elliot) کی تاریخ (۷:۳۷-۱۲۰) میں دیا گیا ہے۔ [قرنیہ کے ایک نسخے کے حال کے لیے، جو ۱۹۲۵ء میں لاہور میں تھا، دیکھیے *Indian Historical Records Commission Proceedings of Meetings..,1925*، ج ۸، کلکتہ ۱۹۲۶ء: ص ۹۷، شمارہ ۱۹؛ مجموعۂ آذر، شمارہ 177H، دانش گاہِ پنجاب میں ملخّص کا نسخہ ہے، جو وقائع سال ۲۱ تا سال ۳۰ جلوسی پر مشتمل ہے].

مآخذ: (۱) شاہنواز خان و آزاد بلگرامی: مآثر الامراء، طبع رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۹۰ء، ۲:۷۶۲ ببعد؛ (۲) آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، ج ۲ (معروف بہ سروِ آزاد)، طبع عبداللہ خان و عبدالحق، ۱۹۱۳ء، ص ۹۷؛ (۳) سراج الدّین علی خان

آرزو: مجمع النفائس، قلمی؛ (۴) والہ داغستانی: ریاض الشعراء، قلمی؛ (۵) محمد افضل سرخوش: کلمات الشعراء، قلمی (شمارہ ۳-۵ کے لیے دیکھیے مجموعۂ شیرانی، دانش گاہِ پنجاب)؛ (۶) شپرنگر (Sprenger): *Catalogue Ar., Pers. and Hindustany Mss.*، کلکتہ ۱۸۵۴ء، ص ۱۱۱، ۳۳۹؛ (۷) Éthé: *Catalogue Persian Mss., India Office*، اوکسفرڈ ۱۹۰۳ء، ۱۵۸۴-۱۵۸۵؛ (۸) Elliot و Dowson: *History of India*، لنڈن ۱۸۷۷ء، ۷: ۷۳-۱۲۰؛ (۹) C. A. Storey: *Persian Literature*، لنڈن ۱۹۳۹ء، ۱/۲: ۵۷۸؛ [۱۰] اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۲۶ء، ص ۹ ببعد].

(سیّد ہاشمی فرید آبادی)

---

* **آصؔ:** رک بہ اَلآن.

---

* **آصَف بن بَرَخیا:** (عبرانی: آصاف بن بیرِخیا Bērekhyā) قرآن [مجید] میں جس شخص کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اسے کتاب کا علم دیا گیا [''عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِنَ الْكِتٰبِ''] (۲۷ [النمل]: ۴۰)، مفسّرین کا خیال ہے کہ وہ آصف بن برخیا تھا، جو [حضرت] سلیمانؑ کا معتمدِ خاص، کاتب (وزیر) اور صحابی تھا (ابن کثیر: تفسیر، ۳: ۳۶۴؛ تأریخ، ۲: ۳۳۴) اور ان کے شرفِ صحبت سے اسے تورات و زبور اور اسماء و صفاتِ الٰہی کے اسرار و حقائق کا گہرا علم حاصل تھا۔ [ابن الکلبی کی روایت کے مطابق آصف بن برخیا بن شمعیا کا نام ناطورا تھا.....].

مآخذ: [(۱) محمد بن حبیب: المحبّر، حیدرآباد ۱۳۶۱ھ، ص ۳۹۲]؛ [۲] طبری: تاریخ (طبعِ ڈخویہ)، ۱: ۵۸۸-۵۹۱؛ [۳] وہی مصنّف: تفسیر (قاہرہ ۱۳۲۱ھ)، ۱۹: ۹۴ ببعد؛ [۴] ثعلبی: قَصَص الانبیاء، قاہرہ ۱۲۹۲ھ، ص ۲۸۱-۲۸۳؛ [۵] کسائی: قَصَص الانبیاء، طبع Eisenberg، ص ۲۹۰-۲۹۳؛ [۶] G. Weil: *Biblische Legenden der Musselmänner*، ۱۸۴۵ء، ص ۲۶۵ ببعد، ۲۷۰ ببعد، [۷] M. Grünbaum: *Neue Beiträge zur semitischen sagenkunde*، ۱۸۹۳ء، ص ۲۲۲؛ [۸] J. Walker: *Bible Characters in the Koran*، ۱۹۳۱ء، ص ۳۷؛ [۹] *Jewish Encyclopaedia*؛ (۱۰) مستوفی: تاریخ گزیدہ، طبع وقفیۂ گب، ۵۴ ببعد؛ (۱۱) حفظ الرحمٰن سیوہاروی: قصص القرآن، دہلی ۱۳۶۶ھ، ص ۱۲۸ ببعد؛ (۱۲) سامی: قاموس الاعلام، ۱: ۲۱۱].

(وینسنک A. J. Wensinck [و ادارہ])

---

* **آصف جاہ:** نظام حیدرآباد [رک بآن] کا لقب.

---

* **آصف خان:** ابوالحسن المشہور بہ آصف جاہی، جسے نورالدّین جہانگیر بادشاہِ تیموری نے 'وکالت' کا بلند مرتبہ دیا، اعتمادالدّولہ غیاث بیگ کا دوسرا بیٹا اور ملکۂ نور جہان کا بڑا بھائی تھا۔ اعتمادالدولہ میرزا غیاث بیگ تہرانی (م ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۱-۱۶۲۲ء) کے والد خواجہ محمد شریف المتخلّص بہ ہجرؔی (م ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۶-۱۵۶۷ء) شاہ طہماسپ صفوی کے دَور میں علی الترتیب یزد و اصفہان کی وزارت پر مامور رہے (مآثر الامراء، ۱: ۱۲۸)۔ ان کے انتقال پر میرزا غیاث الدّین المعروف بہ غیاث بیگ نے ناسازیِ روزگار کی وجہ سے اپنے کنبے کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کیا۔ فتح پور سیکری میں ملک مسعود تاجر کے توسّط سے اکبر کے دربار تک رسائی حاصل کی اور ملازمت پائی۔ حسنِ خدمت کے صلے میں سہ صدی منصب پایا، بعد میں ترقی کر کے بتدریج ہزاری منصب اور دیوانیِ بیوتات سے اختصاص پایا۔ اکبر ہی کے زمانے میں میرزا غیاث کے بیٹے ابوالحسن نے بھی نام پیدا کیا، چنانچہ ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء میں بہار کا صوبہ دار ہوا (بینی پرشاد: *History of Jahangir*، ص ۹۱)۔ دورۂ جہانگیر میں اس کا منصب بڑھا۔ اس کی بہن مہرالنساء (نور جہان) جہانگیر کے عقد میں آئی، اب ابوالحسن کو خانِ سامان کا عہدہ اور اعتقاد خان کا خطاب عطا ہوا (یہی خطاب آصف خان کے بھائی مرزا شاپور کو بھی ملا تھا۔ رک بہ مآثر الامراء، ۱: ۱۸۰ ببعد۔ ابوالحسن کے خطاب کے لیے وہی جلد، ص ۱۵۱).

صفر ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء میں اس کی بیٹی ارجُمند بانو (ممتازمحلّ) کی شادی شہزادۂ خرّم سے (جو بعد میں شاہجہان کہلایا) ہوگئی (مآثر الامراء، ۱: ۱۵۱ پر ۱۰۲۰ھ؛ اقبال نامہ، ص ۶۷؛ خافی خان، ۱: ۲۷۶)۔ اس سے امورِ ملکی میں اس کا اختیار بڑھ گیا۔ ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۴ء میں وہ آصف خان کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر کے سب سے بڑے بیٹے شہزادۂ خسرو کو، جو اپنے باپ کے خلاف سرکشی کے الزام میں قید تھا، آصف خان کی تحویل میں دیا گیا۔ ان دنوں حقیقی اقتدار اعتماد الدولہ (والد)، عصمت بیگم (والدہ)، ابوالحسن آصف خان، نور جہان (بہن) اور شہزادۂ خرّم (داماد) کے ہاتھ میں تھا (بینی پرشاد: *History of Jahangir*، ص ۱۶۵ ببعد)۔ اب آصف خان کے منصب میں بھی تیزی سے ترقّی ہونے لگی (وہی کتاب، ص ۱۶۲ ح: ۱۰۲۱ھ میں اس کا منصب ہزاری و سہ صد سوار تھا اور دس سال بعد ۱۰۳۱ھ میں شش ہزاری و شش ہزار سوار)۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ صفر ۱۰۳۰ھ/ دسمبر ۱۶۲۰ء میں نور جہان نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی، جو پہلے خاوند شیر افگن سے اس کے ہاں پیدا ہوئی تھی، شہزادۂ شہریار (برادر خرّم و پسر جہانگیر) سے کر دی۔ اگلے برس عصمت بیگم کا انتقال ہوگیا۔ پھر اعتمادالدولہ بھی وفات پا گئے۔ خسرو کے بعد خرّم وارثِ تخت و تاج تصوّر کیا جاتا تھا لیکن نور جہان شہریار کو ولی عہد بنوانے میں کوشاں ہوئی (وہی کتاب، ص ۲۷۶ ببعد)۔ اس نے اپنے بھائی کے داماد خرّم کو نیچا دکھانے کی تدبیریں شروع کیں، یہاں تک کہ شہزادۂ خرّم باپ کی عُدُولِ حکمی پر مجبور ہوگیا۔ جب اسے قندھار کی طرف کوچ کا حکم ہوا، وہ دکن ہی میں تھا۔ اسی زمانے میں اس کی شمالی ہند کی جاگیریں اس سے چھین کر شہریار کے حوالے

کر دی گئیں۔ خرّم نے قندھار کی طرف پیش قدمی سے گریز کیا۔ آصف خان کی ہمدردی اپنے داماد کے ساتھ تھی لیکن وہ خاموش تھا (سکسینہ: *History of Shahjahan of Dehli*، ص ۴۳)، تاہم بہن (نور جہان) کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ نور جہان نے بھائی کی جگہ مہابت خان کو اپنا معتمد بنایا۔ ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۲-۱۶۲۳ء ہی میں مہابت خان کے منصب میں اضافہ ہوا [(۶۰۰۰ ذات، ۵۰۰۰ سوار) (*The Tūzuk-i-Jahāngīrī*: توزُکِ جہانگیری کا ترجمۂ انگریزی از راجرز و بیورج، ۲:۲۴۰)] اور آصف خان کو دربار سے جدا کر کے آگرے کی طرف روانہ کیا گیا؛ دیکھیے سکسینہ، ص ۴۳)۔ پھر آصف خان کو باضافۂ منصب بنگال کی صوبیداری پر مامور کیا گیا، لیکن وہ آمادہ نہ ہوا (بینی پرشاد، ص ۱۰۸)۔ ان حالات میں جہانگیر خرّم سے پوری طرح برگشتہ ہو گیا۔ تنگ آ کر خرّم نے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا، بلوچ پور کے مقام پر شاہی فوجوں سے ٹکر لی اور شکست کھائی اور دکن اور دوسرے صوبوں میں سرگرداں ہوا۔ اسی زمانے میں مہابت خان اور نور جہان کے مقاصد متصادم ہوے۔ مہابت خاں شہزادۂ پرویز کی ولی عہدی کا خواہاں تھا۔ نور جہان دوبارہ بھائی (آصف خان) کی طرف متوجہ ہوئی۔ مہابت خان کو بنگال کی طرف جانے کا حکم دے کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کی گئی (اقبال نامہ، ص ۲۴۵)۔ خرّم کا قصور معاف ہوا (رجب ۱۰۳۵ھ/ مارچ ۱۶۲۶ء)۔ بظاہر حالات درست ہو گئے۔

مہابت خان بھی نچلا نہ بیٹھا۔ جہانگیر کشمیر کی طرف جا رہا تھا اور دریاے جہلم کے کنارے خیمہ زن تھا کہ مہابت خان نے اچانک حملہ کر دیا (۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء) اور جہانگیر کو قبضے میں کر لیا۔ یہ حادثہ آصف خان کی غفلت سے پیش آیا تھا (اقبال نامہ، ص ۲۶۵؛ مآثر الامراء، ۱:۱۵۳)۔ وہ اسی داروگیر میں اٹک کی طرف بھاگا لیکن آخر کار مہابت کے لشکر کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ نور جہان کی تدبیر سے جہانگیر کو رہائی ملی تو آصف خان بھی قید سے آزاد ہو گیا (قب اقبال نامہ، ص ۲۶۹-۲۷۱؛ خافی خان، ۱:۳۸۶)۔ آصف خان پنجاب کا گورنر مقرّر ہوا۔ بہرحال بہن بھائی کے دل صاف نہ ہو سکے اور اختلاف کا کانٹا کھٹکتا رہا۔

کشمیر سے لوٹتے ہوے ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا انتقال راستے ہی میں ہو گیا۔ اس انتقال کی خبر بسرعت تمام (بنارسی ہندو مُشرفِ فیل خانہ کے توسُّط سے) شہزادۂ خرّم کو دکن میں دی گئی (مآثر الامراء، ۱:۱۵۴)۔ اس عمل سے آصف خان کا سیاسی تدبّر ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں حالات کو درست رکھنے کے لیے اس نے شہزادۂ خرّم کی آمد تک بھمبر کے مقام پر شہزادۂ داور بخش (پسرِ شہزادۂ خسرو) کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نور جہان کو، جو شہزادۂ شہریار کی حامی تھی، نظر بند کر دیا گیا [تفصیل کے لیے دیکھیے اقبال نامہ، ص ۲۹۴ ببعد؛ فتوحات عادل شاہی، ص ۱۵۷؛ مآثر الامراء، ۱:۱۵۴ ببعد]۔

اس کارگزاری کے صلے میں شاہجہان (خرّم) نے اُسے نُہ ہزاری ذات و سوار دو اسپہ سہ اسپہ سے نوازا اور وکیل کا رتبہ دیا (خطابات نیز جاگیر کے لیے دیکھیے اقبال نامہ، ص ۳۰۷؛ مآثر الامراء ۱:۱۵۶)۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۱ھ/ ۳ دسمبر ۱۶۳۱ء میں آصف خان تیس ہزار فوج کا سپہ سالار ہو کر محمد عادل شاہ والی بیجاپور کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ بیجاپور کا محاصرہ ہوا، بالآخر صلح ہو گئی اور آصف خاں محاصرہ اٹھا کر واپس آ گیا۔ شاہجہان محاصرہ اٹھنے سے ناخوش تھا، لیکن آصف خان کے بیش قیمت تحائف پا کر اس کی کبیدہ خاطری دور ہو گئی (اس محاربے کی تفصیل کے لیے دیکھیے بادشاہ نامہ، ۱:۴۱۶؛ فتوحات عادل شاہی، ص ۲۴۲-۲۴۴، ۳۲۳-۳۲۴)۔ اس محاربے کا ایک اہمّ واقعہ یہ بھی ہے کہ جب محاصرے کے دوران میں مجلسِ خلوت میں آصف خان کے پاس اعظم خان بیٹھا تھا تو امورِ ملکی کا ذکر چھڑا۔ اعظم خان نے کہا کہ بادشاہ اب ہمارا تمھارا محتاج نہیں ہے۔ آصف خان نے کہا ہمارے تمھارے بغیر کارِ ملکی کیسے چل سکتا ہے؟ یہ بات بادشاہ (شاہجہان) تک پہنچ گئی اور اسے بہت بُری لگی۔ اس پر اس نے کہا کہ آصف خان کا احسان مجھ پر ثابت ہے، لیکن آئندہ سے ملکی معاملات میں اسے زحمت نہ دی جائے۔ اس کے بعد تعلّقات ''کج دار و مریز'' کے رہے، لیکن بظاہر آصف خان کے رتبے اور اعتبار میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ مہابت خان کے انتقال (۱۰۵۱ھ) پر خانخاناں اور سپہ سالار کا خطاب، جو پہلے مہابت خان کو حاصل تھا، آصف خان کو عطا ہوا (مآثر الامراء، ۱:۱۵۸)۔

۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء میں آصف خان نے استسقا کے مرض میں انتقال کیا (''زہے افسوس آصف خان'' =۱۰۵۱ء) اور لاہور ہی میں جہانگیر کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا (مقبرہ اب تک خستہ حالت میں موجود ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے تحقیقاتِ چشتی، تاریخ لاہور (لطیف) وغیرہ سے رجوع کیا جائے)۔ اس نے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں یادگار چھوڑیں (مآثر الامراء، ۱:۱۵۸، قب بیل: *Oriental Biographical Dictionary*، ص ۵۵)۔

آصف خان مضبوط، قوی اور بھاری تن وتوش کا آدمی تھا۔ بقول صاحب مآثر الامراء بسیار خور تھا اور صبح و شام کی خوراک ایک من شاہجہانی کے برابر ہوتی تھی۔ اگرچہ آخری بیماری کے ایّام میں گھٹ گھٹا کر ایک پیالہ آب نخود تک رہ گئی تھی۔

آصف خان علم سے بہرہ یاب تھا، خصوصاً معقولات میں خاصا درک رکھتا تھا۔ ''درست محاورہ، خوش نویس'' اور معاملہ فہم؛ سیاق دان بھی تھا۔ وہ عاملانِ خالصہ کا حساب کتاب اور دیگر امور کا فیصلہ خود ہی کیا کرتا تھا اور اس میں کسی دوسرے کا محتاج نہ تھا۔ مغل طرز کی کتابی تصویر کشی کا سرپرست (سکسینہ: *Shahjahan*، ص ۲۶) اور عمارات بنوانے کا بھی شوقین تھا۔ عادات کے اعتبار سے خلیق اور ملنسار تھا۔ دشمنوں کو دوست بنانے میں کمال رکھتا تھا، اس لیے سیاسی اعتبار سے بہت کامیاب رہا (بینی پرشاد: *History of Jahangir*، ص ۱۶۲)۔ یہ اوصاف اسے ورثے میں ملے تھے (باپ کی انھیں صفات کے لیے دیکھیے مآثر الامراء، ۱:۱۳۱) اور اُس نے اِن سے اپنی زندگی میں بڑا کام لیا۔

مآخذ: (۱) نوّاب صمصام الدولہ شہنواز خان: مآثر الامراء، جلد اوّل، کلکتہ ۱۸۸۸ء؛ (۲) تُوزُک جہانگیری (ترجمہ راجرز و بیورج)، جلد اوّل، لنڈن ۱۹۰۹ء، جلد دوم، ۱۹۱۴ء؛ (۳) معتمد خان: اقبال نامۂ جہانگیری، جلد سوم، کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۴) عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، کلکتہ ۱۸۶۷ - ۱۸۶۸ء، جلد اوّل و جلد دوم؛ (۵) قزوینی استرآبادی: فتوحات عادل شاہی، نسخۂ موزۂ برطانیہ Add.26,269، روٹوگراف در کراچی؛ (۶) William Foster: *The Embassy of Sir Thomas Roe to India*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۷) بینی پرشاد: *History of Jahangir*، لنڈن ۱۹۲۲ء، (نیز طباعتِ ۱۹۴۰ء)؛ (۸) سکسینہ (B. P. Saksena): *History of Shahjahan Dehli*، الٰہ آباد ۱۹۳۲؛ (۹) سٹوری (C. A. Storey): *Persian Literature*، ۱/۲؛ (۱۰) بیل (T. W. Beale): *The Oriental Biographical Dictionary*، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۵۵؛ (۱۱) آ، طبع دوم، بذیلِ مادّہ۔

(ہارڈی P. HARDY و سیّد علی عبّاس)

آصَفی: ⊗ خواجہ آصف ہروی شیرازی (آصفی تخلُّص) نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر کا ایک معروف ایرانی شاعر تھا۔ اس کا باپ خواجہ مقیم الدّین نعمت اللہ بن علاء الدّین [علی] قہستانی ہروی [م ۸۷۲ھ] سلطان ابوسعید کے وزرا میں سے تھا [اُس کے لیے دیکھیے مطلع سعدین، لاہور ۱۹۴۹ء، ۲/۲: ۱۲۳۴، ۱۲۷۹، ۱۲۸۶؛ دستور الوزراء، تہران ۱۳۱۷ ش، ص ۳۷۲ ببعد]۔ اس کا دادا تیموری سلاطین کے [خزانے] کا [مُشرِف اور] نگران تھا اور اس کا شمار نیک کردار لوگوں میں ہوتا تھا۔ [باپ کے عہدۂ وزارت کی بنا پر اس نے آصفی تخلّص کیا؛ ریو]۔ آصفی ہرات کے بزرگ زادوں میں گنا جاتا تھا۔ کچھ دن وہ شیراز میں بھی رہا ہے اور اس مناسبت سے اسے شیرازی بھی کہنے لگے تھے، لیکن اس نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصّہ ہرات میں گزارا اور ابوالغازی سلطان حسین بایقرا کے دربار میں اس کی خاصی آؤ بھگت اور عزّت ہوتی تھی۔ [حبیب السِیَر (=ہفت اقلیم) میں ہے کہ وہ کبھی امیر علی شیر کے سایۂ تربیت میں وقت بسر کرتا تھا اور کبھی بدیع الزمان میرزا کی ملازمت میں۔] وہ مولانا جامی کے مریدوں اور شاگردوں میں سے (اور ان کے بھانجے ملّا ہاتفی کے دوستوں میں تھا؛ مَے خانہ، ص ۱۰۴)۔ [اس کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ حبیب السِیَر میں ہے کہ اس نے ۱۶ شعبان ۹۲۱ھ کو وفات پائی مگر ''گفتم زبرات آمدہ روز دوم'' مادّۂ تاریخ ہے، جو ۹۲۳ھ کے برابر ہے اور جسے (بظاہر ایک معاصر) سلطان ابراہیم امینی نے پایا؛ تحفۂ سامی میں ۹۲۰ھ تاریخ دی ہے۔] خواجہ آصفی نویں صدی ہجری کے قادر الکلام شاعروں میں گنا جاتا ہے ('شاعری میں مرتبۂ اعلیٰ اور فضیلت میں درجۂ اولیٰ رکھتا ہے اور اس زمانے کے وزیروں کے نزدیک وہ نہایت مکرّم ہے؛ دولت شاہ)۔ اسے قصیدہ، غزل اور مثنوی میں دستگاہ حاصل تھی۔ قصائد، غزلیات اور رباعیات کے ماسوا اس نے نظامی کی مخزن الاسرار کے تتبّع میں ایک مثنوی بھی کہی ہے۔ [دیوانِ آصفی کے نسخوں کے لیے رک بہ ریو، ۲: ۶۵۱؛ فہرست بادلی، عدد ۹۹۰؛ فہرست بانکی پور، ۲: ۱۰۵، عدد ۲۱۹۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کے چھے نسخے ہیں، جن میں سے دو دسویں صدی ہجری کے ہیں۔ کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب میں اس کے دو نسخے موجود ہیں، کتابت در ۱۰۶۷ھ و ۱۰۹۹ھ، دیکھیے فہرست، ۱/۲: ۴۹۸ و ۳۱۳۔ کتاب خانۂ شفیعیہ کا نسخہ شوّال ۱۰۱۲ھ میں کتابت ہوا۔ یہ غزلیات پر مشتمل ہے مگر اس میں پانچ قطعے اور باسٹھ رباعیاں بھی ہیں۔] میر علی شیر نے آصفی کی قوّتِ حافظہ اور فہمِ خوب کی تعریف کی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ رعنائی اور خود آرائی میں بہت وقت ضائع کرتا تھا [مجالس النفائس (ترکی نسخہ تحریر سال دہم جلوس محمد شاہی)؛ لطائف نامہ فخری (فارسی ترجمہ مجالس النفائس) کے ایک نسخۂ خطّی میں اس کا ذکر مضمونِ ذیل شروع ہوتا ہے: ہشیاری کی حالت میں بہت با حیا اور باادب جوان ہے، مگر مستی میں اس کی ماہیت اَور ہو جاتی ہے، بلکہ وہ نیم رسوا ہو جاتا ہے۔ اِس وقت توبہ سے مشرّف ہوا ہے، امید ہے کہ استقامت کی توفیق بھی پائے گا۔ (یہ عبارت نہ ترکی اصل میں ہے نہ دونوں فارسی ترجموں میں، جو تہران سے ۱۳۲۳ ش ھ میں شائع ہوے، نہ اس ترجمے میں جو اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں چھپا]۔

مآخذ: (۱) علی شیر نوائی: مجالس النفائس، طبع علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۲۳ ش، اشاریہ؛ (۲) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۵۱۷ ببعد؛ (۳) حبیب السیر، ۳/۳: ۳۴۶؛ (۴) سام میرزای صفوی: تحفۂ سامی، تہران ۱۳۱۴ ش، ص ۹۷ و پٹنہ ۱۹۳۴ء، ص ۲۵ ببعد؛ [(۵) امین احمد رازی: ہفت اقلیم، بذیل قہستان]؛ (۶) سفینۂ خوشگو؛ (۷) امیر شیر علی خان لودھی: مرآۃ الخیال [بمبئی ۱۳۲۴ھ، ص ۷۵]؛ (۸) ریاض الشعراء؛ (۹) سیّد بہاء الدّین خواجہ نقیب الاشراف بخاری متخلّص بہ نثاری: مُذَکّرِ احباب، نسخۂ خطّی متعلّق بہ مقالہ نگار: (۱۰) نوّاب صدیق حسن خان: شمع انجمن، طبع بھوپال، ص ۲۳؛ (۱۱) محمد قدرت اللہ خان گوپاموی: نتائج الافکار، مدراس ۱۲۵۹ھ؛ (۱۲) سعید نفیسی: ''تاریخچۂ ادبیات ایران''، در سالنامۂ پارس۔

(سعید نفیسی)

آغا: یا اَغا (Agha)، یہ لفظ مشرقی ترکی زبان میں عام طور پر ''بڑے بھائی'' کے مفہوم میں اور بعض اوقات ''اینی'' (ini) ''چھوٹے بھائی'' کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زبانِ یاقوتی میں [یاقوت سائبیریا میں آباد ایک ترکی قبیلے کا نام ہے] 'آ گا' کے معنی ''باپ'' کے ہیں (قب V. Thomsen: *Inscriptions de l'Orkhom Déchifrées*، ص ۹۸: آقا)، کُوبیال۔ کراغہ سی (Koybal-Karaghasi) میں ''دادا'' اور ''چچا'' کے اور چُوَاش میں ✱

''بڑی بہن'' کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ منگولوں کے یہاں یہ لفظ دَورِ مذکور میں کلمۂ تعظیم کے طور پر استعمال ہونا شروع ہو چکا تھا، چنانچہ شاہنشاہی خاندان کی شہزادیوں کو آغا کہا کرتے تھے (قبؔ کا ترمئیر (Quatremère): *Histoire des Mongols*، ص xxxix--xl).

عثمانی ترکی میں آغا (جو عام طور پر 'آءَ ا' ā'a بلکہ 'آ' بولا جاتا ہے) ''سردار''، ''مالک'' اور بعض دفعہ ''صاحبِ مِلک'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ کسی گھرانے کے سرحلقۂ خُدّام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بہت سے الفاظ کے ساتھ ترکیب پاتا ہے: مثلاً 'چارشی آغاسی' (منڈی کا نگران محتسب)، 'خان آغاسی' (مسافر خانے کا مالک یا مہتمم، کاروانسرادار)، 'کُورِی آغاسی' (گاؤں کا چودھری) اور 'آغا بک' (''بڑا بھائی''۔ قبؔ سطور بالا یا ''بزرگ تر یا بالا رتبہ شخص'')۔ یہ لفظ ترکی کے دَورِ اصلاحات تک اور بعض صورتوں میں اُس کے بعد بھی خطاب کے طور پر مختلف حیثیتوں کے بہت سے اُن سرکاری ملازمین کے لیے استعمال ہوتا رہا جو زیادہ تر فوجی، یا کم از کم غیر دبیری عہدوں پر مامور تھے، بالخصوص اِفندی [رکؔ بآن] کے مقابلے میں۔ اس نوعیّت کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر آغا حسبِ ذیل ہوا کرتے تھے: ''یکّی (تلفّظ: یینی) چری آغاسی'' (دیکھیے مادّۂ yeni čeri)؛ جاگیرداری نظام کی (وقتی) افواج کے بالمقابل مستقل فوج کے اکثر بڑے افسر اور ''اُوزِنگی Üzengi'' یا ''رکاب آغالَری'' اور دولت سرائے سلطانی کے ''اندرون'' اور ''بیرون'' کے اکثر بڑے بڑے افسر، لیکن صدرِ اعظم کے ''کاہیا'' (کیہ خدا) کو بھی 'آغا' کا لقب دیا جاتا تھا، اگرچہ اس کے فرائض منصبی تمام تر اداری اور دبیری نوعیّت کے تھے اور اس لیے اس کے لقب میں لفظ 'اِفندی' کا اضافہ کر کے اسے ''آغا اِفندِمز'' کہتے تھے؛ اسی طرح دولت سرائے سلطانی کے ملازم خواجہ سراؤں کو، جن کے رئیس ''باب السّعادۃ آغاسی'' یا ''قپی آغاسی'' (سفید فام) اور ''دارالسّعادۃ آغاسی'' یا ''قِیزلَر آغاسی'' (سیاہ فام) کہلاتے تھے، اور ''والدۂ سلطان'' اور شاہی نسل کی شہزادیوں کے ملازم خواجہ سراؤں کو بھی 'آغا' کہتے تھے۔ اس لیے ان خواجہ سراؤں کو جو سرکاری افسروں اور بالعموم بڑے بڑے گھرانوں میں کام کرتے تھے معمولاً ''حَرَم'' یا ''خادمِ آغالَری'' کہنے لگے؛ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ لفظ تنہا آئے تو ممکن ہے ''خواجہ سرا'' کا مفہوم ادا کر رہا ہو۔

۱۸۲۶ء میں جب یکّی چری (یینی چری) فوج کو توڑ دیا گیا اور اس کی جگہ سلطان محمود ثانی نے ''عساکرِ منصُورِیہ'' کو مرتّب کیا تو 'آغا' کا لقب ''قائم مقام'' کے درجے تک کے ناخواندہ افسروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس درجے کے خواندہ افسروں کو اِفندی کہا جاتا تھا۔ آغا کا یہ استعمال لوگوں میں عثمانی سلاطین کے اقتدار کے خاتمے تک برابر جاری رہا۔ مشروطہ کے قیام کے وقت تک ترکی فوج 'یُوزباشی' [کیپٹن] اور 'بِکباشی' [میجر] کے عہدوں کے درمیان ''قُول آغاسی'' (ایک بازو یا جناح کے فرماندہ [ایڈجوٹنٹ میجر]) کا عہدہ موجود ہا۔

لفظ آغا، جسے اکثر ''آقا'' لکھتے ہیں، فارسی زبان میں بھی مستعمل ہے اور یہاں بعض اوقات خواجہ سرا کا بھی مفہوم دیتا ہے، مثلاً ملاحظہ ہو پہلے قاچاری بادشاہ آغا محمد شاہ کے نام میں۔

مآخذ: (۱) راڈلوف (W. Radloff): *Versuch eines Wörterb-uch d. Turko-Tatar. Sprachen*، ۱: ۵-۶؛ (۲) وامبیری (H. Vambéry): *Etymologisches Wörterbuch d. Turko-Tatar. Sprachen*، ص ۵؛ (۳) پاوِہ دَکُورتیؔ (Pavet de Courteille): *Dictionnaire Turc-Oriental*، ص ۲۴؛ (۴) ریڈ ہاؤس (Redhouse): *A Turkish and English Lexicon*، ۱۹۲۱ء، ص ۱۴۶؛ (۵) عطا: تاریخ، جلد اوّل، متعدّد جگہ، بالخصوص فصول میں جو ص ۷، ۳۰، ۷۲، ۱۳۸، ۱۵۷، ۱۸۲، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۵۷ اور ۲۹۰ سے شروع ہوتی ہیں؛ (۶) M. d'Ohsson: *Tableau de l' Empire Ottoman*، ج ۷، قبؔ اشاریہ؛ (۷) *IA*، بذیل مادّۂ؛ (۸) Gibb and Bowen: *Islamic Society and the West*، ج ۱/۱: اشاریہ۔

(H. Bowen بُوان)

آغا خان: (زیادہ صحیح شکل: آقا خان) نِزاری [رکؔ بآن]، ⊗ اسمٰعیلیوں کے امام کا اعزازی لقب، جو سب سے پہلے آقا ے حسن علی شاہ کو ملا۔ اس سلسلۂ امامت میں اب تک چار آغا خان ہو چکے ہیں:

(۱) آغا خان اوّل: حسن علی شاہ (م ۱۸۸۱ء)، جو فتح علی شاہ قاچار (م ۱۸۳۴ء) کے منظورِ نظر اور داماد تھے، اپنے والد خلیل اللہ کے قتل (۱۸۱۷ء) کے بعد ان کے جانشین ہوے۔ [شاہ نے انھیں کرمان کے صوبے کا والی مقرّر کیا، جہاں انھوں نے بڑی دانشمندی اور میانہ روی مگر مضبوطی سے حکومت کی]۔ محمد شاہ قاچار (م ۱۸۴۸ء) کے عہدِ حکومت میں درباری سازشوں کے زیرِ اثر حسن علی شاہ نے ۱۸۳۸ء میں کرمان میں بغاوت کر دی، لیکن انھیں ہزیمت ہوئی اور ۱۸۴۱ء میں وہ سندھ چلے آئے، جہاں انھوں نے سر چارلس نیپیئر (Sir Charles Napier)، کو سندھ کی مہمّ (جنوری ۱۸۴۳ء) میں مدد دی اور بالآخر وہ بمبئی میں آ کر مقیم ہو گئے۔ (۱۸۴۸ء) اور اس کے بعد سے — ایک مختصر سے وقفے کے سوا جب وہ بنگلور چلے گئے تھے — بمبئی اسمٰعیلی خوجوں [رکؔ بآن] کے امام کا مستقرّ رہا ہے۔

(۲) آغا خان دوم: آغا خان اوّل کے بیٹے علی شاہ (م ۱۸۸۵ء) اُن کے جانشین ہوے۔

(۳) آغا خان سوم: سر سلطان محمد شاہ ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوے۔ اپنے والد علی شاہ آغا خان دوم [کے اکلوتے بیٹے تھے]۔ باپ کی وفات پر ۱۷/ اگست ۱۸۸۵ء کو امامت کی مسند پر بیٹھے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی طرز کی بہترین تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۷ء میں آغا خان علی گڑھ کالج گئے، جہاں سر سیّد

احمد خان نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ ۱۸۹۸ء میں آغا خان پہلی مرتبہ انگلستان گئے اور ملکۂ وکٹوریا سے ملاقات کی۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دہلی کے اجلاس کی صدارت کی۔

سر آغا خان کو ہندوستان کے سیاسی معاملات سے گہری دلچسپی رہی۔ ۱۹۰۳ء میں وہ ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل (Imperial Legislative Council) کے رکن نامزد ہوے۔ ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ (All-India Muslim League) معرضِ وجود میں آئی اور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک آغا خان اس کے صدر رہے۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے تیس لاکھ روپیہ جمع کر کے مسلم کالج علی گڑھ کو یونیورسٹی بنانے کا سامان فراہم کیا۔ سر آغا خان کے اہمّ کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے ایک وفد کی قیادت کی جو لارڈ منٹو کے پاس ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ حقِّ انتخاب کے مطالبے کے لیے گیا تھا۔ چنانچہ اصلاحات مارلے۔منٹو (Morley-Minto Reforms) میں مسلمانوں کو یہ حق حاصل بھی ہو گیا۔ جنگِ عظیم کے بعد حکومتِ ترکیہ کے خلاف اتحادی طاقتوں کے ناجائز رویّے پر تقریباً ۱۸,۰۰۰ ہندوستانی مسلمان بطورِ احتجاج انگریزی علاقوں سے ہجرت کر کے سرحد پار افغانستان میں چلے گئے۔ سر آغا خان نے انھیں اس مہلک اقدام سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ یہ لوگ باہر جا کر سخت پریشان ہوے اور بالآخر بے پناہی کی حالت میں واپس آنے پر مجبور ہوے۔ آغا خان نے انھیں بحال کرنے میں بہت مدد دی۔ ہندوستان کے متعلّق گول میز کانفرنسوں میں بھی، جو موجودہ صدی کے تیسرے عشرے میں ہوئیں، انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کی پُرزور حمایت کی۔ [حکومت برطانیہ نے انھیں جی۔سی۔آئی۔ای، جی۔سی۔ایس۔آئی، جی۔سی۔وی۔او، کے۔سی۔آئی۔ای۔کی طرح کے اعزازات سے نوازا]۔

سر آغا خان نے ۱۹۳۲ء میں اور بعد کی بین الاقوامی مجلس کی مؤتمرِ تخفیفِ اسلحہ (کانفرنس) میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۷ء میں وہ مجمعِ اتحادِ ملکِ عالمی (League of Nations) کے صدر بھی بنے۔ جنگ دوم کے اثنا میں اور اس کے بعد انھوں نے سیاسی مشاغل ترک کر دیے۔

سر آغا خان اپنی وسیع المشربی کی بنا پر عالمی شہری تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان کی کونسل آف سٹیٹ (Council of State) نے انھیں صلح کا نوبل پرائز (Nobel Prize) دینے کی سفارش کی۔ سر آغا خان کو تمام اسلامی ممالک میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں حکومتِ ایران نے انھیں ایرانی قومیّت عطا کی اور ''والاحضرت ہمایون'' (His Royal Highness) کا اعزاز بخشا۔ ۱۹۵۱ء میں حکومتِ شام نے انھیں 'نشان بنوامیّہ' عطا کیا۔ ۱۹۵۳ء میں انڈونیشیا کے سفیر (مقیم لنڈن) کی وساطت سے انھیں ''گل سرخ و گل سفید'' سے نوازا گیا۔

آغا خان ہمیشہ ایک باوقار تبلیغی جماعت کے حامی رہے ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ہزارہا غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ انھوں نے نیچ ذات کے تقریباً ۴۰,۰۰۰ ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں شامل کیا۔ آغا خان کے مریدوں کی، جو اسمٰعیلی کہلاتے ہیں، تعداد تقریباً دو کروڑ ہے اور وہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جنوبی امریکہ، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی ان کے معتقدین موجود ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ان کے مریدوں کو ''خوجہ'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ آغا خان کو امامِ حاضر (امامُ الوقت) مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صحیح ہدایت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا زندہ امام رہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر منقطع سلسلۂ امامت میں منسلک ہو۔ اس سلسلے کے پہلے امام حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، ہیں اور انھیں سے سلسلۂ امامت شروع ہو کر آغا خان تک پہنچا اور سر آغا خان اسی سلسلے میں اڑتالیسویں امام تھے۔ اسمٰعیلی لوگ اسلام کے پہلے تین خلفا کا بھی بڑا احترام کرتے ہیں اور انھیں خلیفہ مانتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں سر آغا خان کا ۵۰ سالہ جشن (گولڈن جوبلی) دوبار منایا گیا۔ پہلے بمبئی میں، پھر نیروبی (Nairobi) میں۔ ان دونوں موقعوں پر انھیں سونے سے تولا گیا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں ان کی الماسی ('ڈائمنڈ') جوبلی (یا ۶۰ سالہ جشن) بمبئی اور دارالسّلام (افریقہ) میں منایا گیا اور انھیں ہیروں سے تولا گیا۔ ان کی ستّر سالہ پلاٹینم جوبلی ۳ فروری ۱۹۵۴ء کو منائی گئی اور ان کے مغربی پاکستان میں رہنے والے مریدوں نے انھیں پلاٹینم (Platinum؛ زرِسفید) سے، جو دنیا میں سب سے زیادہ بیش قیمت دھات ہے، تولا۔ سر آغا خان نے وہ تمام سونا، جواہرات اور پلاٹینم جن سے انھیں تولا گیا اپنے مریدوں کی فلاح و بہبود کے لیے واپس لوٹا دیے۔

گھوڑ دوڑ سر آغا خان کا دل پسند مشغلہ تھا، بلکہ کاروبار بھی تھا، چنانچہ نسل کشی اسپان کا کام انھوں نے علمی اصولوں پر مبنی کیا تھا۔ سر آغا خاں مغرب کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں کے بادشاہ تھے مگر کبھی شرط نہیں لگاتے تھے۔ انھوں نے ڈربی (Derby) کا انعام پانچ مرتبہ جیتا۔ اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ ۱۹۵۲ء میں جب انھوں نے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کامیابی حاصل کی تو انعام کی ساری رقم انھوں نے یورپ کی ایک یونیورسٹی کو اس غرض سے دے دی کہ وہاں علومِ اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایک پروفیسر مقرّر کیا جائے۔ تفریحی کھیلوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھوں نے دنیا بھر میں چندے کی بڑی بڑی رقمیں دیں۔

سر آغا خان کی چار بیویاں تھیں۔ ان کی پہلی شادی ۲۱ برس کی عمر میں ان کے چچا کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری اور تیسری شادی علی الترتیب تھیرِ یسا مَیلیانو (Theresa Magliano) اور آندرے یوزفین لیونی کارنوں (MIIe. Andree Josephine Leonie Carron) سے ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے ایوٹ لابُوئیس (MIIe. Yvette Labouresse) (اسلامی نام: امِّ حبیبہ) سے آخری شادی کی۔ وہ عام طور پر 'ماتا سلامت' کے لقب سے مشہور

ہیں۔ دوسری بیوی سے ان کے بڑے بیٹے شہزادۂ علی خان (م ۱۹۶۰ء) پیدا ہوے اور تیسری بیوی کے بطن سے دوسرے بیٹے صدرالدین تولّد ہوے۔ سر آغا خان نے ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو سوئٹزرلینڈ میں ورسوا (Versoi) کے مقام پر وفات پائی اور بالآخر اُسوان (مصر) میں دفن کیے گئے۔

(۴) آغا خان چہارم: شہزادۂ شاہ کریم، جو شہزادۂ علی خان کے بیٹے اور سر آغا خان سلطان محمد شاہ کے پوتے ہیں، سر آغا خان کی وصیت کے مطابق ان کے جانشین ہوے۔ وہ اپنے دادا کی وفات کے وقت تقریباً بیس سال کے تھے۔

مآخذ: (۱) شہزادۂ آغا خان: *India in Transition*، لنڈن ۱۹۱۸ء؛ (۲) سردار اقبال علی شاہ: *The Prince Aga Khan*، لنڈن ۱۹۳۳ء؛ (۳) سر نوروجی ایم دُمسیہ: *Aga Khan and his Ancestors*، بمبئی ۱۹۳۹ء؛ (۴) Dr. Zaki and Prince Agha Khan: *Glimpses of Islam*، لاہور ۱۹۴۰ء؛ (۵) Habib V. Keshavji: *The Agha Khan and Africa*، ڈربن (جنوبی افریقہ) ۱۹۵۰ء؛ (۶) *Message of Prince Aga Khan to Pakistan and World of Islam*، طبع سلطان علی الافریقی۔ اس میں کراچی کی تقریریں ہیں، ۱۹۵۲ء؛ (۷) Harry J. Greenwell: *His Highness the Aga Khan, Imam of the Ismāīlīs*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۸) Stanley Jackson: *Aga Khan: Prince, Prophet and Sportsman*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۹) قیوم ملک: *Prince Aga Khan, Guide, Friend and Philosopher of the World of Islam*، کراچی ۱۹۵۴ء؛ (۱۰) شیر علی علی دینہ: *Platinum Jubilee Souvenir*، کراچی ۱۹۵۴ء؛ (۱۱) محمد امین زبیری: *Prince Aga Khan*، کراچی ۱۹۵۱ء؛ (۱۲) محسن ساعی: آغا خان محلاّتی، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۰؛ (۱۳) شیر علی علی دینہ: تاریخِ امامت، ص ۴۸۰، طبع کراچی ۱۹۵۲ء؛ (۱۴) اے۔ جے۔ چنارا: نور المبین، بمبئی ۱۹۵۰ء۔ نمبر ۱ تا نمبر ۱۰ انگریزی میں، نمبر ۱۱ اردو میں، نمبر ۱۲ فارسی میں، نمبر ۱۳ سندھی میں اور نمبر ۱۴ گجراتی زبان میں ہے۔ [(۱۵) آ، بذیل مادہ؛ (۱۶) *Encyclopaedia Americana*، نیو یارک۔ شکاگو ۱۹۴۹ء، ۱:۲۲۶۔۲۳۷؛ (۱۷) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۶۱ء، ۱:۳۴۴۔۳۴۵؛ (۱۸) *Britannica Book of the Year(1961)*، ص ۵۱۰].

(شیر علی علی دینہ و ادارہ)

---

* **آغا محمد شاہ:** ایران کے خاندانِ قاچار [رک بآں] کا بانی، جو ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں پیدا ہوا، طاقتور قبیلۂ قاچار کے موروثی رئیس محمد حسن خان کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ نادر شاہ کے بھتیجے عادل شاہ کے حکم سے اسے خصّی کر دیا گیا اور اس امر نے بعد کی زندگی میں اس کے کردار میں کجی پیدا کر دی۔ ۱۷۵۸ء میں اپنے باپ کے قتل ہو جانے پر وہ قاچاریوں کا رئیس بنا۔ اپنی جوانی کا زمانہ اس نے شیراز میں کریم خان کے دربار میں بسر کیا۔ ۱۷۷۹ء میں کریم خان کی وفات پر وہ بھاگ کر استرآباد چلا گیا اور طویل مدّت تک اُس کی اولاد سے برسرِ پیکار رہا۔ ۱۷۸۵ء تک وہ کریم خان کی مملکت کے شمالی اور وسطی حصّے کا مالک بن چکا تھا اور اسی سال اس نے تہران کو اپنا دارالحکومت بنایا اس لیے کہ اس شہر کا محلِّ وقوع مرکزی اور قاچاریوں کے علاقے سے نزدیک تھا۔ ۱۷۹۴ء میں اس نے لطف علی خان کو گرفتار کر لیا جو مردِ دلیر اور کریم خان کے جانشینوں میں سے آخری تھا اور خوفناک جسمانی ایذائیں دے کر اسے قتل کروا دیا۔ اگلے سال اس نے گُرجستان پر ایرانی اقتدار دوبارہ قائم کیا۔ ۱۷۹۶ء میں شاہ کی حیثیت سے اس کی تاج پوشی ہوئی؛ آگے چل کر اس نے نادر شاہ کے نابینا پوتے شاہ رخ کو معزول کر کے خراسان کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور اسے جسمانی اذیّتیں دے کر یہ بتانے پر مجبور کیا کہ اس نے اپنے دادا کے جواہرات کہاں چھپائے تھے۔ اس بدقسمت شہزادے کو اتنا سخت عذاب دیا گیا کہ وہ مر گیا، لیکن قدرت نے بہت جلد آغا محمد سے انتقام لیا اور ۱۷۹۷ء میں وہ قتل کر دیا گیا۔ مدبّر اور فوجی قائد ہونے کی حیثیت سے اُس نے بڑی قابلیت دکھائی۔ لیکن اس کے نام کو اس کی انتقام پسندی، قابلِ نفرت بے رحمی اور کبھی سیر نہ ہونے والی حرص نے داغدار کر دیا۔

مآخذ: (۱) عبدالرزاق بن نجف قُلی: مآثر سلطانیہ، تبریز ۱۸۲۶ء (ترجمۂ انگریزی از برجز (Sir Harford Jones Brydges)، بعنوان *The Dynasty of the Kajars*، لنڈن ۱۸۳۳ء)؛ (۲) رضا قلی خان ہدایت: روضۃ الصفای ناصری، ج ۹؛ (۳) میلکم (Sir J. Malcolm): *History of Persia*، ۲:۳۰۰۔۳۰۲؛ (۴) واٹسن (R. G. Watson): *A History of Persia from the Beginning of Nineteenth Century to the Year1858*، لنڈن ۱۸۶۶ء، ص ۶۵۔۱۰۵؛ (۵) سائکس (P. M. Sykes): *History of Persia*، طبع دوم، ۲:۲۸۹۔۲۹۶.

(ایُوآر CL. HUART و لاک ہارٹ L. LOCKHART)

آغاچ: عثمانی ترکی میں اس لفظ کے معنی "درخت" اور "لکڑی" کے * ہیں۔ مشرقی ترکی میں (جس میں اس لفظ کی صورتیں یِغَچ اور یِغاچ زیادہ رائج ہیں) اس کے معنی ذَکَرُ الرِّجل [الکاشغری] اور فرسنگ ["الفَرسَخُ من الاَرض، الکاشغری] کے بھی آئے ہیں، قب الکاشغری: دیوان لغات الترک، استانبول ۱۹۳۳ء، ۳:۶؛ براکلمان (Brockelmann): *Mitteltürkische Wortschatz*، بُوڈاپسٹ۔ لائپزگ ۱۹۲۸ء، ص ۸۷۔ الکاشغری نے اس لفظ کی فقط دو ہی شکلیں یِغاچ ["بالالف اجوذ"] اور یِغَچ لکھی ہیں، لیکن راڈلوف (W. Radloff): *Versuch eines Wörter buches der Türk-Dialekte*، ۱۸۹۳ء، ۱:۱۵۰ نے اَرغَچ اور اس لفظ کی دوسری شکلیں مثلاً اَغَنز، اَغَس اور یَغَچ بھی دی ہیں، جس کے معنی صرف درخت یا لکڑی نہیں بلکہ

فاصلے کا ایک پیمانہ بھی ہیں۔ یہ پیمانہ، جسے الکاشغری نے فرسخ کہا ہے، اس فاصلے سے تین گنا بیان کیا جاتا ہے جہاں سے کوئی آدمی دو آدمیوں کے درمیان کھڑا ہو کر اپنی آواز دونوں تک پہنچا سکے (قب پاوہ دہ کُورتی (Pavet de Courteille): *Dictionnaire Turc-Oriental*، پیرس ۱۸۷۰ء، ص ۵۵۴ و ۵۵۵)۔ اس مفہوم میں میر علی شیر نوائی کے ایک شعر کے مطابق ایک ''یِیغاج'' بارہ ہزار دُھرے ذراع (''قاری'') کے برابر ہوتا ہے اور Pietro della Valle : *Voyages*، ۳:۱۴۱ کے بیان کے مطابق ایک ہسپانوی لیگ یا چار اطالوی میلوں کے برابر، فلانڈاں (Flandin) اور کُوستا (Costa): *Voyages en Perse*، ۱:۱۱۱ کے بیان کے مطابق ۶ کیلومیٹر اور راڈلوف (Radloff)، محلّ مذکور، کے مطابق چھے سات روسی ورسٹوں (versts) کے قریب ہوتا ہے۔

مآخذ: متذکرۂ صدر حوالہ جات کے علاوہ (۱) سلیمان اِفندی: لغت چَغَتائی و ترکیِ عثمانی، ص ۱۵ (ترجمۂ I. Kúnos، بوڈاپسٹ ۱۹۰۲ء، ص ۶، ۱۰۵)؛ (۲) وامبیری (H. Vámbéry): *Čagataische Sprach Studien*، ص ۳۵۷۔

(اِیُوآر CL. HUART و بُوِان H. BOWEN)

---

* **آغمات:** جنوبی مرّاکُش میں چھوٹا سا قصبہ، جو شہر مرّاکُش سے تقریباً پچیس میل جنوب میں ایک چھوٹے سے نالے پر واقع ہے، جسے وادیِ وَرِیکہ (Ūrike) یا وادی آغمات کہتے ہیں۔ اس کا محلِّ وقوع سلسلۂ اطلسِ کبیر کے (جسے ازمنۂ وسطیٰ میں جبلِ دَرَن کہتے تھے) سرے پر ہے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی سے، جغرافیہ دان ابوعُبید البکری کے قول کے مطابق، اس نام کا اطلاق دو الگ الگ بستیوں پر ہوتا تھا، جو ایک دوسرے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھیں، یعنی آغمات اَنْ۔وَیْلان (اَلْبَیْذَق: *Doc. inédilts d'hist. almohade*، نے یہ نام اسی طرح لکھا ہے)، یا آغماتِ اَیْلان (اَیْلان ایک بربری قبیلے کا نام ہے، جس کی عربی شکل آغمات ہَیْلا نہ ہے) اور آغمات اُوْرِیکہ یا آغماتُ اُوْرِیکہ (وَرِیکہ)۔ آج کل آغمات وِرِیکہ ایک دیہاتی قصبہ ہے، جس کا نام صرف اُوْرِیکہ ہے۔ البکری اور الاِدْریسی نے آغمات کے متعلّق لکھا ہے کہ یہ ایک آسودہ حال شہر ہے، جس کے اردگرد شاداب باغ ہیں اور اس کی آبادی کثیر اور باشندے بہت محنتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مرّاکُش کی بنا سے پہلے جب المُرابِطین کی حکومت سلسلۂ اطلسِ کبیر سے آگے بڑھنے لگی تھی تو اس دور کے آغاز میں یہ جنوبی مرّاکُش کا سب سے بڑا شہری مرکز تھا؛ نہ صرف یہ بلکہ اگر بعض اندلسی معاجم کے چند تراجمِ فضلا کی شہادت تسلیم کر لی جائے تو یہ ثقافتی مرکز بھی تھا جو جِدّیت اور فعّالیّت سے نہایت پُر تھا۔ یوسف بن تاشُفِین [رک بآں] کی مسند نشینی سے پچیس سال پہلے کے عرصے میں قُرطُبہ بلکہ القَیْرَوان تک سے بہت سے علما و فقہا آغمات میں امنڈ آئے۔ قیروان سے اس لیے کہ شورشوں اور ہنگاموں کے باعث افریقیہ تباہ ہو گیا تھا اور قیروان کے علما بڑی تعداد میں ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس وقت آغمات ایک چھوٹی سی بربر ریاست کا پایے تخت تھا، جو مَغْراوَہ [رک بآں] کے سردار لَمْتُونَہ کے قبضے میں تھی اور جس نے افریقیہ کے ایک مہاجر کی مشہور لڑکی زینب النَّفْزَاوِیَّہ سے شادی کی تھی۔ یہ لڑکی بعد میں علی الترتیب لَمْتُونَہ کے سردار ابوبکر بن عمر [دیکھیے المرابطون] اور اس کے نائب و جانشین یوسف بن تاشُفِین کے عقد میں آئی۔ اس ذہین اور مہذّب شہزادی نے، جو بعض وقائع نگاروں کے قول کے مطابق نیم ساحرہ بھی تھی، جلد ہی آغمات میں اپنے گرد و پیش ادیبوں کا ایک گروہ جمع کر لیا اور الصحرا کے اکھڑ لَمْتُونَہ سرداروں اور ان کی بیویوں کو بھی بہتر طرزِ بود و ماند سے آشنا کر دیا۔ جونہی مرّاکُش کی بنا رکھی گئی اور وہ المُرابِطین کا پایے تخت بن گیا، تو اس نے آغمات کے اس منتخب حلقے کے بہت سے ارکان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور یہیں سے آغمات کے زوال کا آغاز ہوا، گو اس زوال کی تکمیل بظاہر بہت بعد میں ہوئی، اسپین کے ان دو فرمانرواؤں کی جبری قیام گاہ کے طور پر، جنھیں المُرابِطین نے معزول کیا تھا، آغمات کو منتخب کیا گیا۔ ان فرمانرواؤں میں سے ایک تو تھا غرناطہ کا زِیری فرمانروا عبداللہ بن بُلُکّین [رک بآں] اور دوسرا اشبیلیہ کا مشہور والی المُعْتَمِد۔ بعد ازاں کوہستانِ اطلسِ کبیر میں اپنے 'خروج' سے پہلے (مذہبی اور سیاسی دونوں معنی میں 'خروج') جب مہدی بن تُومَرْت مشرق سے لوٹ رہا تھا تو آغمات ہی اس کے سفر کی آخری منزل تھی۔ لیوافریقی (Leo Africanus) کے عہد تک بربر کا یہ قدیم دارالسلطنت مکمّل طور پر زوال پذیر ہو چکا تھا۔

مآخذ: (۱) بَکْری: *Descr. de l'Afr. Sept.*، ۱۵۲/۲۹۱-۲۹۲؛ (۲) اِدْرِیسی: المَغْرِب، ۶۵-۶۷/۶۷-۷۷؛ (۳) الاِسْتبصار، ترجمۂ فانیان (Fagnan)، ص ۱۷۷؛ (۴) ابن عبدالمنعم الحِمْیَری: الروض المِعْطار، مقالہ، غیر مطبوعہ؛ (۵) لیوافریقی (Leo Africanus): *Descr. de l'Afrique*، (طبع Schefer) ۱:۲۰۹ ببعد و ۳۳۸ ببعد؛ (۶) L. de Mármol: *Descr. Gen-eral de Africa*، غرناطہ ۱۵۷۳ء، ۲:۳۵ ببعد؛ (۷) E. Doutté: *En tribu, Missions au Maroc*، پیرس ۱۹۱۴ء، باب اوّل؛ (۸) العبّاس بن ابراہیم المرّاکُشی: الاِعْلام بمن حلّ مرّاکُش و آغْمات من الاَعْلام، فاس ۱۹۳۶ء ببعد، متعدّد جگہ؛ (۹) گومیز (E. García Gómez) نے آغمات تک اپنے سفر اور المعتمد کے مزار کی زیارت کا ایک رومانی بیان بعنوان *El supuesto Sepulcro de Mu'tamid de Sevilla en Āghmāt*، در مجلّۂ *Andalus*، ۱۹۵۳ء، [ج ۱۸]: ۴۰۲-۴۴۱ شائع کیا ہے۔

(لیوِی پروانسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

---

* **آفراگ:** (بربری زبان میں بمعنی ''احاطہ'') ایک اصطلاح ہے جو مَرّاکُش میں الموحّدین کے عہد سے کپڑے کی اس قنات بندی کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے جو فرمانروا اور اس کے خَدَم وحَشَم کے خیموں کو لشکرگاہ کے باقی ماندہ حصّے سے الگ کرتی ہے۔ یہ اصطلاح فارسی کے ''سَراچَہ'' یا ''سراپردہ'' [سُرادِق] کے مترادف ہے.

(ادارۂ آآ [انگریزی] طبع جدید)

⊗ **آفرین:** فقیراللہ لاہوری، فارسی کا ممتاز شاعر، درویشانہ زندگی کی وجہ سے ''شاہ'' بھی نام کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے (حاکم: مَرْدُم دیدہ، ص ۱۷)۔ گوجر قوم کی جُوْیَہ گوت سے تھا (''جوْیہ بروزن پوْیہ''، خزانۂ عامرہ، ۲۸، قب مولوی محمد عبدالمالک: شاہانِ گوجر، اعظم گڑھ ۱۳۵۳ھ، ص ۱۳ و ۱۲۹، نیز ص ۲۱۰، جہاں جویہ کو گوجروں اور جاٹوں کی مشترکہ شاخ بتایا گیا ہے)۔ اپنی پیدائش سے وفات (۱۱۵۴ھ/ ۱۷۴۱ء) تک لاہور کے محلّۂ بخاری میں رہا۔ اسّی سال سے کچھ زیادہ عمر پائی [عہدِ عالمگیر سے سنہ ۲۳ جلوس محمد شاہی تک۔ حاکم: مَرْدُم دیدہ]۔ بعد وفات اپنے مکان مسکونہ ہی میں دفن ہوا (مردُم دیدہ، ص ۲۲)۔ یہ محلّہ (= طلا بخاری، تلّہ لا لاہور، بخارا ے لاہور) شاہ عالمی دروازے کے باہر موجود میو ہسپتال کے حدود میں، سابقہ چھجو بھگت کے چوبارے کے گرد آباد تھا (لاہور قدیم، مقالہ مولوی محمد شفیع، در اورئینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء و مئی ۱۹۲۵ء).

آفرین اپنے زمانے کے ہندوستان میں صف اوّل کا فارسی شاعر مانا گیا، جس کی تعریف میں علّامہ آزاد بلگرامی (مآثر الکِرام، جلد ۲ (= سرو آزاد) و خزانۂ عامرہ، تحتِ مادّہ) اور سراج الدّین علی خان آرزو جیسے فاضل ہم عصر نقّاد رطب اللسان پائے جاتے ہیں [اور اسے ''بسیار خوش زبان و تازہ خیال'' لکھتے ہیں (مجمع النفائس، تحت مادّہ)]۔ بارھویں اور نصف اوّل تیرھویں صدی ہجری/ اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکروں میں حالات اور خاصی تعداد میں آفرین کے اشعار دیے گئے ہیں (مثلاً نشتر عشق، معراج الخیال وغیرہ میں)۔ اس کی بے نیازی کے باوجود والیِ پنجاب عبدالصمد خان اور ان کا بیٹا زکریا خان، دونوں اس کی تعظیم وتوقیر اور معاشی کفالت کرتے رہے۔ اس کا علم وفضل، توکّل و استغنا، فقرا و غربا سے تواضُع و اِنکسار، امرا سے کبریا سے پیش آنا مسلّم ہیں۔ [علومِ عربیہ میں فارغ التحصیل تھا، رمل بھی جانتا تھا، کتاب دانی میں ماہر، مشقِ شعر اکثر بطرز صائب گاہے بطور ناصر علی کرتا تھا۔ حاکم]۔ لاہور میں اس کے بہت سے قدر شناس اور شاگرد تھے، جن میں عبدالحکیم حاکم، صاحبِ مردُم دیدہ امتیاز رکھتا ہے.

پانچ، چھے ہزار بیت کا ضخیم دیوان غزلیات وقصائد (حاکم: مردُم دیدہ، ص ۱۸) یادگار چھوڑا (قب معراج الخیال، ص ۵۵، جہاں تعداد اشعار، شاید بشمولِ مثنویات، دس بارہ ہزار بتائی گئی ہے)۔ تین مثنویاں لکھیں: ابجد فکر، جو اس کے ابتدائی عہد (زمانۂ عالمگیر بادشاہ، یعنی ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء سے قبل) کی تصنیف تھی (مردُم دیدہ، ص ۱۸)۔ ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء میں آزاد بلگرامی لاہور سے گزرے تو مصنّف نے اپنی پیر رانجھا (فارسی) انھیں سنائی [جو عہدِ فرّخ سیر، ۱۱۲۴-۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۲-۱۷۱۹ء میں لکھی گئی تھی؛ حاکم] اور چار برس بعد ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں انھیں کے وُرود کے موقع پر مثنوی اَنْبانِ معرفت اپنے قلم سے لکھ کر نذر کی (مآثر الکرام، ۲:۲۰۵)۔ مگر مردم دیدہ کی صراحت کے مطابق انبانِ معرفت بہادر شاہ کے عہد (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء-محرّم ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء) میں لکھی جا چکی تھی۔ یہ مثنوی بھی دیوانِ آفرین کی طرح اب نایاب ہے؛ صرف پیر رانجھا پنجاب یونیورسٹی کے مجموعۂ شیرانی میں محفوظ ہے (عدد ۸۶۷) اور اسی کا ایک نسخہ متحفِ برطانیہ کے مخطوطات میں بظاہر اس کے پہلے مصرع (:''بنام چمن سازِ نازونیاز'') کی بنا پر نازونیاز کے نام سے درج فہرست ہے (ریو (Rieu)، ۲، ۷۱۰؛ شپرنگر (Sprenger)، ص ۳۱۷)۔ شاعر صراحت کرتا ہے کہ یہ داستان لاہور میں محلّے محلّے گائی جاتی تھی [قب سُجان رائے: خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء، ص ۷۷ (صحیح قراءت 'دھید و رانجھا' ہے)]؛ اس کی مقبولیت دیکھ کر اس نے فارسی میں نظم کر دی۔ چند شعرا لاہور کی تعریف میں بھی ضمناً تحریر ہیں (ص ۱۳).

مآخذ: (۱) غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکِرام، ج ۲، موسوم بہ سروِ آزاد، طبع عبداللہ خان و عبدالحق ۱۹۱۳ء، ص ۲۰۵؛ (۲) وہی مصنّف: خزانۂ عامرہ، کان پور، ص ۲۸-۳۴؛ (۳) سراج الدّین علی خان آرزو: مجمع النفائس، قلمی، مجموعۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، ورق ۳۶؛ (۴) عبدالحکیم حاکم: مردُم دیدہ، طبع سیّد عبداللہ، لاہور ۱۳۳۹ ش/ ۱۹۶۱ء، اشاریہ؛ (۵) وزیر علی عبرتی عظیم آبادی: معراجِ الخیال، قلمی، مجموعۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، ص ۵۵؛ (۶) حسین قلی عظیم آبادی: نشتر عشق، مجموعۂ مذکور، ورق ۱۱۹؛ (۷) محمد صدّیق حسن خان: شمعِ انجمن، بھوپال ۱۲۹۳ھ، ص ۳۴؛ (۸) ریو (Rieu): *Catalogue Persian Mss.*، ص ۱۷۰؛ (۹) شپرنگر (Sprenger): *Catalogue Ar., Pers., Hin., Mss.*، کلکتہ ۱۸۵۴ء، ص ۳۱۷؛ (۱۰) مولوی محمد عبدالمالک: شاہانِ گوجر، اعظم گڑھ، ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء، ص ۱۳، ۱۲۹، ۲۱۰، ۴۳۵؛ (۱۱) ڈاکٹر مولوی محمد شفیع: ''لاہور قدیم''، در اورئینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۷۳ و مئی ۱۹۲۵ء، ص ۹۱.

(سیّد ہاشمی فرید آبادی)

آفرین: (فارسی: = پازند آفْرِیْن)، لغوی معنی ''دعاے نیک'' (از * ''آفْرِی'' + لاحقۂ ''نَ'') ضِدّ نَفْرِیْن = ''بددعا، لعنت'' (''اَنْ'' + ''آفْرِین'')۔ آفْرین بالعموم ''شاباش'' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ کتبِ لغت میں ''فَرِی'' (زِنْد = فَرِیْنِیتِ، زبانِ وید Prināte = Vedic پُرِیناتِہ) کو آفرین کا مُخفّف بتایا ہے۔ عوامی عربی میں مستعار ہو کر یہ لفظ عَفَارِم (مصر)، اَفَرْم (الجزائر) کی صورت میں آیا ہے۔ جلال الدّین مَلِک شاہ کے ہیئت دانوں نے ایرانی تقویم کی اصلاح

کے موقع پر کبیسہ کے پانچ دنوں میں سے پہلے دن کا نام آفِرین رکھا (''نامِ روزِ اوّل خمسۂ مسترقّۂ سالہایِ مَلَکی'').

مآخذ: (۱) J. Darmesteter: *Etudes iraniennes*، ۱: ۲۶۲، ۳۰۹؛ (۲) ہارن (P. Horn) در *Grundr. der iran. Philol*، ۱ (ب): ۴۰، ۱۲۵؛ (۳) Vollers در *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، ص ۵۰، ۶۴۶؛ (۴) Beaussier: *Diction. arabe-français*، ص ۱۱؛ [(۵) فرہنگِ آنندراج، بذیلِ کلمہ و بذیلِ خمسۂ مسترقہ].

[آ آ طبع اوّل] (ایُوآر Cl. HUART)

---

* **آق حِصار:** (ترکی = ''سفید قلعہ'') متعدّد شہروں اور قصبوں کا نام.

۱- سب سے زیادہ معروف آق حصار مغربی آناطولی میں ہے۔ پہلے وہ ولایتِ اَیْدِین میں تھا اور ۱۹۲۱ء کے بعد سے ولایتِ مَنِیسہ [مَغْنِیسہ] میں شامل ہے۔ یہ دریاے گُوردُوک (Gördük) (دریاے گِدِیز [یا گدوس-سامی] کے ایک ذیلی معاون) کے بائیں کنارے کے نزدیک ایک میدان میں واقع ہے اور سطحِ بحر سے ۱۱۵ میٹر بلند ہے۔ عہدِ قدیم اور عہدِ بوزنطی میں یہ تُیاتِیْرہ (Thyatira) کے نام سے مشہور تھا (دیکھیے Pauly-Wissowa، بذیلِ مادّہ)۔ اس کا ترکی نام اس قلعے کی بدولت پڑا جو قریب کی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ آلِ عثمان نے آق حصار کو ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء میں اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا مگر اُس اختلال کے دوران میں جو تیموری حملے کی وجہ سے واقع ہوا یہ ان کے ہاتھوں سے پھر نکل گیا؛ خلیل یَخْشی بیگ نے ۸۲۹ھ/ ۱۴۲۵-۱۴۲۶ء میں اسے باغی سردار جُنَید [رک بآن] سے چھین کر دوبارہ مسخّر کیا (دیکھیے حاجّی خلیفہ: تقویم التواریخ)۔ ۱۹۱۴ء سے پیشتر آق حِصار کی آبادی بارہ ہزار تھی، جس میں تین چوتھائی مسلمان تھے۔ ۱۹۳۵ء میں یہ تعداد اکیس ہزار ہوگئی۔ Cuinet: *Turquie d' Asie*، ۳: ۵۴۸ ببعد کے بیان کے مطابق ولایتِ مَنِیسہ کے اندر آق حِصار کی قضا میں ۳۱,۷۴۶ باشندے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد اکیانوے ہزار ہوگئی.

۲- آق حصار ضلع مَرْمَرَہ (Marmara) میں، جو اب پاموق اَوْوَہ کہلاتا ہے، ولایتِ اِزْمِید (قوجہ ایلی Kodja-eli) کے اندر قضا گِیْوِہ (Geyve) میں دریاے سَقارْیَہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور آناطولی ریلوے کا ایک سٹیشن ہے۔ اسے آلِ عثمان نے ۷۰۸ھ/ ۱۳۰۸-۱۳۰۹ء میں فتح کیا۔ یہ قلعہ، جو اب غیر آباد ہے، ایک وسیع میدان پر مُشْرِف ہے۔ بہت سے قدیم ستونوں اور عمارتوں کے کھنڈر شہر کے اندر اور اس کے قرب و جوار میں زبانِ حال سے اس کی گزشتہ خوش حالی کی گواہی دے رہے ہیں، لیکن اس کا قدیم نام معلوم نہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی آبادی ۱,۶۶۸ نفوس پر مشتمل تھی اور اس کے ناحیے کی آبادی ۹,۳۲۴ نفوس پر.

۳- آق حِصار پہلے زمانے میں ایک چھوٹے سے مقام کا نام بھی تھا، جو (بُوسْنَہ سرای یا محض سرای) Sarajevo کی مغربی جانب واقع تھا، جہاں دریاے پُروسے کوٹا (Prusekota) [آج کل اس کا نام پُولْنِیّ (Polnyi): یعنی زیریں) وَکُوف (Wakuf) ہے] سِیمِس کِلِتْزا (Semeskilitza) میں گرتا ہے۔ مصطفٰی پاشا نے ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱-۱۵۰۲ء میں اسے فتح کیا (ہامر J. von Hammer: *[Rumeli] und Bosna*، ص ۱۶۶؛ پِرْتُوسِیے [Ch. Pertusier]: *La Bosnie*، پیرس ۱۸۲۲ء، ص ۲۷۲).

(K. SÜSSHEIM)

۴- شمالی اَلبانیا میں ایک قصبہ ہے، جسے ترکی زبان میں آقچہ حِصار (Aḳče Ḥiṣār) اور اَلبانوی زبان میں قُرْوَیَہ یا قرْوَیَہ (Kruje, Kroya: کنواں-چشمہ) بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ سنجاقِ شقُودْرَہ میں شامل تھا۔ آقرْوپولِیْت (Acropolite) (تیرھویں صدی عیسوی) کے وقائع نامے میں یہ Kroas کے نام سے مذکور ہے۔ ۱۳۴۳ء میں یہ وَیْنس والوں کے قبضے میں تھا اور ۱۳۹۵ء میں ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہ قُسْطُنْطِین قاسْتریْوتی (Constantine Castriota) کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کی شہرت اسکندر بیگ (Scanderbeg) [رک بآن] کے مَقَرّ ہونے کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۴۵۰ء، ۱۴۶۶ء اور ۱۴۶۸ء کے شدید محاصروں کا آقچہ حِصار نے کامیابی سے مقابلہ کیا۔ بالآخر ۸۸۳ھ/ ۱۴-۱۵ جولائی ۱۴۷۸ء میں اسے [سلطان] مُحمّد ثانی نے فتح کرلیا۔ آگے چل کر یہ اَلبانیا کے بِکْتاشی [رک بآن] درویشوں کے سلسلے کا مرکز بن گیا۔ صارِی صالْتِق دِدِہ (Sari Saltik Dede) [رک بآن] [جن کا مدفن صحیح طور پر معلوم نہیں] کی قبروں میں سے ایک قبر قرویہ میں ہے اور شہر کے گرد و نواح میں بِکْتاشی ولیوں کی بہت سی قبریں موجود ہیں۔ حاجّی حمزہ بابا کے مزار اور بابا علی کے مزار کو (جس کے ساتھ ایک 'تِکّہ' یا خانقاہ بھی ہے) خاص عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ قلعے کو ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء میں رشید پاشا کے حکم سے منہدم کر دیا گیا۔ حکومت اَلبانیا قائم ہوئی تو یہ قصبہ ایک ذیلی ولایت (sub-prefecture) کا مرکز قرار پایا۔ ۱۹۳۸ء میں اس کے باشندوں کی تعداد ساڑھے چار ہزار تھی، جن میں سے بیشتر مسلم تھے [سامی بک (۱: ۲۵۸، طبع ۱۳۰۶ھ) نے آبادی ۷,۵۰۰ دی ہے].

مآخذ: (۱) اِپِّن (Ippen): *Skutari* [سراجیوو ۱۹۰۷ء]، ۷۱ ببعد؛ (۲) *Wissenschaftliche Mitteilungen aus Bosnien*، ۷: ۶۰؛ (۳) A. Degrand: *Souvenirs de la Haute-Albanie*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۲۱۵ ببعد؛ (۴) ہَیْزلَک (F. W. Hasluck): [*Geographical Distribution of the Bektashi*]، در *Annual of the British School at Athens*، ۱۹۱۵ء، ص ۱۲۱ ببعد؛ (۵) بابِنگر (F. Babinger)، در *MSOS*، ۱۹۳۰ء، ص ۱۴۹؛ (۶) وہی مصنّف: *Mehmed der Eroberer*،

اشاریہ، بذیلِ مادّہ Kruje۔ شہر کی تسخیر کی تاریخ کے لیے خاص طور سے دیکھیے معاصر وقائع نگار Benedetto Dei (در *Della Decima e delle altre gravezze, della moneta, e delle mercatura de Fior-entinifine al secolo xvi*، جلد ۲، لِزبَن۔ لُکّا (Lucca)، ۱۷۶۵ء: ص ۲۷۰ ببعد).

(سُوسْ ہائیم K. Süssheim و بابنگر F. Babinger)

---

* **آق حِصاری:** کئی مصنّفوں کا اسم نسبتی، جن کا اصلی وطن آق حِصار نام کے مقامات میں سے کوئی ایک تھا۔ چنانچہ اَیدِین کے آق حِصار سے ذیل کے لوگ ہیں:۔

(الف) اِلیاس بن عیسٰی، جسے عام طور پر ابن عیسٰی بن مُجَدالدّین کہا جاتا ہے، ترکی زبان میں پیش گوئیوں کی ایک کتاب کشفِ رُموزِ کُنوز کا مصنّف ہے۔ یہ کتاب ۹۶۵ھ/ ۱۵۵۷۔۱۵۵۸ء میں مرتّب ہوئی تھی، جب کہ عثمانی اپنے اوجِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ اس میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ ان کی حکومت تا قیامت باقی رہے گی اور اَعلام کے حروف کی ابجدی قیمتوں سے حساب لگا کر ساری قوم کی آئندہ قسمت کا حال ۲۰۳۵ھ تک بیان کیا گیا تھا (قب پرتش (Pertsch): *Cat. Berlin*، عدد ۴۵، ۹؛ کرافٹ (Krafft): *Cat. Vienna Acad.*، عدد ۳۰۱؛ فلُوگل (Flügel): *Cat. Vienna*، عدد ۱۵۰۲)۔ اس مصنّف کی چند اور منثور و منظوم کتابوں کا ذکر حاجی خلیفہ (طبع فلُوگل Flügel)، ۳:۴۸۰؛ ۴:۱۵۵، ۴۱۲، ۴۴۰ اور محمّد طاہر (دیکھیے مآخذ) نے کیا ہے۔ اس کی وفات ۹۶۷ھ/ ۱۵۵۹۔۱۵۶۰ء میں ہوئی۔

مآخذ: بُرسہ لی محمّد طاہر: عثمان لی مؤلّفلری، ۱:۱۸.

(ب) محمّد بن بدرالدّین مُحیُ الدّین المُنشِئ، جنھیں الصّارُوخانی، الرّومی یا المُفَسِّر بھی کہتے ہیں۔ انھیں کی تحریک پر سُوْدِی نے حافظ کی شرح لکھی۔ ان کی بڑی تصنیف ایک عام پسند تفسیرِ قرآن بعنوانِ نزیلِ التنزیل (یا تنزیل النَزیل) ہے، جس کی ابتدا [رمضان] ۹۸۱ھ/ [جنوری] ۱۵۷۴ء میں آق حِصار میں ہوئی اور ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۰ء میں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مصنّف نے یہ کتاب سلطان مراد ثالث کے نام پر مُعَنْوَن کی۔ ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۴ء میں وہ مدینۂ [منوّرہ] کے شیخ الحَرَم، مقرّر ہوے، بعد میں کچھ عرصہ دمشق میں قیام رہا، جہاں ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹۔۱۵۹۰ء میں انھوں نے البُوصِیری کے قصیدۂ بُردہ کی شرح عربی زبان میں لکھی (Ahlwardt: *Cat. Berlin*، عدد ۷۷۹۸)۔ انھوں نے مکّۂ مکرّمہ میں ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء کے آخر میں (قدیم ترین مآخذ کی رُو سے یہ سال درج کیا گیا ہے) انتقال کیا۔

مآخذ: (۱) براکلمان، ۲:۴۳۹؛ تکملہ، ۲:۶۵۱؛ (۲) عطائی: حدائق الحقائق، ص ۳۲۱؛ (۳) نَعیما: تأریخ، ص ۴۰؛ (۴) حاجّی خلیفہ (طبع فلُوگل Flügel)، ۲:۳۸۰؛ ۴:۵۲۸؛ ۶:۳۳۹؛ (۵) مُحِبّی: خلاصۃ الاَثَر، ۳:۴۰۰؛ (۵) محمّد طاہر، ۲:۲۰.

(ج) نَصُوح المعروف بہ نَوالی، ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں مراد ثالث کے بیٹے کا، جو بعد میں محمّد ثالث کہلایا، اتالیق مقرّر ہوا، اُس زمانے میں یہ نوجوان شہزادہ امیرِ مَغْنِیسہ (Maghnisa) تھا۔ نَصُوح نے شہزادے کے لیے ایک کتاب فَرَح نامہ کے نام سے لکھی، جس میں حاکم کے فرائض بیان کیے گئے تھے (*Cat. Br. Mus.* : Rieu، ص ۱۱۷).

یہ کتاب کتاب الریاسۃ و السیاسۃ کا ترکی ترجمہ ہے، جو ارسطو کی طرف منسوب ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے سکندر اعظم کے لیے لکھی تھی (حاجی خلیفہ، طبع فلُوگل، ۴:۴۱۱؛ ۵:۸۹)۔ اس نے اخلاق مُحسِنِی کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے علاوہ نَوالی کی طرف الغَزّالی کی کتاب کیمیاے سعادت کا ایک ترکی ترجمہ بھی منسوب کیا جاتا ہے لیکن غالبًا یہاں محمّد بن مصطفٰی الوَانِی (م ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء) کی کتاب سے التباس واقع ہوا ہے۔ نَصُوح کی وفات ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴۔۱۵۹۵ء میں ہوئی۔

مآخذ: (۱) عطائی، ص ۳۹۰؛ (۲) محمّد طاہر، ۲:۴۳.

بوسنہ (Bosnia) کے آق حِصار کی طرف حسبِ ذیل مصنّف منسوب ہیں:۔

(د) حَسَن المعروف بہ کافی [= کافی حسن اِفِندی]، ۹۵۱ھ/ ۱۵۴۴ء میں پیدا اور ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں فوت ہوا۔ اپنے ہی شہر میں بیس برس سے زیادہ قاضی رہا۔ وہیں اس کی قبر ہے [یُزارُ ویُتَبَرَّکُ بہ]۔ ہنگری [مَجَارِستان] میں اِگْرِی (Egri؛ اِرلاؤ Erlau) کے مقام پر جو جنگ ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء میں ہوئی تھی اس میں وہ شریک تھا۔ اس مہمّ کے دوران میں اس نے اچھی حکومت اور عثمانی نظم و نسق سلطنت میں اصلاحات کی ضرورت پر عربی میں وہ رسالہ لکھا جس کا نام اصول الحِکَم فی نِظام العَالَم تھا۔ اس سے اگلے سال یعنی ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۷ء میں بعض حکّامِ اعلٰی کی فرمائش پر اس نے خود اس کتاب کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا۔ مزید براں اس نے ایک مقبولِ عام، مختصر مگر جامع کتاب دینیات میں لکھی، جس میں اس نے صوفیوں اور [بدعتیوں] کی مخالفت کی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے روضات الجنّات فی اصول الاعتقادات (تکمیل در ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء)۔ اس کتاب کی شرح بھی اس نے خود ہی اَزْھار الروضات کے نام سے لکھی (تکمیل در ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء)۔ ان کے علاوہ اس نے الطحاوی کی کتاب عقیدۃ [اھل السنۃ] کی شرح موسومہ نور الیقین فی اصول الدّین اور القدوری کی المختصر کی بھی شرح لکھی۔

مآخذ: (۱) براکلمان، ۲:۴۴۳؛ تکملہ، ۲:۶۵۹؛ (۲) بابنگر (Babinger)، ص ۱۴۴؛ (۳) عطائی، ص ۳۰۴؛ (۴) حاجی خلیفہ (طبع فلُوگل Flügel)، بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۵) اِوْلیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۵:۴۴۵ ببعد؛ (۶) محمّد طاہر، ۱:۲۷۷۔ طریقِ حکومت کے متعلّق آق حِصاری کے رسالے کی مطبوعہ طباعتوں اور مجاری، فرانسیسی اور

جرمن زبانوں میں اُس کے ترجموں کے متعلّق دیکھیے بابِنگر (Babinger)، محلِّ مذکور.

(ہ) حاجّی نسیم اوغلو احمد بن حسن، جس نے ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲-۱۷۷۳ء میں، جب وہ جرمنی میں قید تھا، ۱۱۴۸-۱۱۵۶ھ/ ۱۷۳۵-۱۷۴۴ء کی ترکی مہم بوسنہ اور بعد کے واقعات کا ذکر کیا ہے (قب Babinger، ص ۲۷۶، ح ۱).

(جُوس ہائیم K. Süssheim وشاخت J. Schacht)

---

* **آق دکز** [دنز]: رک بہ بحر الروم.

---

* **آق سَرای**: (آق سَرا) "سفید محل"، اندرونی آناطولی میں ایک شہر کا نام، زمانۂ قدیم میں اس کا نام Archelais تھا (دیکھیے Pauly- Wissowa، بذیلِ مادّہ)۔ آق سرائے سلجوقی عہد میں ایک اہم مقام سمجھا جاتا تھا اور یہاں کا قلعہ، جواب کھنڈر ہو چکا ہے، [عزّالدّین] قِلِیج آرسلان ثانی کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ قرہ مان اوغلو اور عثمانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سلطان محمّد ثانی نے استانبول فتح کرنے کے بعد آق سرای کے زیادہ تر باشندوں کو وہاں منتقل کر دیا اور ان لوگوں کی وجہ سے استانبول کے ایک محلّے کا نام آق سرای ہو گیا۔ یہ شہر ایک زراعتی مرکز ہے اور قالین بافی یہاں کی مشہور صنعت ہے۔ اس کا ذکر ابن بَطُّوطہ نے بھی کیا ہے (۲:۲۸۶)۔ یہ ایک 'قضا' کا صدر مقام ہے، جو ولایتِ نِگیدہ میں شامل ہے اور ۱۹۳۵ء میں اس کی آبادی ۸,۳۰۰ تھی (کل قضا کی آبادی ۱۹,۰۰۰)۔ اس میں قابلِ ذکر عمارتیں یہ ہیں: اُلو جامع (پندرھویں صدی عیسوی کے شروع کی، جس میں سلجوقی عہد کا ایک منبر بھی ہے)؛ زِنجِرلی مدرسہ (پندرھویں صدی کے نصف اوّل کا)؛ قادِر اوغلو کا مدرسہ، جو سلجوقیوں کے عہد میں تعمیر ہوا اور جس کی تجدید قَرَہ مَان اوغلو ابراہیم بیگ نے کرائی؛ جامعِ نقّاشی (موجودہ زمانے کی تعمیر ہے لیکن اس کا ایک مَنار چودھویں صدی کا ہے) اور اس کے علاوہ مختلف حمّام بھی ہیں۔ شہر کے اوّل تپّہ پر ایک تُرْبَہ (مقبرہ) بھی ہے، جو تیرھویں صدی کی یادگار ہے اور پتھر کے کوئلے کی راکھ سے داب دے کر بنائی ہوئی اینٹیں (briquets) اُس میں لگی ہیں.

مآخذ: (۱) Fr. Sarre: *Reise in Kleinasien*، ص ۹۳ ببعد؛ (۲) Ch.Texier: *Asie Mineure*، ص ۵۰۹، ۵۶۶؛ (۳) Ainsworth: *Travels and researches in Asia Minor*، ۱:۱۹۲؛ (۴) E. Réclus: *Nouv. géogr. univ.*، ۹: ۵۷۱؛ (۵) Hamilton: *Researches*، ۲:۲۲؛ (۶) گُلشنِ مَعارِف، ۱:۵۲۱، ۵۲۴؛ (۷) علی جواد: ممالک عثمانیہ نِکْ تاریخ وجغرافیا، لُغَتِی، ص ۲۱؛ (۸) W. Ramsay: *Asia Minor*، ص ۲۸۴؛ (۹) اِوْلِیاء چلبی، ۲:۱۹۱.

(F. Taeschner)

آق سرای: گُرگانج (Urgenč) کے قریب ایک محلّ کا نام ہے، جس کا ذکر "شَیبا نِیاذ" "Shaybāniade" (طبع وامبیری Vámbéry، ص ۳۹۲) تک میں بھی آتا ہے [بظاہر محمد صالح میرزا کے شیبانی نامہ کا ترجمہ بزبانِ جرمن از وامبیری مراد ہے، قب آ آ، طبع اوّل، ۴:۲۷۵]۔ تیمور کے لیے جو محلّ شہرِ سبز میں اسی نام کا تیار ہوا تھا اس کے لیے دیکھیے مادّۂ کَش.

(ادارۂ آ آ، طبع دوم)

آق سُنقُر: [آق سُنگُر] "سفید باز"، متعدّد ترکی حکّام کا نام، جن میں سے حسبِ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

(۱) [ابو سعید] آق سُنگُر بن عبد اللہ قَسِیم الدّولہ المعروف بالحاجب، [خاندان اتابکی، اصحاب موصل، کا جدّ] مَلِک شاہ بن آلپ آرسلان [رک بآں] کا مملوک؛ مَلِک شاہ نے اسے ۴۸۰ھ/ ۱۰۸۷ء میں حَلَب کا گورنر مقرّر کیا۔ پہلے تو وہ سلجوقی شہزادے [تاج الدولہ] تُتُش [بن آلپ آرسلان] [رک بہ تُتُش] کی ان کوششوں کی تائید کرتا رہا جن کے ذریعے وہ ملکِ شام میں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا لیکن ملک شاہ کی وفات کے بعد وہ شمالی شام اور جزیرے کے گورنروں کے ساتھ مل کر برکیاروق کا حامی بن گیا۔ اسے شکست ہوئی اور [وہ اسیر ہوا اور] تُتُش نے اسے جُمادَی الاُولی ۴۸۷ھ/ مئی ۱۰۹۴ء میں حَلَب کے قریب قتل کرا دیا۔ [اُسے حلب کے اندر مدرسۂ زُجاجِیّہ میں دفن کیا گیا]۔ وہ [عماد الدّین] زنگی [رک بآں] کا باپ تھا، جو بعد میں موصل کا اتابک مقرّر ہوا اور اپنے عدل وانصاف اور حسنِ ادارۂ ملک ودولت کے لیے مشہور تھا.

مآخذ: (۱) ابن القَلانِسی (اَمِدروز Amedroz)، ص ۱۱۹-۱۲۶، ترجمہ لے تُورنو (Le Tourneau): *Damas de 1075 à 1154*، دمشق ۱۹۵۲ء، ص ۱۵-۲۷؛ (۲) ابن الاثیر، ۱۰:۹۸، ۱۴۹-۱۵۱، ۱۵۷-۱۵۸؛ (۳) ابن خَلِّکان، عدد ۹۹ [طبع مصر ۱۳۱۰ھ، ۱:۷۹]؛ (۴) ابن العَدِیم: تاریخ حَلَب، جلد ۲، دمشق ۱۹۵۴ء، اشاریہ.

(گب H. A. R. Gibb)

⊗ (۲) آق سُنقُر الاحمدِیلی (از؟ تا ۱۱۳۳ء)، احمدِیلی کا بیٹا قب آ آ طبع دوم، ص ۳۰۰، عمودا، س ۸ از آخر]، جو مَراغہ کے قرب و جوار کے رَوّادِی کُرد امرا کی نسل سے تھا۔ ان امرا کا جدِّ اعلیٰ وَہسُوذان بن محمد تھا، جو طغرل بک سلجوقی کی ملازمت میں منسلک تھا۔ امیر احمدِیل سلطان محمد بن سلطان مَلِک شاہ کا ملازم تھا اور ان لڑائیوں میں جو اس سلطان نے حِلّہ کے عرب امیر صَدَقَہ بن دُبَیس [مَزْیَدی] کے خلاف لڑیں اس نے بڑی خدمات انجام دیں۔ ۱۱۱۱ء میں جب اتابک طُغتِگِین والیِ شام کی بیت المقدس کے صلیبی محاربین سے جنگ ہو رہی تھی سلطان محمد نے طُغتِگِین کی مدد کے لیے احمدِیل کو روانہ کیا۔ اس موقع پر اس نے شجاعت و مردانگی کا جو مظاہرہ کیا اس کے صِلے میں نہ صرف اس کے املاک میں، جو مَراغہ کے

حدود میں تھیں، اضافہ ہوا بلکہ تبریز پر بھی اس نے کچھ حقوق حاصل کر لیے اور اپنا حلقۂ نفوذ وسیع کر لیا۔ ۱۱۱۶ء میں جب احمدِیل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو اس کا بیٹا آق سُنقُر اس کی جگہ مَراغہ کا والی ہوا اور سلطان محمود کی، جو عراق میں اپنے باپ سلطان محمد کا جانشین ہوا، خدمت گزاری میں مصروف ہو گیا۔ ۱۱۲۲ء میں طُغرُل نے، جو سلطان محمود کا بھائی تھا، اَرّان میں عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور آذربیجان میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں طُغرُل کا اتابک موسوم بہ گُون تُوغدِی (Gündoghdu) چل بسا اور آق سُنقُر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر طغرل کے پاس گیا اور اس کا اتابک بننے کا وعدہ کر لیا؛ چنانچہ جب سلطان محمود نے اسے فوج دے کر طغرل کے مقابلے میں بھیجا تو آذربیجان پہنچتے ہی وہ طغرل سے جا ملا اور وعدہ کیا کہ اگر طغرل مَراغہ چلے تو وہ دس ہزار کُرد سپاہی اس کے زیرِ فرمان کر دے گا۔ انھوں نے اَرْدَبیل کا محاصرہ کیا لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہاں سے تبریز کی طرف روانہ ہوے۔ راستے میں معلوم ہوا کہ سلطان محمود اپنی پوری فوج لے کر مَراغہ پہنچ گیا ہے اور تَبریز پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہا ہے۔ یہ سن کر وہ خُوناج (خُونا) آ گئے، جو زنجان کے شمال میں ہے اور اتابک اُوشتِکین شِیرگِیر کی وساطت سے، جو اَبہَر میں تھا، سلطان محمود سے اس کی اطاعت قبول کرنے کے بارے میں گفت وشنید کی۔ آق سُنقُر غدّاری کا مرتکب ہونے کے باوجود، سلطان محمود کا بڑا صاحبِ اعتبار ونفوذ امیر بن گیا اور سلطان محمود نے اُسے اپنے بیٹے داؤد کا اتابک بنا دیا [حدود ۵۲۴ھ]۔ اس واقعے سے کہ سلجوق کسی غیر ترک کو بھی اتابک بنا سکتے تھے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترکوں کے اندر ترکی رسم ورواج کسی حد تک کمزور پڑ گئے تھے اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکمران خاندان کے افراد اپنی برادر کُش جنگوں میں کُردوں کی مدد کے محتاج ہو گئے تھے۔ ۱۱۳۱ء میں سلطان محمود کا ہَمَدان میں انتقال ہو گیا اور آق سُنقُر نے اس کے بیٹے داؤد کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا اور عراقِ عجم، آذربَیجان اور اَرّان کے تمام دولتی اداروں کا پورا پورا اختیار آق سُنقُر کے (جو اتابک تھا) اور دیگر کُردی امرا کے ہاتھ آ گیا۔ داؤد اور آق سُنقُر ابھی ہَمَدان ہی میں تھے کہ طُغرُل مسعود اور سلجوق۔سلطان محمود متوفّی کے بھائیوں۔کے درمیان عراق کے تخت کے لیے جھگڑے شروع ہو گئے۔ ہمدان سے آق سُنقُر اور داؤد تبریز کی طرف روانہ ہوے۔ راستے میں سنا کہ تبریز پر مسعود کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ آق سُنقُر نے آ کر تبریز کا محاصرہ کر لیا۔ انجام کار اَواخرِ ۱۱۳۱ء میں صلح ہوئی اور یہ طے ہوا کہ مسعود اپنی فوج لے کر ہَمَدان چلا جائے۔ آق سُنقُر اور داؤد نے اپنا دارالسلطنت تَبریز مقرّر کر کے آذربیجان اور اَرّان کے اطراف کی حکومت سنبھال لی۔ سلطان محمود کے بڑے امرا بھی تبریز میں آ کر داؤد اور آق سُنقُر کے پاس جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں سَنجَر، جو سلجوقوں میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا تھا اور چونکہ خلیفہ کے نام سے ماوراء النہر پر حکومت کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ بااثر بھی تھا، طُغرُل کا طرفدار ہو گیا اور اس طرح داؤد اور آق سُنقُر پر ایک مصیبت آ پڑی۔ جولائی ۱۱۳۲ء میں آق سُنقُر ایک عظیم فوج لے کر طغرل کے مقابلے کے لیے، جو ہَمَدان میں تھا، نکلا۔ طغرل کی فوج بھی زبردست تھی اور اس کا قائد ایک قابلِ قدر امیر قرا سُنقُر [رَک بآن] تھا۔ کچھ امیر، جو آق سُنقُر اور داؤد کے ساتھ نکلے تھے، انھوں نے طُغرُل کے ساتھ خفیہ سمجھوتا کر لیا اور اس سے مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آق سُنقُر اور داؤد کو ایک ہولناک شکست نصیب ہوئی۔ اس زمانے کے ایک شاعر عِماد غزنوی نے اس جنگ کی تصویر کشی کی ہے اور اسے گویا آق سُنقُر اور قرا سُنقُر کی باہمی جنگ کہا ہے (عوفی: لُباب الالباب، ۲:۲۶۶)۔ آق سُنقُر اور داؤد، جن کے متعدّد امرا گرفتار ہو گئے تھے، بھاگ کر سلطان مسعود کے پاس، جو اس وقت عراق عرب میں تھا، چلے گئے اور بغداد میں وہ ایک دوسرے سے ملے۔ خلیفہ مُستَرشِد باللہ طُغرُل کا دشمن تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ مسعود کو سلطان اور داؤد کو اس کا ولی عہد سمجھا جائے اور حکم دیا کہ اسی کے مطابق خطبوں میں ان کا نام لیا جائے۔ اس کے بعد مسعود، داؤد اور آق سُنقُر آذربَیجان کو روانہ ہوے۔ سلطنت کا سارے کا سارا انتظام آق سُنقُر کے ہاتھ میں تھا۔ مَراغہ پہنچتے ہی آق سُنقُر نے آس پاس کے علاقوں سے ایک بھاری لشکر جمع کیا۔ یہ دیکھ کر قرا سُنقُر اور طُغرُل کے مُتلوّن مزاج امرا، جن میں سے ایک گُرجی اصل کا امیر بِیشکِین (Bishkin) بھی تھا، تبریز سے کھسک گئے اور اَرْدَبیل میں جا کر پناہ لی۔ اس مقام کے قریب ایک لڑائی ہوئی، جس میں قرا سُنقُر کو شکست ہوئی۔ یہاں سے اَق سُنقُر نے ہَمَدان پر چڑھائی کی اور طُغرُل پر غالب آ گیا۔ اب عراق اور آذربَیجان کی سلطنت مسعود کے ہاتھ میں تھی۔ طُغرُل رَے میں جا بیٹھا۔ مسعود اور آق سُنقُر ہَمَدان ہی میں تھے کہ آق سُنقُر کو ایک باطنی فدائی نے ۵۲۷ھ/ ۱۱۳۳ء میں قتل کر دیا۔ ابن الاَثیر کے قول کے مطابق ایسی روایتیں مشہور تھیں کہ اس فدائی نے آق سُنقُر کو مسعود کی رضامندی سے ٹھکانے لگایا۔ سلجوقیوں کا مؤرّخ عِماد الکاتب آق سُنقُر کا وزیر تھا اور اپنی تصانیف میں اُس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ آق سُنقُر کے بعد سلطان مسعود کی خدمت آق سُنقُر کے لڑکے نصرۃ الدّین آرسلان آبہ خاص بک نے سنبھالی۔

مآخذ: (۱) فتح بن علی البُنداری: زُبدۃ النُّصرۃ (عماد الکاتب کی تاریخ کا اختصار، طبع ہُوتسما (Houtsma): *Recueil de textes relatifs á l'his-toire des Seljoucides*، ۲:۱۶۰ ببعد)؛ (۲) ابن الاَثیر (طبع تُورن برگ Tornberg)، ۱۰:۴۲۱، ۴۶۱ ببعد [طبع قاہرہ ۱۳۵۳ھ، ۸:۳۰۶، ۳۲۸]؛ (۳) کِسرَوی تَبریزی شہریارانِ گمنام (تہران ۱۹۲۹ء)، ۲:۱۱۵-۱۹۱.

[نیز دیکھیے مادّۂ احمدِیلی (Ahmadilis) در آآ، طبع دوم].

[از آآ ترکی] [احمد زکی ولیدی طوغان]

آق سُنقُر البُرسُقی: (ابوسعید سیف الدین، قَسیم الدولہ) ابتدا میں * بُرسُق [رَک بآن] کے مملوکوں اور سلطان محمد اور محمود سلجوقی کے اعیان واکابر

دولت میں سے تھا۔ اُس نے اُن کاموں کی بدولت امتیاز حاصل کیا جو اُس نے پہلے تو عراق کے فوجی گورنر (شِحنہ) کی حیثیت سے اور پھر اپنی آخری عمر میں مَوصِل کے گورنر کی حیثیت سے انجام دیے۔ ان دونوں عُہدوں پر وہ ایک ہی وقت میں مامور رہا۔ ۹۴۸ھ/ ۱۱۰۵ء میں جب اسے شِحنۂ عراق مقرر کیا گیا تو اس کا بڑا کام یہ تھا کہ وہ دُبَیس [رک بآں] کے مَزید عربوں کی روک تھام کرے جو بغداد کے مضافات میں فتنہ وفساد برپا کر رہے تھے۔ موصل کی حکومت جب اسے پہلی دفعہ سپرد ہوئی (۵۰۷ھ/ ۱۱۱۳ء) تو اس کا وظیفۂ مُہِم یہ تھا کہ وہ سلطان کے نام پر شام کے فرنگیوں (Franks) کے مقابلے میں جہاد کا انتظام کرے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دیار بکر سے لے کر بحیرۂ روم تک کے علاقوں میں دوبارہ سلجوقی تسلّط قائم کرنے کی کوشش کرے۔ متعدّد ناکامیوں کے بعد، جن کا اصل سبب وہ شکوک وشبہات تھے جو ایسی دلیرانہ آرزوؤں اور جاہ طلبانہ ہَوَسوں سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ہی کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے اسے متواتر تین سال (۵۰۹ - ۵۱۲ھ/ ۱۱۱۶ - ۱۱۱۸ء) دریاے فرات پر اپنی الرَّحبہ کی جاگیر میں کسی قدر ذلّت کی حالت میں گزارنا پڑے، وہ آخر کار کامیاب ہوگیا؛ چنانچہ اس نے حَلَب کو اہلِ صلیب ('صَلِیبِیُّون') کے حملے سے، جن کی مدد دُبَیس کر رہا تھا، بچانے کے بعد اس شہر کے سربرآوردہ لوگوں کی رضامندی سے سارے صوبے کی حکومت سنبھال لی (۵۱۸ھ/ ۱۱۲۵ء)۔ اس طرح وہ الجزیرہ کے ایک حصّے کو شمالی شام کے ساتھ متّحد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہی اتّحاد اس سے پہلے حُمدانی اقتدار کی بنیاد بنا تھا اور آگے چل کر زنگی [رک بآں] کو بھی اسی سے تقویت پہنچی۔ اَلمُوت کے باطنیوں کے ہاتھوں آق سُنقُر کی زندگی کا قبل از وقت خاتمہ ہوگیا [۹ ذی القعدہ، ۵۲۰ھ/ ۲۶ نومبر ۱۱۲۶ء]، کیونکہ اس نے عراق کے اندر ۵۱۹ھ/ ۱۱۲۶ء میں ان کے حلیفوں میں سے ایک کی مخالفت کی تھی [مگر بقول ابن الجوزی اس لیے کہ وہ باطنیہ کی بیخ کنی کے درپے تھا اور ان کا پیچھا کرتا رہتا تھا، ان کی ایک بڑی جماعت کو اس نے قتل کیا تھا — ابن خلّکان]۔ اس طرح اس کی قابلیت کے جوہر پوری طرح کھلنے نہ پائے۔ جو کام اس نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل زنگی کے نصیب میں تھی، جس نے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اسے سرانجام دیا؛ مگر البُرسُقی پہلے ہی اُن دو چیزوں کو جمع کر چکا تھا جنھیں بعد میں زنگی نے بھی جمع کیا۔ یعنی سلجوقی سیادت کا اعتراف، جو اس کے ایک شہزادے کے اتابک ہونے کے اعزازی منصب سے ظاہر ہے اور موصل میں عملاً ایک خودمختار حکومت کا قیام — اس کے ساتھ ہی اس نے الجزیرہ کی افواج کی مدد سے شمالی شام کو اتنا طاقتور کر دیا کہ وہ فرنگیوں کے نرغے سے بچ کے نکل آیا اور یہی سبب تھا کہ شام نے، باوجود اپنی عَصَبِیّت کے، اس کی حکومت بآسانی تسلیم کر لی۔

مآخذ: (۱) C. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء؛ (۲) R. Grousset: *Histoire des Croisades*، جلد ۱، پیرس ۱۹۳۴ء؛ (۳) S. Runciman: *A History of the Crusades*، جلد ۲، کیمبرج ۱۹۵۲ء؛ (۴) ابن القلانسی (طبع Amedroz؛ ترجمہ Le Tourneau، اشاریہ: بذیل مادّۂ البُرسُقی)؛ (۵) ابن الاثیر، ۱۰: ۲۷۲، ۲۹۰، ۳۵۰ - ۳۵۳، ۳۷۴، ۳۷۸، ۳۸۰ - ۴۱۵، ۴۳۹ ببعد، ۴۴۶ ببعد [طبع قاہرہ ۱۳۵۳ھ، ۸: ۲۲۹، ۲۳۸، ۲۶۸ ببعد، ۲۸۰، ۲۸۲ ببعد، ۳۰۲، ۳۱۶ ببعد، ۳۲۰]؛ (۶) ابن خلّکان، شمارہ ۱۰۰ [طبع مصر ۱۳۱۰ھ، ۱: ۷۹]؛ (۷) ابن العدیم، جلد ۲، دمشق ۱۹۵۴ء، اشاریہ؛ (۸) ابن ابی طیّ؛ اور (۹) غیر مسلم مصنّفین میں Matthew of Edessa [متّی رُہاوی]؛ (۱۰) دوسرے مآخذ جن کا ذکر کاہن (Cahen) نے کیا ہے، کتابِ مذکور، دیباچہ۔

[CL. CAHEN کاہن]

آق شمس الدّین: صحیح نام محمد شمس المِلّۃ والدِّین [از اولاد شیخ شِہاب الدّین سہروردی - الشقائق] صوفی، شیخ بَیرامیّہ [رک بآں]، جنھوں نے قُسطُنطِینیّہ کے قریب [حضرت] ابوایّوب انصاریؓ کی قبر کا پتا چلایا۔ وہ حمزہ نامی ایک بزرگ کے بیٹے تھے، جنھوں نے ملکِ شام میں اپنی کرامات کی وجہ سے شہرت پائی اور اس کے بعد ضلع قَوَق (ḳawaḳ)، (نزدِ آماسِیہ) میں فوت ہوے۔ آق شمس الدّین ۷۹۲ھ/ ۱۳۸۹ - [۱۳۹۰ء] میں شام میں (بمقامِ دمشق) پیدا ہوے اور اپنے والدین کے ساتھ ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۶ - ۱۳۹۷ء میں قَوَق [کذا] میں آ گئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد (جب ان کی عمر صرف سات برس کی تھی) انھوں نے علومِ دینیہ کا مطالعہ شروع کیا۔ مشہور ہے کہ بدرُ الدّین بن قاضی سِماوَنہ ان کے استادوں میں سے تھے۔ (قصبۂ) عثمانجِق میں وہ مدرّسِ قرآن مقرّر ہوے۔ [علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد وہ طریقتِ صوفیہ کی طرف مائل ہوے اور] ایک مرشد کی جستجو ہوئی۔ اس غرض سے انھوں نے دور دراز کے سفر کیے اور ایران اور ماوراء النہر تک پہنچے۔ ایک ہدایت کے بموجب، جو اُن کو خواب میں ہوئی، انھوں نے زین الدّین الخَوافی کے حلقۂ مریدین میں شامل ہونے کی کوشش چھوڑ دی اور آخر ۸۳۰ھ/ ۱۴۲۶ - ۱۴۲۷ء میں کچھ تأمل کے بعد حاجّی بَیرام [رک بآں] کے ہاتھ پر بیعت کر لی، جنھوں نے تھوڑے ہی دن بعد انھیں کو اپنی خلافت عطا فرما دی۔ اس سلسلے کے شیخ اور شفا بخشِ طبعی (natural-healer) کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا مرکز بیگ بازار (اَنقَرہ کے مغرب میں) رہا، جہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی اور ایک چکّی بھی لگائی۔ [انھوں نے طبّ کا مطالعہ کیا تھا اور وہ حقیقۃً طبیب ظاہری تھے۔ دیکھیے الشقائق] نیز ضلع اِسکِلِیب (نزدِ عُثمان جِق)، اور گورینک Göynük (نزدِ بُرُوسَہ) رہے [سامی بک: کوینک، مگر الشقائق مطبوعہ خطّی میں مصحّفًا ''کونیک'' لکھا ہے]۔ بیت اللہ کے جو سات حج انھوں نے کیے ان کی تاریخیں معلوم نہیں ہوسکیں۔ ۸۵۱ھ/ ۱۴۴۷ - ۱۴۴۸ء اور ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ - ۱۴۵۲ء کے درمیان انھیں سلطان مراد ثانی کے قاضی عسکر سُلیمان چلپی کے

علاج کے لیے اِدِرْنہ طلب کیا گیا۔ لشکر کے ایک واعظ کی حیثیت سے انھوں نے فتحِ قُسْطُنْطِیْنِیّہ میں حصّہ لیا۔ بعد کے زمانے کی ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے [حضرت] ابوایّوب الانصاری[رض] [رکؔ بآن] کا مقبرہ دریافت کیا اور 'فِراسۃ' کی کئی کرامات ان سے ظہور میں آئیں۔ انھوں نے سلطان محمد ثانی کی ایک بیٹی کا کامیاب علاج کیا اور علی العموم انھیں سلطان کی نظرِ عنایت و توجّہ حاصل ہوگئی۔ فتح قُسْطُنْطِیْنِیّہ کے بعد وہ پھر گوریٹک واپس آگئے اور وہیں ماہ ربیع الثانی ۸۶۳ھ/ فروری ۱۴۵۹ء کے آخر میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیّک کہا۔

یہ روایت کہ انھوں نے ایک خواب کی تعبیر بیان کی تھی جو سلطان نے اوزون حسن کے خلاف تِرْجان کی جنگ (یکم اگست ۱۴۷۳ء) سے پہلے دیکھا تھا انھیں سے متعلّق نہیں ہوسکتی اور بظاہر فِریدُون کی ایجاد ہے۔ اُن کے سات بقول دیگر بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیّت حَمْدِی [رکؔ بآن] شاعر کو حاصل ہے [ان کا اور ان کے تین بھائیوں کے تراجم الشقائق میں دیے ہیں]۔ انھوں نے طبّ اور تصوّف پر کئی کتابیں لکھیں، جو اب تک شائع نہیں ہوسکیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ بَیْرامِیَّہ کی تاریخ میں ان کا کردار تباہ کن ثابت ہوا، کیونکہ ان کا اپنے بعض برادرانِ طریقت کے ساتھ کچھ ایسا جھگڑا پیدا ہوگیا جس کی وجہ سے فرقۂ ملامتیّہ بڑی تعداد میں جماعت سے علٰیحدہ ہوگیا اور یہ چیز پورے سلسلے کی نشوونما میں سدِّ راہ ہوے بغیر نہ رہ سکی۔

مآخذ: (۱) طاش کو/پروْزادِہ: الشقائق النعمانیّۃ [طبع برہامش وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۲۵۳، مکتبۂ شفیعیّہ کا نسخۂ خطّی، مکتوب در ۱۰۱۳ھ، ورق ۷۴ ب]، ترجمہ O. Rescher، ص ۱۴۵ ببعد؛ (۲) امیر حُسین: مناقبِ آق شمس الدّین، استانبول ۱۳۰۱ھ (اُنْوِر نے بھی ایک مخطوطے کی رُو سے اس کتاب کو استعمال کیا ہے)؛ (۳) گب (Gibb)، ۲: ۱۳۸ ببعد؛ (۴) بُرْسَلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلّفلِری، ۱: ۱۲ ببعد؛ (۵) A. S. Ünver: *Ilim ve sanat bakîmîndan fatih devri notlarî*، استانبول ۱۹۴۷ء، ۱۲۷ ب بعد ("*Halk menakibine göre Ak-şemseddin ve Istanbul hakkînda* ان کی کرامات، ملفوظات وغیرہ کے متعلق)؛ (۶) H. J. Kissling: *Aq Šemsed-Dīn. Ein türkischer Heilinger aus der Endzeit von Byzanz Byzantinische Zeitschrift*، ۱۹۵۱ء، ص ۳۲۲ ببعد (جس میں ان بیانات کو، جو پہلے مصنّفین کے بیانات سے مختلف ہیں، مفصّل طریق پر حق بجانب ثابت کیا گیا ہے).

(H. J. KISSLING)

---

* **آق شہر:** جدید ترکی رسمِ خط کے مطابق آقْشِہِر (Aksèhir) ''سفید شہر''.

(۱) اندرونی آناطولی کا ایک شہر، جو سلطان طاغ کے دامن میں واقع ہے۔ عہدِ قدیم میں اسے فِلومِیلِیَم (Philomelium) (دیکھیے Pauly -Wissowa، بذیلِ مادّہ) کہتے تھے۔ قدیم مآخذ میں اس شہر کا نام 'آقْشَر'، 'آخْشَر' یا آخ شہر آیا ہے۔ یہ سَلْجُوقیوں اور قرہ مان اوغلو کے دائرہ حکومت میں تھا۔ بعد میں بایزید اوّل نے اسے اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ سولھویں۔ سترھویں صدی کے سیّاحوں غَزِّی، مَکّی اور اِوْلِیاء چِلِبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ شہر کبھی ایک سَنْجَاق کا مرکز تھا، اب ولایتِ قُونیہ کی ایک قضا کا مرکز ہے۔ اسے اہمیّت اس لیے حاصل ہوئی کہ یہ استانبول سے بغداد جانے والی سڑک (اب ریلوے لائن) پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک زراعتی مرکز بھی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں یہاں کی آبادی ۱۰,۳۳۵ تھی (ان میں سے کچھ یونان اور یوگوسلاویا کے مہاجر تھے) اور قضا کی کل آبادی ساٹھ ہزار۔ یہاں کی [بغایت خوبصورت — سامی] مسجد بایزیدِ اوّل نے تعمیر کرائی تھی۔ طاش مِدْرِسہ میں سَلْجُوقی بادشاہ کیکاؤُس اوّل (۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء) کے عہد کا ایک کتبہ موجود ہے لیکن مسجد خود بعد کے زمانے کی ہے۔ دوسری قابلِ یادگار عمارتیں یہ ہیں: ایک 'تِکّہ'، جس میں صاحبِ عطا کا ایک کتبہ ہے، جو کیکاؤُس دوم (۶۵۹ھ/ ۱۲۶۰-[۱۲۶۱ء]) کے عہد کا ہے؛ مقبرۂ [حضرت] سیّد محمود خَیْرانی، جس کا مخروطی منار ہشت پہلو ہے (۶۲۱ھ/ ۱۲۲۴ء، پندرھویں صدی کے شروع میں منار کی تجدید ہوئی)، اُلُو جامع (پندرھویں صدی کے شروع کی)؛ اِپْلِکْچی جامع (۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء) اور ایک 'اِمارت'۔ نصر الدّین خوجہ [رکؔ بآن] کے جدید مقبرے پر ۳۸۶ھ/ [۹۹۶ء] کی تاریخ درج ہے۔

مآخذ: (۱) V. Cuinet: *La Turque d'Asie*، ۱: ۸۰۳، ۸۱۸؛ (۲) Cl. Huart: *Konia*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۱۰۹-۱۱۷؛ (۳) وہی مصنّف: *Epigraphie Arabe d'Asie Mineure*، در *Revue Sémitique*، ۱۸۹۴ء، ص ۲۸-۳۴؛ (۴) زارِہ (Fr. Sarre): *Reise in Kleinasien*، ص ۲۱ ببعد؛ (۵) Ch. Texier: *Asie Mineure*، ص ۴۳۵؛ (۶) Ainsworth: *Travels and Researches in Asia Minor*، ۲: ۶۳؛ (۷) Hamilton: *Researches*، ۲: ۱۸۵؛ (۸) علی جواد: ممالک عثمانیہ نڭ تأریخ و جغرافیا لغتی، ص ۲۱؛ (۹) اِوْلِیاء چِلِبی، ۲: ۱۵ ببعد.

(CL. HUART—F. TAESCHNER)

(۲) آق شہر: (نیز آقْشَر یا آشْقَر؛ پِزِگَنی Pizzigani، ۱۳۶۷ء، آزْکَر Azcar لکھتا ہے) شمال مشرقی آناطولی میں ایک شہر کا نام ہے، جو قویلو حِصار اور سُوشِہْری کے درمیان دریاے کِلِکْت اِیْرماق پر واقع ہے۔ پرانے مصنّفین نے اکثر اس کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے زمانے میں بھی اس کا ذکر آتا رہا ہے، یہاں تک کہ کاتب چِلِبی (جِہان نُما، ص ۶۲۷) جیسے متأخّر کے ہاں بھی اس شہر کا نام موجود ہے۔ غالباً یہ وہی مقام ہے جہاں آج کل گُوزِلْ لِر (Guzeller) یا اِزْبِیْدِر (Ezbider) واقع ہے۔ یہ نام شہر کی نسبت اُس کے میدان (آق شہر اوْوہ سی) کے لیے زیادہ عرصے تک مستعمل رہا ہے جس کا ذکر ایران اور گُرجستان

کے خلاف عثمانی افواج کی مہموں کی آمد و رفت کے راستوں کے سلسلے میں برابر آتا رہا ہے۔

مآخذ: (۱) F. Taeschner: *Das anatolische Wegenetz*، ۲:۲ (جہاں مزید حوالے بھی دیے ہیں)۔

(F. TAESCHNER)

---

* **آق صُو:** (آخ صُو)، شیماخی (Shemākhi؛ روسی: شیماخا Shemakhā) کے قریب سوویاتی آذربیجان میں ایک گاؤں ہے۔ اس میں ایک مسجد اور ایک بازار اور "شیماخی نو" New Shemākhi [رک بآن] کے کھنڈر ہیں۔

(B. SPULAR شپُولر)

---

* **آق صُو:** مشرقی ترکستان (سنکیانگ) کے ایک شہر کا نام، جو دریاے آق صُو کے شمال میں اُس سے کوئی چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر (دیکھیے متّصل بعد کا مادّہ) اِس دریا اور دریاے تُوشقان کے ساتھ مقامِ اتّصال کے تقریباً مقابل واقع ہے اور سمندر کی سطح سے کوئی ۱۰۰۶ میٹر بلند ہے، اس کا محلِّ وقوع ۴۱ درجہ، ۱۴ دقیقہ اور ۷ ثانیہ عرض بلد شمالی اور ۸۰ درجہ طول بلد شرقی پر مَرَالْ باشی اور کُچا کے شمالی کاروانی راستے پر ہے۔ موجودہ زمانے کے شہر سے دریا کے اوپر کی طرف کچھ فاصلے پر ایک اَور بستی ہے، وہ بھی آق صُو ہی کہلاتی ہے اور دونوں کے شمال مشرق میں "پرانا شہر" ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں بستیاں اُن قدیم بستیوں کی جگہ آباد ہوں جن کے اپنے اپنے چینی نام تھے (دیکھیے سطورِ ذیل)۔ آق صُو کا ذکر ترکی نام سے سب سے پہلے صرف آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی ہی میں آتا ہے، اس لیے اسے بطلیموس کا اَوزاکیہ (Auzakia) قرار دینا (جیسا کہ Deguignes کے وقت سے عموماً ہوتا آیا ہے) مشتبہ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اسی طرح مختلف مقامات کے چینی ناموں کے ساتھ اس نام کی ہَوِیّت کی تعیین بھی اب تک کوئی طے شدہ بات نہیں ہے۔ بارٹولڈ (W. Barthold) نے (زیادہ تر اس کے موجودہ چینی نام کی بنا پر، دیکھیے سطورِ ذیل) اسے عہدِ ہان (Han) کا "وَوْن سو Wön-Su" اور حُدُود العالم طبع مِنْوَرسکی، ص ۹۸) اور گرْدِیزی (دربارٹولڈ: *Otčët o Poyezdkye v srednyuyu Aziyu*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۷ء، ص ۹۱) کا بنجُول B. nčūl (بنجُوک؟؟ B. nčūk) تشخیص کیا تھا، لیکن بعد میں اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ P. Pelliot کا خیال یہ تھا کہ آق صُو اصل میں زمانۂ ہان (Han) کا کُو-مُو (Ku-mo) ہے (پا-لو-کیا Pa-lu-kia در Hsüan-tsang، دورِ تعانگ (T'ang) کا تُو-ہُوآن (Po-huan)، الادریسی کا باخُوان)، اگرچہ حدودِ ۱۴۰۰ء سے قدیم زمانے میں بھی آق صو میں چینی سوداگروں کی موجودگی کا ذکر آیا ہے (نظام شامی: ظفر نامہ [فلکس تاور کے اشاریہ میں یہ حوالہ نہیں ملا])، [اور ۸۲۸ھ میں الغ بیگ کی فوج اور وہ خود مغولستان کی مہم کے سلسلے میں آقسو (کذا) پہنچے اور بہت لُوٹ مار کی اور اسیر حاصل کیے۔ مطلع سعدین، ص ۵۴۶] تاہم ۱۴۷۵ء تک بھی مشرقی ترکستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں اس کی اہمیّت کم ہی تھی (W. Barthold: *12 Vorlesungen*، برلن ۱۹۳۵ء، ص ۲۲۰)؛ البتہ حیدر میرزا کی تاریخ رشیدی کے مطابق ۱۵۴۷ء کے قریب یہ شہر اس ملک کے صدر مقاموں میں سے ایک تھا۔ زمانۂ حال میں اس شہر کی اہمیت (جو یارقند، کاشغر اور طُرفان کے برابر پھر بھی نہیں ہو سکی تھی) ایک تجارتی منڈی ہونے کی حیثیت سے اور ملکِ چین، سائبیریا، مشرقی اور مغربی ترکستان، کشمیر، لدّاخ اور ہندوستان کے راستوں کے مقامِ اتّصال پر واقع ہونے کی وجہ سے تھی۔ اسے جنگی اہمیّت بھی حاصل تھی۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں چھے ہزار مکان، چھے کاروان سرائیں، پانچ مدرسے تھے اور فصیل بھی تھی، جس میں چار دروازے تھے۔ چونکہ ۱۷۱۶ء میں زلزلے سے یہ شہر تقریباً بالکل ہی تباہ ہو گیا اس لیے کوئی پرانی عمارت باقی نہیں رہی۔ انیسویں صدی کے سیّاح (A.N. Kuropatkin، ۱۸۷۶-۱۸۷۷ء؛ N. M. Prževal' skiy، ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء؛ Carey ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء؛ F. E. Younghusband، ۱۸۸۶ء؛ Sven Hedin، ۱۸۹۵ء؛ بیان کرتے ہیں کہ اس شہر کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار اور شہر کا محیط تقریباً ۲ کیلومیٹر ہے۔ باشندوں کے ذرائع معاش یہ تھے: دھات کا کام، نہایت اعلیٰ قسم کا سوتی کپڑا (بَزّ)، زینیں اور لگامیں، زیورات اور اونٹوں، گھوڑوں اور مویشیوں کی پرورش۔

۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۷ء کے درمیان آق صُو، یعقوب بیگ [رک بآن] کاشغری کے قبضے میں تھا، ۱۸۷۷ء سے پھر چینیوں کے قبضے میں آ گیا (چینی نام: وِرُون-سُو-چاؤ Wön-su-chow)۔ چینیوں نے اس شہر کو "چار مشرقی شہروں" (آق صُو-کُچا-قَرہ شہر اور اُوچ تُرفان) کے صدر (تاؤ تعائی Tao-t'ai) کی قیام گاہ کے لیے منتخب کیا۔ بیسویں صدی میں مشرقی ترکستان پر جو کچھ گزری اس شہر پر بھی گزری۔ باشندوں کی کل تعداد (بظاہر بیشتر سنّی مشرقی ترک) آج کل بیس اور چالیس ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے، جو قالین بافی کا کام بھی کرتے ہیں۔

مآخذ: (۱) P. Pelliot: *La ville de Bakhouan dans la géographie d'Idrîçî*، T'oung-pao، ۱۹۰۶ء، ۵۵۳-۵۵۶؛ (۲) وہی مصنّف: *Notes sur les anciens noms de Kuča, d' Aq-su et d' Üč-Turfān*، Toung-pao، ۱۹۲۳ء، ص ۱۲۶-۱۳۲، یہ مواد حدود العالم، ص ۲۹۳-۲۹۷ میں جمع کر دیا گیا ہے، قب نیز ۲۷ بعد اور نقشہ ۲۷۹؛ (۳) Brockhaus-Efron: *Entsiklopedičeskiy Slovar*، طبع اوّل، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۰ء، ۱:۳۰۷ بعد؛ (۴) A. Hermann: *Atlas of China*، کیمبرج (Mass.) ۱۹۳۵ء،

ص ۲۴، ۳۷، ۵۸، ۶۰؛ (۵) *Bol'shaya Sovyetskaya Entsikolp-ediya*، طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ۱: ۶۱۷ ببعد.

(B. SPULER شپُولَر)

---

* **آق صُو:** (ترکی) "آب سفید" (۱) اصطلاحی کلمہ، جس سے مراد ہے کسی دریا کا مجرَی یا بستر (ایضًا "آق دریا")، جس سے کوئی نہر ("قرہ صو" یا "قرہ دریا") نکالی جائے؛ (۲) ترکی بولنے والے ملکوں میں متعدّد دریاؤں کا نام۔ اکثر یہ دریا اپنے دوسرے ناموں سے زیادہ مشہور ہیں۔ جن دریاؤں کا نام ترکی میں آق صُو ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) آمو دریا [رَکِ بآن] کی اصل ندّیوں میں سے ایک، جو مُرغاب [رَکِ بآن] اور دریاے کُولاب [رَکِ بآن] کے نام سے بھی موسوم ہے؛ (۲) "جنوبی" بگ (Bug؛ یوکرائنی زبان میں بُہ Buh) یوکرائن میں (جسے عثمانی مؤرّخین نے بالالتزام آق صُو لکھا ہے)، جو بحرِ اسود (قرہ دکِز) میں گرنے پر دریاے نیپر Dnieper [ترکوں کا اوزی، تاتاریوں کا اکشی صُو — سامی] کے ساتھ ایک مشترک خَوْر (چوڑا دہانہ (estuary) بنا لیتا ہے؛ (۳) مشرقی ترکستان (سِنْ کیانگ) میں ایک تیز رو پہاڑی ندّی جو تیان شان شان (T'ien-shan) سے نکل کر تارِم (یارقند دریا) کی جانب، جنوب مشرقی سمت میں بہتی اور سِل (Sil) کے نزدیک تارِم اور خُتَن دریا کے سنگم سے کچھ اوپر اس میں آ ملتی ہے۔ شہرِ آق صو (دیکھیے اس سے پہلا مادّہ) کا نام اسی ندّی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

(B. SPULER شپُولَر)

⊗ **آق قویُونلُو:** [آق قیونلی] مشرقی آناطولی کے ایک قبیلے، نیز اس اِمارت کا نام جس کی اس قبیلے نے بنا رکھی؛ بعد میں ایک قوم، پھر اس سلطنت کا نام ہوا جو اس قوم نے قائم کی۔ اس قبیلے کے لوگ چودھویں صدی عیسوی میں مشرقی آناطولی میں سکونت پذیر ہوے اور جنوب میں اُوْرفہ (Edessa) اور مارْدِین اور شمال میں بایبُرْت تک پھیل گئے۔ دِجلہ اور فُرات کی وادیوں کے مختلف حصّوں میں وہ خانہ بدوشی کی حالت میں گرم و سرد مقامات کے درمیان نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ اس صدی میں آناطولی کا یہ حصّہ انتہائی بدنظمی کے دور سے گزر رہا تھا، اس لیے مؤرّخین ان کی نقل و حرکت اور اُن جنگوں اور بغاوتوں کے حالات کے بارے میں جن میں وہ شریک ہوے اختلاف ظاہر کرتے ہیں۔ عالی: کُنْہ الاخبار؛ جَنَابی (م ۹۹۹ھ): العَیْلَم الزّاخِر، اور اُس سے نقل کرتے ہوے ابوالعبّاس قرامانی: اخبار الدُوَل، سب یہ کہتے ہیں کہ آق قویُونلُو اپنے بڑے رقیب قرہ قویُونلُو کے ساتھ جو چودھویں صدی میں آناطولی کے انتہائی مشرق (یعنی جھیل وان کے طاس) میں — شمال میں دریاے اَرَس کے منبع اور جنوب میں موصل کے درمیان — گرمی اور جاڑا بسر کرتے اور بہت سے سیاسی واقعات سے دو چار ہوتے رہے، اُزُن حَسَن خان کے زمانے میں، یعنی تیرھویں صدی کے آخر میں، ماوراء النہر سے آناطولی آئے اور انھوں نے مذکورۂ بالا مقامات میں نقل و حرکت اور بود و باش اختیار کی۔ یہ روایت، جو بعد ازاں غیر معتبر تصانیف، یہاں تک کہ فان ہامر: *Histoire de L'Empire Ottoman* میں بھی بیان کی گئی ہے، سرتاپا بے بنیاد ہے۔

پندرھویں صدی کے بعض ایرانی مؤرّخین اُوغوز خان کی فتوحات کا حال لکھتے ہوے جہاں اَور ساختہ حکایتیں نقل کرتے ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان فتوحات کے دوران میں ترکمان مشرقِ قریب اور آناطولی میں آئے اور قرہ قویُونلُو اور آق قویُونلُو بھی اسی زمانے میں یہاں وارد ہوے۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ سہو کاتب کی وجہ سے ہمارے مؤرّخین نے اُوغُوز کو اُرْغُون پڑھ لیا اور اس لیے مذکورہ غلطی کے مرتکب ہوے؛ چنانچہ اس روایت کا ناقل عالی اپنی ایک اَور تصنیف (فُصول الحَلّ و العَقْد) میں بیان کرتا ہے کہ آق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو اُوغوز خان کے عہد میں آناطولی آئے اور اس بیان سے ہماری راے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ دولت شاہ اپنے تذکرے (ص ۳۹۰) میں آق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو کی اصل و نسل سے بحث نہیں کرتا۔ اگر کچھ کہتا ہے تو یہ کہ قرہ قویُونلُو اقصاے ترکستان کے جبال غَزْ قُرد، [غَازْ قُرد، در نسخۂ مطبوعۂ دولت شاہ، طبع براؤن] سے نکل کر قدیم زمانے میں آذربیجان اور بِدْلِیس کے علاقوں میں آئے اور وہ خانہ بدوش قسم کے انسان تھے۔ علاوہ ازیں قرہ قویُونلُو کی دو مختلف تاریخوں میں بھی، جو ہندوستان میں لکھی گئیں اور جن کے نام تاریخ ترکمانیہ [سٹوری، ۱: ۲۹۹] اور تاریخ سلطان محمّد قطب شاہی [سٹوری، ۱: ۴۷۷] ہیں، آق قویُونلُو کی اصل کا تو کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن قرہ قویُونلُو کے بارے میں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں کہ ۵۹۹ھ/ ۱۲۰۲ - ۱۲۰۳ء میں وہ مشرقی ترکستان سے نکل کر ماوراء النہر پہنچے اور بالآخر جب وہاں چنگیز خان کا غلبہ ہو گیا تو آناطولی میں ہجرت کر گئے، جہاں مدت تک وہ برابر گُرجیوں سے لڑتے بھڑتے اور تاتاریوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جہان آرا اور نگارستان کا مصنّف غَفّاری اگرچہ قرہ قویُونلُو کی اصل و آغاز پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا تاہم بیان کرتا ہے کہ آق قویُونلُو زمانۂ قدیم سے دیارِ بکر کے علاقے میں موجود تھے [قَبِ نگارستان، بمبئی ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء، ص ۳۷۰] اور ان کے بیکوں کے اجداد میں سے ایک اس علاقے کے امرا میں سے تھا۔ حیدر رازی، مصنّف مجمع التواریخ بھی بعینہٖ یہی بات کہتا ہے۔ سولھویں صدی کا ایک ہندوستانی مصنّف ابراہیم حَرِیر (جَرِیر؟) تاریخ ہمایُونی (پیرس، *Suppl. Persan, Bibl. Nat.*، شمارہ ۱۸۴، ورق ۲۷۵، [دیکھیے سٹوری، ۱: ۱۱۳] میں رقم طراز ہے کہ آق قویُونلُو مدّتِ مدید سے آناطولی میں سکونت پذیر تھے، نیز یہ کہ ان کے بک سلجوقی سلاطین کے رؤسا میں سے تھے اور ان سلاطین کی طرف سے انھیں دیارِ بکر کی ایالت سپرد کی گئی تھی۔

مصری مؤرّخین میں سے مَقْرِیزی اور [اس کا شاگرد] ابوالمحاسن ابن تَغَرِی بِرْدِی [جمال الدّین یوسف] آق قویُونلُو کے آغاز پر روشنی ڈالے بغیر صرف یہ کہتے ہیں کہ ان کے بک یا سردار سلطنت اَرْتُقِیّہ کے (جس کا صدر مقام مارْدِین تھا) امرا میں سے تھے۔ عرب مؤرّخین میں سے بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ آق قویُونلُو بک سلجوق امرا کی اولاد سے تھے.

تعیینِ زمان و مکان کے بارے میں ان روایتوں کو، جو آق قویُونلُو [کی حقیقت] سے کوسوں دور ہیں، نظر انداز کر کے اب ہم قاضی و منشی ابوبکر طِہْرانی، صاحبِ کتاب دیار بَکْرِیّہ، کی روایت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس نے یہ کتاب ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں بادشاہ عظیم اوزون حسن کے نام پر لکھی تھی (اس کتاب کا منحصر بفرد خطّی نسخہ ترکی میں راقم کے ذاتی کتب خانے میں ہے)۔ اس کا بیان ہے کہ قرہ یُولُوق عثمان بیگ [مطلع سعدین، ۲/ ۱۱۸۳: قرہ عثمان] اوزون حسن کا دادا اور امارتِ آق قویُونلُو کا بانی، بایندر خان کی وساطت سے اُوغوز خان سے باوَنویں پشت میں تھا۔ گویا اس کے نزدیک آق قویُونلُو اُوغُوز یعنی ترکمانوں کے قبیلۂ بایندر کے ایک خاندان سے تھے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ قرہ یُولُوق کا بیسواں جدّ سُنْغُر رسول کریمؐ کا ہم عصر تھا۔ سُنْغُر ترکستان سے علاقۂ قِپْچاق میں پہنچا اور وہاں سے اَرّان (دریاے اَرَس اور قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان) آیا اور بحرِ گوکچہ [نزھۃ القلوب، ص ۲۴۱] کے کناروں پر سکونت پذیر ہو گیا۔ اس نے بہت سی جنگوں میں شرکت کی اور آخر کار ایک تیر کے زخم سے ہلاک ہو گیا۔ یہی مؤرّخ بیان کرتا ہے کہ قرہ یُولُوق کا جدِّ چہاردہم ہَقْطُور خان خلیفۂ مامون الرشید کا ہم عصر تھا۔ اس نے گرجیوں سے قلعۂ اَلَنْجَق [رَکّ بآن] فتح کیا اور مختلف علاقوں میں فتوحات بھی حاصل کیں۔ جدِّ ہشتم ہابیل بیگ آناطولی کے سلجوقی سلطان عِزّ الدّین مسعود اوّل کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس کا بیٹا 'جدِّ ہفتم' بابل [قابیل] بیگ، عِزّ الدّین قِلِیچ آرْسْلان دوم کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس کا بیٹا 'جدِّ ششم' سُنْغُر بیگ رُکن الدّین سلیمان شاہ دوم کے وقت میں اور اس کا بیٹا 'جدِّ پنجم' ادریس بیگ، کیکاؤس اوّل اور علاء الدّین کیقباد اوّل کے زمانے میں قبیلۂ آق قویُونلُو پر حکمران تھا، جس نے دیار بکر کے علاقے میں بعض شہر اور علاقے فتح کیے۔ مؤخّر الذّکر کا بیٹا 'جدِّ چہارم' بنام اِیْزدی بیگ، غیاث الدّین کیخسرو دوم کے اور عِزّ الدّین، کیکاؤس دوم کے عہد میں آق قویُونلُو پر حکمران تھا.

ابوبکر طِہْرانی اس کے بعد کہتا ہے کہ اِزْدِی بیگ کا لڑکا اور قرہ یُولُوق عثمان بیگ کا تیسرا جدّ پہلوان بیگ تھا، جو رُکن الدّین قِلِیچ آرْسْلان چہارم اور غیاث الدّین کیخسرو سوم کے زمانے میں ہوا ہے، وہ قلعۂ اَلَنْجَق کا حاکم تھا اور ہلاکو کے حملے کے وقت اس نے اس بادشاہ کے حکم سے اُن مغل فوجوں کا مقابلہ کیا جو آناطولی پر قبضہ کرنے آئی تھیں اور وطن اور ملک کی مدافعت میں غیرت و شجاعت دکھائی، بالآخر مغربی آناطولی میں جا کر قبیلۂ علی شیر اوغلو، یعنی گَرْمیانیوں کے ساتھ متّحد ہو کر بروسہ کے اطراف میں جنگ میں مصروف رہا اور رومیوں کو ہزیمت دے کر اپنے وطن (یورت) واپس آ کر ایک بڑا امیر بن گیا اور آمِد کے شہر میں فوت ہوا۔ یہی مصنّف رقم طراز ہے کہ پہلوان بیگ کے بعد اس کا بیٹا طور علی بیگ قبیلۂ آق قویُونلُو کا حاکم ہوا۔ اُس نے اپنے گرد و پیش تقریباً تیس ہزار کی جمعیّت فراہم کر لی اور دیار بکر میں مقیم ہو کر آناطولی، عراق اور شام کے حدود میں اپنی دست درازیوں سے دہشت برپا کر دی، نیز یہ کہ نوعمری میں وہ غازان خان کے ساتھ شام کے سفر پر گیا اور چونکہ اس نے اس مہمّ میں بہت بہادری اور شجاعت دکھائی اس لیے خانِ مذکور کی نظرِ التفات سے سرفراز ہوا، جس نے اسے اِمارت کا درجہ عطا کیا اور اس کی شہرت کی بنا پر شام کے آق قویُونلُو طور علی لَر کہلانے لگے۔ قرہ یُولُوق عثمان بیگ کے اس دادا کا ذکر سلطنت طُرَبُزْون کی کتبِ وقائع میں کئی بار آتا ہے.

ابوبکر طِہْرانی یہ بھی لکھتا ہے کہ طُور علی کے بعد اس کا بیٹا فخر الدّین قُتْلو بیگ آق قویُونلُو کا سردار بنا اس وقت ترکمانوں کے قبیلۂ طُخارلُو کا سردار یوسف بیگ، جس نے سلطنت طرَبُزْون کے خلاف دراز دستی اختیار کی تھی، اس سلطنت کے بادشاہ کے خلاف لڑتا ہوا مغلوب و مقتول ہوا۔ غیرتِ دینی کے جذبے کے ماتحت قُتْلو بیگ نے طرَبُزْون پر چڑھائی کر دی، شہنشاہ کو شکست دے کر حوالی طرَبُزْون کو تاخت و تاراج کیا اور شہنشاہ کی بیٹی دِسْپِینَہ (Despina) کو گرفتار کر کے طُخارلو کا انتقام لے لیا؛ نہ صرف یہ بلکہ اس نے گرجیوں پر بھی کئی فتوحات حاصل کیں اور شہر آقْسُقہ [دیکھیے آخِسْخَہ] ان کے ہاتھ سے چھین لیا.

چونکہ ان کے جَھنڈوں پر بھیڑ کا نشان ہوتا تھا اور ان کے مقابر پر بھی بھیڑوں ہی کے مجسّمے نصب کیے جاتے تھے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں ان کا طوطَم (totem = شِعارِ قبیلہ) بھیڑ ہی تھا۔ بعد میں جب انھوں نے اسلام قبول کر لیا تب بھی آق قُویونلو اور قرہ قویُونلُو قبائل نے اس طوطَم کو ترک نہ کیا۔ اس سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ اَق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو اُس ترکی ایل کے باقی ماندہ چھوٹے چھوٹے گروہ تھے جسے ہم قون (خون = قویون) کہتے ہیں اور جس نے عہدِ قدیم اور قرونِ متوسّطہ کے ایک حصّے میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے اور کہ جب وہ آناطولی میں وارد ہوئے تو ان کے پرانے ناموں میں قویون کا لفظ باقی تھا۔ زیادہ تر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب ترک قوم اور قبائل (اُولُوس) منتشر ہوئے تو ان کے مختلف قبائل یا خانوادوں میں سے بعض نے اپنے مخصوص ناموں کے ساتھ ان لوگوں یا قوموں کے ناموں کو بھی برقرار رکھا جن سے وہ گزشتہ زمانے میں منسوب تھے، یا ان ناموں کے ساتھ کسی رنگ، عدد، یا دوسری کسی صفت کا اضافہ کر کے اپنے لیے ایک علٰیحدہ شخصیت قائم کر لی، یا بالفاظِ دیگر الگ الگ جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ اسی طرح آق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو پرانے قویُونلُو سے الگ ہو گئے اور دو گروہوں کی شکل میں آناطولی میں وارد ہونے کے بعد جب وہ قبیلۂ اوغوز سے ملحق ہوئے تو قبائلی جمعیّتوں کے دستور کے مطابق وہ اپنے نسب کو تبدیل کر کے اوغوز میں مدغم ہو گئے۔ ان میں سے آق قویُونلُو ترکمان

قوم کے ایک بڑے قبیلے بایَنْدَر میں مل گئے، جو آناطولی میں ہر طرف اور عراق و ایران کے بعض علاقوں میں بھی برسرِ اقتدار تھے۔ اسی طرح قرہ قویُونلُو ایک دوسرے ترکمان قبیلے میں مُدغم ہوکر، جو بَرَانلی کہلاتا تھا، ترکمانوں کی جمعیت میں شامل ہوگئے۔ یہ دونوں قبیلے، جو مشرقی آناطولی میں رہتے تھے اور ایک دوسرے کے رقیب تھے، چودھویں صدی میں مشرقِ قریب میں برپا ہونے والی فَوضَوِیّت (anarchy) کے دوران میں سرگرمِ عمل رہے اور ہر طرف قتل و غارت مچا کر اور اس کے ساتھ آپس میں بھی جنگ و جدال کر کے تہذیب و تمدّن کی بربادی کے درپے رہے۔ ابن بَطُّوطہ، جو ایلخانی سلطنت کے انقراض سے پہلے، ۱۳۳۲ - ۱۳۳۴ء کے دوران میں، آناطولی سے گزر کر ارضِ روم میں وارد ہوا، کہتا ہے کہ دو ترکمان قبیلوں کی باہمی جنگ کی وجہ سے یہ شہر خراب و خستہ حالت میں تھا (سیاحت نامۂ ابن بَطُّوطہ، مترجمۂ شریف پاشا، استانبول ۱۳۳۵ء، ۱:۳۲۸ [اور ابن بَطُّوطہ، مترجمۂ گب H. A. R. Gibb، ۱۳۲:۱، لنڈن ۱۹۲۹ء]) اور ان دو قبیلوں کے قرہ قویُونلُو اور آق قویُونلُو ہونے میں کوئی شُبہہ نہیں ہوسکتا۔

ایلخانی سلطنت کے درہم برہم ہوجانے پر اس کی جگہ لینے کے لیے جلائر، چوپان اور سُتای خاندانوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ یہ دونوں قبیلے بھی اس لڑائی میں شریک ہوگئے۔ قرہ قویُونلُو عراق کے جلائر خاندان کے طرفدار بن گئے اور آق قویُونلُو ان کے رقیب سُتای کے — جنھوں نے موصل اور دیارِ بکر کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی — اور ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگے۔ جب سُتای موصل سے نکل کر دیارِ بکر کی طرف اور پھر اسے بھی کھو کر آخرِ کار وسطی آناطولی میں بارِم بک قبیلے کی مملکت میں ہجرت پر مجبور ہوگئے تو آق قویُونلُو نے ماڑدِین کے حکمران قبیلۂ اَرتُق اوغول سے اتحاد کرلیا اور دیارِ بکر کے نواح میں بعض شہروں اور قلعوں پر قابض ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری مؤرّخین قُتلو بیگ کو اَرتُقی سلطنت کا ایک سردار بتاتے ہیں۔ آق قویُونلُو متواتر طاقت پکڑتے گئے اور دیگر قبائل بھی ان سے ملحق ہوتے گئے تا آنکہ پندرھویں صدی کے آغاز سے ان کا شمار بڑی قوموں میں ہونے لگا۔ مہمّات و فتوحات میں آق قویُونلُو کے قائدین بہت کامیاب رہے اس لیے دیگر قبائل بھی ان سے ملحق ہوگئے۔ اس طرح آق قویُونلُو کی جماعت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور آخر اس نے ایک واقعی بڑے قبیلے (اُولُوس) کی شکل اختیار کر لی؛ جو خاندان اور قبیلے ان کے ساتھ ملحق ہوے انھوں نے اپنے خصوصی نام قائم رکھے، لیکن سب کے سب آق قویُونلُو کہلانے لگے۔

آق قویُونلُو قبیلے میں پہلے تو اوغوز کے (جن سے یہ لوگ اپنا نسب ملاتے تھے) بڑے (مادری) قبیلوں میں سے بایندر اور پھر اوغوز کے دوسرے بڑے قبیلوں میں بَیات، دُوہگر اور چِپنی قبیلے شامل ہوگئے، جو آناطولی کے مشرق اور جنوب میں گرمی اور جاڑا بسر کرتے تھے، اور آخر میں اِنَلی قبیلے کے ساتھ اور زِر قبیلہ اور پھر اَور بعد میں چاکرلی، کورپک، عرب گیُرلی، بچِن، طُخارِلی، بیرام لی، حاجّی لی، مُصلُّو، پرِنک اور خوجہ حاجیلی کے قبیلے بھی شامل ہوگئے۔ اس کے بعد جب اوزون حسن نے قرہ قویُونلُو کو مغلوب کر لیا تو اوغوز کے اَور بڑے (مادری) قبیلوں میں سے افشار کے مشرق میں پائے جانے والے قبائل، یعنی جِہانگیرلی، سَاعَتلی، اَلپاوُت، اَغماِلی اور پھر قاچار، آغاچری اور قرہ قویُونلُو قبیلے (اولوس) کے تابع مشرق میں بسنے والے قرہ مان قبیلے کے علاوہ دیگر بہت سے قبیلے بھی انھیں سے ملحق ہوگئے۔ آگے چل کر جب ذوالقدِر اوغلو نے رُستم بیگ کی امارت کا دعوٰی کیا تو اس کے بھتیجے آرسلان اور شاہ سُوار بیگ چونکہ ان کے خلاف اوزون حسن سے مل گئے اس لیے ذوالقدِرلی اولوس سے منسوب قبیلوں اور خاندانوں میں سے کچھ آق قویُونلُو میں آملے۔ اسی طرح جب عثمانی ترکوں نے آناطولی کے قرہ مان اوغلیوں کو وہاں سے بھگا دیا تو قرہ مان سلطنت کے تابع قبیلوں اور خاندانوں کی ایک بڑی تعداد نے اوزون حسن کی طرف رجوع کیا اور اس طرح انھوں نے آق قویُونلُو اولوس کو، جو ازخود خاصہ بڑا تھا، اَور بڑھا دیا۔

اس طرح آق قویُونلُو کے سردار طُورعلی بیگ یا قُتلو بیگ کے بیٹوں نے اپنے قبائل (اولوسوں) میں اضافے کی بدولت ایک وسیع سلطنت قائم کر لی جو ایک طرف خراسان سے فُرات تک اور دوسری جانب قفقاز کے پہاڑوں سے خلیج فارس (عُمان بحر) تک پھیلی ہوئی تھی اور اس سلطنت کے ہر حصّے کی حکومت انھوں نے کسی مخصوص اولوس یا خاندان کے سپرد کر رکھی تھی۔ اس سلطنت نے، جس کا دارومدار شہر یا گاؤں کے لوگوں پر نہیں بلکہ خانہ بدوش ترکمانوں پر تھا اور جس میں حاکم طبقہ بھی خانہ بدوشوں ہی میں سے تھا، بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور ان فتوحات کے اور اپنے مرکزِ حکومت کو آمد سے تبریز میں منتقل کرنے کے بعد اُن قبیلوں اور خاندانوں میں سے جن سے اس کی جمعیّت (اولوس) بنی تھی بہتوں کو آناطولی سے ایران کی طرف بھیج دیا، جیسا کہ اس سے پہلے قرہ قویُونلُو کر چکے تھے اور اس طرح یہ سلطنت آناطولی میں ترکی عنصر کے کمزور ہوجانے کا دوسرا سبب بن گئی۔

اس طرح آق قویُونلُو نے، جن کے پاؤں علاقۂ دیارِ بکر میں مضبوطی سے جم چکے تھے، امپراطوریۂ طرَبزُون بلکہ خود شہر طربزُون پر پے در پے حملے کیے؛ یہ حملے ایک دفعہ ملکۂ اِیرِنہ (Irene) کے عہد میں (۱۳۴۰ء)، دو دفعہ ملکۂ آنہ (Anna) کے عہد میں (۱۳۴۱ء) اور ایک دفعہ شہنشاہ میخال (Michael) کے وقت میں ہوے (طربزُون کی سلطنت کے لیے ملاحظہ ہو Panaretos کا وقائع نامہ اور Lebeau: *Histoire du Bas-Empire*، ۲۰:۴۸۳، ۴۸۶ ببعد)۔ Panaretos، جو ان واقعات کا معاصر ہے، آق قویُونلُو کا ذکر ہمیشہ آمِدی ترکوں کے نام سے کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ شہنشاہ یانی (Yuannes) سوم کے عہد (۱۳۴۸ء) میں آمِدی امیر طُورعلی بیگ نے بابُرتی امیر محمود رِکاب دار اور اِرزِنجانی امیر اینہ بیگ کی معیّت میں طربزون پر حملہ کیا اور تین روز تک اس کا محاصرہ کیا، لیکن آخر کار بے نیلِ مرام واپس ہوا (وہی کتاب، ص ۴۴۸)۔ شہنشاہ آلکسِس (Alexis) دوم نے ترک بکوں میں سب سے طاقتور طُورعلی

بیگ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، تاکہ دوسرے سرداروں کو اس سے برسرِ پرخاش ہونے کی جرأت نہ ہو۔ اس غرض سے اس نے اپنی ہمشیرہ میریا دِسپِینَہ (Maria Despina) کی شادی اس بِک کے لڑکے قُتلُو خان سے کر دی اور اگست ۱۳۵۲ء میں یہ شہزادی اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی (وہی کتاب، ص۴۹۱)۔ اوپر ہم نے ابوبکر طِہرانی سے جو یہ نقل کیا ہے کہ قُتلُو بیگ نے شہزادی دِسپِینَہ کو قید کر لیا تھا، اس کی یہ توضیح ضروری ہے کہ اُس کے اپنے والد کی معیّت میں طربزون کا محاصرہ کرنے اور انجام کار اس شہزادی سے شادی کرنے کی حکایت سے لوگوں کے دلوں میں غلط اور افسانہ آمیز تصوّرات پیدا ہو گئے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ شہزادی دِسپِینَہ قُتلُو بیگ کے بیٹے قرہ یُولُوق عثمان بیگ کی ماں تھی، جس نے کہ ریاستِ آق قویُنلُو کی بنیاد ڈالی۔ طربزونی وقائع نگار اس کے بعد طُور علی بیگ کا مطلق ذکر نہیں کرتا؛ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ۱۳۶۳ء میں شہنشاہ آلِکسِس تمام کنبے سمیت اپنے بہنوئی قُتلُو بیگ سے ملنے جانا چاہتا تھا لیکن ترکوں کے علاقے میں وبائے طاعون کے پھیل جانے کی وجہ سے نہ جا سکا (ص۴۹۷)۔ بظاہر شہنشاہ اُسے اپنے باپ کی جگہ منصبِ اِمارت پر سرفراز ہونے پر مبارک باد دینے کے لیے جانا چاہتا تھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ طُور علی بیگ اسی سال فوت ہوا ہو گا لیکن اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہوا۔

۱۳۶۵ء میں قُتلُو بیگ اور اس کی بیوی دِسپِینَہ شہنشاہ آلِکسِس سے ملنے کے لیے طربزون آئے اور پورے آٹھ دن کے قیام کے بعد اپنے ملک کو واپس ہوئے۔ اس کے بدلے اس سے اگلے سال شہنشاہ نے مع تمام اراکینِ دربار، Panaretos مؤرّخ اور دو ہزار پیدل و سوار فوج کو ہستان کو عبور کیا اور چار دِن کی مسافت کے بعد اَشَنتَقہ (Aşantaka) میں، جہاں قُتلُو بیگ اس کا منتظر تھا، اس سے دوبارہ ملاقات کی اور چند روز قیام کے بعد اپنے ملک کو واپس ہوا (ص۴۹۸ ببعد)۔ قُتلُو بیگ کے بیٹے قرہ یُولُوق عثمان بیگ نے بھی شہنشاہ آلِکسِس کی ایک بیٹی سے شادی کی (Miller: *Trebizond the last Greek Empire*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ص۴۸-۶۱؛ De Muralt : *Chronogr. Byz.*، ۲:۵۷۲-۵۷۷، ۵۹۰، ۶۱۸، ۶۳۸، ۶۷۰، ۶۷۵، ۶۷۸)۔ قتلو بیگ کے متعدّد بیٹوں میں سے ہمیں چار کے نام معلوم ہیں: حُسین (Hüseyin)، احمد، پیر علی، قرہ یُولُوق عثمان۔ قتلو بیگ امارت کے ان تنازعات میں جو چودھویں صدی کے نصف ثانی میں وسطی اور مشرقی آناطولی میں رونما ہوے اکثر حصّہ لیتا رہا اور ہر قسم کی اجرت یا مکافات یا مالِ غنیمت کے عوض مختلف مدّعیانِ امارت کی ملازمت یا مدد کرتا رہا۔ اِرزِنجان کے امیر غیاث الدّین اِینَہ بیگ کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ اس نے ۱۳۴۸ء اور ۱۳۶۱ء میں سلطنت طربزون پر حملہ کیا اور ۱۳۶۱ء میں گُرجستان میں داخل ہو کر کئی ایک قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا اور یہ کہ اگلے سال اس کی وفات پر یہ مقام پیر حسین کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۳۷۸ء میں اس کی وفات پر مُطَہَّرتن نے (جس کا نام تاریخ میں غلطی سے طَہرتن درج ہو گیا ہے) اس مقام پر قبضہ کر لیا۔ سِیواس کے حاکم اِرتِنہ کے بیٹے علی بیگ نے اپنے وزیر امیر برہان الدّین [رک بآں] کی معیّت میں اِرزِنجان پر قبضہ کرنے کی نیّت سے پیش قدمی کی۔ اس موقع پر مُطَہَّرتن اور اِرزِنجان کے لوگوں کی درخواست پر قُتلُو بیگ نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کو ان کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ علی بیگ نے شہر کی مدد کو آنے والے آق قویُنلُو کے مقابلے کے لیے اپنے ایک افسر جُنید کو بھیجا، لیکن آق قویُنلُو نے فتح پائی۔ اسی وجہ سے علی بیگ سِیواس واپس چلا گیا اور اِرزِنجان مُطَہَّرتن ہی کے قبضے میں رہا (۱۳۷۹ء؛ ملاحظہ ہو عزیز اَستَر آبادی: بزم و رزم، طبع استانبول، ص۱۶۳)۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب قاضی بُرہان الدّین کے حاکمِ سِیواس ہونے کا اعلان ہوا تو اس کے کچھ عرصے بعد قتلو بیگ کے بیٹے احمد بیگ نے اپنے آق قویُنلُو سپاہیوں کے ساتھ سیواس پر چڑھائی کر دی۔ برہان الدّین نے یوسف چلبی کو اس کی مدافعت کے لیے بھیجا، لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ مارا گیا (وہی کتاب، ص۲۹۲)۔ ۱۳۸۷ء میں جب برہان الدّین مَلَطِیّہ کے مصری والی مِنگَش کی دعوت پر اس شہر کا قبضہ لینے گیا تو قُتلُو بیگ کے بیٹے بھی معذرت کے لیے حاضر ہو کر اپنے گذشتہ قصوروں کی معافی کے خواستگار ہوے۔ برہان الدّین نے ان کی درخواست منظور کر لی اور ان کا قصور معاف کر دیا۔ انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی قرہ یُولُوق عثمان بیگ کو بطورِ یرغمال اس کے پاس چھوڑ دیا (وہی کتاب، ص۳۴۷)۔ ابوبکر طِہرانی کے بیان کے مطابق قرہ یُولُوق نے آق قویُنلُو اور قرہ قویُنلُو کی باہمی کشمکش کے دوران میں بڑی بہادری دکھائی اور یہی بہادری قرہ قویُنلُو کی شکست کا باعث ہوئی۔ اس کی بہادری اور شہرت نے اس کے بھائیوں کے دل میں حسد پیدا کر دیا اور انھوں نے اسے قید کر دیا، لیکن قرہ قویُنلُو کے دوبارہ حملے پر اُسے پھر رہا کر دیا۔ قرہ یُولُوق نے اس بار بھی دشمنوں کو پراگندہ کر دیا اور اس کے بعد اپنے حاسد بھائیوں کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کی خاطر ان سے علٰیحدہ ہو کر بُرہان الدّین کی ملازمت میں داخل ہو گیا، جہاں اُس کے ایک برگزیدہ امیر کی حیثیت سے اُس نے بہت سے اہمّ کارنامے انجام دیے۔

سِیواس سے مصریوں کے اخراج کے کچھ عرصہ بعد ۱۳۸۹ء کے دوران میں آق قویُنلُو کے سردار (بک) قُتلُو بیگ کا انتقال ہو گیا۔ قُتلُو بیگ کا مقبرہ بای بُورت کے پاس موضع سِنُور میں ہے۔ [جو قضا بای بورت کے ۱۴ ناحیوں میں سے ایک ہے] لیکن کتبے پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ قُتلُو بیگ کے بعد آق قویُنلُو کی قیادت احمد بیگ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اپنے باپ کے مخلص دوست مُطَہَّرتن سے رشتۂ اتّحاد توڑ کر احمد بیگ نے جنگ کر دی اور اسے شکست دی۔ اس پر مُطَہَّرتن آق قویُنلُو کے دشمن قرہ قویُنلُو کے نامی سردار قرہ محمّد کے ساتھ مل گیا۔ دونوں نے متّفقہ حملہ کر کے آق قویُنلُو کو شکست فاش دی اور ان کا بہت سا جانی نقصان ہوا۔ اس مشکل صورتِ حال میں آق قویُنلُو نے، جن کے سردار احمد بیگ اور اس کا ایک بھائی حُسین بیگ تھے، قاضی برہان الدّین سے سرپرستی کی التجا کی اور اس کے ساتھ آماسیَہ کی مہمّ میں شریک ہوے۔ اس مہم کے دوران میں احمد نے

اپنے نئے آقا کے خلاف کئی بار دغابازی کی، لیکن اس کی ان حرکات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ احمد کی یہ بری حرکتیں اگرچہ ظاہر ہوگئیں اور قاضی برہان الدّین نے اسے ان کے متعلق جتا بھی دیا، لیکن اس خوف سے کہ کہیں آق قویُونلُو اس کے دشمن نہ ہو جائیں بُرہان الدّین اسے کوئی سزا نہیں دے سکا (عزیز اَستَر آبادی: یزدم و رزم، ۳۶۹-۳۷۵، ۳۸۱).

حافظ اَبرُو (زبدۃ التواریخ، کتب خانۂ فاتح، شمارہ ۴۳۱۷) کا بیان ہے کہ ۱۳۸۸ء میں قرہ قویُونلُو سردار قرہ محمّد آق قویُونلُو کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور جونہی یہ خبر تبریز میں قرہ قویُونلُو کے پاس پہنچی وہ شہر خالی کر کے باہر نکل گئے، حالانکہ اس واقعے کے معاصر عرب مؤرّخین (جن میں سب سے ممتاز ابن الفُرات اور عَینی ہیں) اس پر متفق ہیں کہ وہ ۱۳۸۹ء میں مارا گیا۔ ابن حَجَر کا بیان ہے کہ قرہ محمّد ایک لڑائی میں مارا گیا جو اس کے اور ایک دوسرے ترکمانی قائد قرہ حسن بن حُسین بیگ کے درمیان ہوئی (اِنباء الغُمر، بذیل ۷۹۱ھ)۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ قرہ حسن آق قویونلو کے سردار احمد بیگ کے بھائی حسین بیگ کا بیٹا ہو، جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں؟ ارمنی مؤرّخ ٹومس (Thomes de Medzoph؛ ترجمۂ F. Nèvi، ص ۴۰)، جو ان واقعات کے وقت زندہ تھا اور جس نے ان میں سے اکثر واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، بیان کرتا ہے کہ قرہ محمّد ایک اور ترکمان سردار پیر حسن نامی کے ہاتھوں مارا گیا، جو شروع میں اس کے ساتھ تھا اور آخر میں اس سے جدا ہو گیا تھا۔ ابوبکر طِہرانی نے لکھا ہے کہ قرہ محمّد کو پیر حسن نے قتل کیا نیز یہ کہ قرہ محمّد کے بیٹے قرہ یوسف نے قرہ یُولُوق عثمان بیگ سے مدد کی درخواست کی تاکہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لے سکے اور قرہ یُولُوق نے اپنے بیٹے ابراہیم بیگ کو کچھ فوج دے کر اس کی مدد کو روانہ کیا اور انھوں نے پیر حسن کو شکست دے کر قید کر لیا۔ ابن قاضی شُہبہ: ذیل دُوَل الاسلام [للذّہبی] میں ۷۹۱ھ کے وقائع میں کہتا ہے کہ قرہ محمّد کو اِلبِستان کے امیر سُلی بیگ نے قتل کیا جو ذوالقدری امرا میں سے تھا لیکن ابن حَجَر ۷۹۳ھ کے وقائع میں لکھتا ہے کہ قرہ محمّد کو بیچ میں سے ہٹانے والا قرہ حسن کا ایک بیٹا حسن بیگ نامی تھا، جو اپنے باپ کے بعد سردار بن گیا.

عزیز اَستَر آبادی (یزدم و رزم، ص ۴۷۴-۴۸۰) لکھتا ہے کہ ۱۳۹۴ء میں قاضی برہان الدّین مُطَہَّرتَن کے ساتھ جنگ کر رہا تھا اور جب اس نے اِرزِنجان پر حملہ کیا تو آق قویونلو کا سردار احمد بیگ اپنے قبیلے کے کچھ حصّے کے ساتھ اس کی مدد کو آیا اور اِرزِنجان اور اس کے نواح کو تاخت وتاراج کیا۔ اس کے بدلے میں برہان الدّین نے احمد بیگ کو اس نواح میں بای بورت کا تمام علاقہ جاگیر کے طور پر دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد احمد بیگ کا چھوٹا بھائی عثمان بیگ اپنے بھائی قرہ یُولُوق کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے الگ ہو کر اس نے سَمَخ پر حملہ کیا، لیکن برہان الدّین نے خود اس پر یورش کر کے اسے بھگا دیا۔ اس کے بعد برہان الدّین نے مُطَہَّرتَن سے شکست کھائی۔ اس مہمّ میں احمد بیگ بھی اس کا شریک تھا.

اگلے سال ۱۳۹۵ء میں جب برہان الدّین اِرزِنجان کے خلاف دوسری مہمّ پر روانہ ہوا تو اس وقت بھی احمد بیگ اور اس کا قبیلہ اس کے ہمراہ تھے۔ لیکن اِرزِنجان پہنچ کر احمد نے سُنا کہ امیر تیمور بغداد سے ملکِ شام کی طرف یلغار کر رہا ہے، اس لیے وہ اپنے قبیلے سمیت فوراً آمِد واپس آ گیا اور وہاں سے مَلَطِیّہ چلا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں غارت گری سے مال و دولت جمع کر کے سِیو اس لوٹ آئے۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ برہان الدّین اس کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے تو احمد نے مَلَطِیّہ کو چھوڑ دیا اور پھر برہان الدّین کی ملازمت میں داخل ہو گیا، جس نے اسے اِرزِنجان اور اس کے نواح کو سر کرنے پر مامور کیا (وہی کتاب، ص ۴۹۳ و مواضع دیگر).

لیکن برہان الدّین، احمد بیگ کے فریب سے ہر وقت خائف رہتا تھا۔ ۱۳۹۶ء میں جب وہ قرہ مان اوغلُو علاء الدّین بیگ سے برسرِ جنگ تھا اور احمد بیگ اس کی مدد کے لیے نہیں آیا تھا تو برہان الدّین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ غنیم کے ساتھ مل نہ جائے یا اس پر پیچھے سے حملہ نہ کر دے، اس لیے اس نے مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کیں (وہی کتاب، ص ۴۹۵-۴۹۷)۔ اسی سال کے موسمِ خزاں میں شیخ مُؤیّد نے، جسے برہان الدّین نے والیٔ قیصریّہ مقرّر کیا ہوا تھا، عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور قرہ مان اوغلو کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کی سرکوبی کے لیے برہان الدّین نے سِیو اس سے قیصریّہ پہنچ کر شہر اور قلعے کا محاصرہ کیا اور انھیں سَر کر کے شیخ مُؤیّد کو قتل کیا۔ چونکہ احمد بیگ اس مہمّ میں برہان الدّین کے ساتھ نہ تھا اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں وہ اس سے علیٰحدہ ہو چکا تھا، لیکن احمد بیگ کا بھائی قرہ یُولُوق، برہان الدّین کے ساتھ تھا (وہی کتاب، ۵۰۶)۔ ۱۳۹۷ء میں بُرہان الدّین نے قرہ یُولُوق عثمان بیگ کو قُوغُونیۂ قرہ حصار (شاہین قرہ حصار [=قرہ حصار شرقی — سامی] کے نواح میں، جو مَلِک احمد کے زیرِ حکومت تھا، ایک قلعے کی تعمیر پر مامور کیا تاکہ اس پر دباؤ ڈالنے کے قابل ہو جائے (وہی کتاب، ص ۵۳۴)۔ ابوبکر طِہرانی لکھتا ہے کہ جب شیخ مُؤیّد نے، جو بُرہان الدّین کا ہمشیرزادہ تھا، قیصریّہ میں بغاوت کی تو بُرہان الدّین نے اس کا محاصرہ کر لیا اور قرہ یُولُوق عثمان بیگ کی سفارش پر اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا، لیکن جب وہ قلعے سے نکل آیا تو برہان الدّین اپنی بات پر قائم نہ رہا اور اُسے قتل کرا دیا، اس واقعے کے بعد قرہ یُولُوق قاضی برہان الدّین سے ناراض ہو کر اس سے علیٰحدہ ہو گیا اور قلعۂ دِیوُرِکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ برہان الدّین نے ایک بڑی جمعیّت کے ساتھ اس کا تعاقب کیا اور [کوہِ] قرہ بیل میں اسے جا لیا، جہاں قرہ یُولُوق نے صرف چھے سو سواروں کی مدد سے اس کے بیس ہزار لشکر کا مقابلہ کر کے اس کو تباہ و برباد کر دیا اور بُرہان الدّین میدانِ جنگ میں کام آیا۔ ابن عرب شاہ (عجائب المقدور، مصر، ۱۲۸۵ھ، ص ۸۳) مؤرّخ، جو اس واقعے کا ہم عصر تھا، لکھتا ہے کہ بُرہان الدّین کے خوف کی وجہ سے قرہ یُولُوق پہلے گھنے جنگلوں میں گھس گیا تھا، لیکن آخرکار سِیو اس کے پاس ایک پہاڑی چراگاہ میں پہنچ گیا۔ جب برہان الدّین کو یہ معلوم ہوا تو وہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ وہاں پہنچا اور قرہ یُولُوق پیچھے ہٹ گیا، لیکن

شام کی تاریکی میں قرہ یُولُوق نے واپس لوٹ کر اور برہان الدّین پر اچانک حملہ کر کے اُسے گرفتار کر لیا۔ قدیم حقوق کی بنا پر قرہ یُولُوق تیار تھا کہ اُسے معافی دے کر آزاد کر دے لیکن عین اسی وقت شیخ نجیب، جو پہلے تُوقات کے قلعے کا حاکم تھا اور جس سے برہان نے یہ قلعہ چھین لیا تھا، وہاں پہنچ گیا۔ نجیب نے قرہ یُولُوق کو برہان الدّین کے قتل کرنے پر آمادہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ شِلٹ برگر (Schildberger)، جسے بِلدِرِم بایزید نے دو سال پہلے نیکبولو (Niğbolu) کی لڑائی میں گرفتار کیا تھا اور جس نے ان واقعات کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اپنے تذکرے میں ان سب کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ برہان الدّین نے ایک بڑی فوج کے ساتھ قرہ یُولُوق عثمان بیگ کا تعاقب کیا، لیکن پہلے اس کا ہراول (دستہ) اور بعد میں اصل فوج تباہ و برباد کر دی گئی۔ وہ فرار ہونے پر مجبور ہوا، لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ قرہ یُولُوق برہان الدّین کو اپنے ساتھ باندھ کر گھسیٹتا ہوا سِیو اس کی دیواروں کے نیچے پہنچا اور محافظین سے مطالبہ کیا کہ شہر اس کے حوالے کر دیں، لیکن باوجود یکہ خود برہان الدّین بھی اس کی تائید کر رہا تھا اہلِ شہر اس بات پر رضامند نہ ہوے۔ اس پر برہان الدّین نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر اس کی جان بخشی کر کے اسے آزاد کر دیا جائے تو وہ قیصریّہ و گردونواح کا علاقہ قرہ یُولُوق کی نذر کرنے کو تیار ہے، لیکن قرہ یُولُوق اس شرط پر راضی نہ ہوا۔ اس نے برہان الدّین کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ لیا، باقی جسم کے چار ٹکڑے کیے، ہر ٹکڑے کو ایک بانس پر آویزاں کر کے یہ بانس شہر کے چاروں دروازوں کے سامنے نصب کر دیے اور اس کے سر کو نیزے پر لگا کر تمام شہر میں تشہیر کرایا (دیکھیے ترجمہ حقّی مخلص، مخطوطات علی اِمیری کتب خانہ)۔ ابن قاضی شُہبَہ: ذیل دُوَل الاسلام [للذّہبی] (مخطوطہ) لکھتا ہے کہ قاضی برہان الدّین جولائی ۱۳۹۸ء میں مارا گیا اور اس کی موت کی خبر اگست میں مصر پہنچی۔ ابن حَجَر کے بیان کے مطابق قرہ یُولُوق چالیس دن تک ایک غار میں چھپا رہا اور اس کے بعد ایک سطحِ مرتفع پر نمودار ہوا، جہاں اس نے برہان الدّین اور اس کے ساتھیوں کو عیش وعشرت میں مشغول پایا اور اچانک حملہ کر کے انھیں مار ڈالا۔ بدرالدّین عینی رقم طراز ہے کہ برہان الدّین قبیلۂ بوزطُغان کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ یہ خبر، جو عینی سے ابن بہادِر تک پہنچی اور جس کی دو روایتوں میں سے ایک کی تصدیق مقریزی نے کی ہے، اس لیے ظہور میں آئی کہ آلِ بوزطُغان ترکمانوں کے ایک بڑے خاندان سے تھے اور ان کے مختلف قبیلے آناطولی میں ہر طرف، یہاں تک کہ شام میں بھی، پھیلے ہوے تھے اور ان میں سے جنوبی آناطولی میں پائے جانے والے بعض قبائل برہان الدّین کا ساتھ چھوڑ کر قرہ یُولُوق سے مل گئے تھے اور جب برہان الدّین کا قتل عمل میں آیا تو وہ قرہ یُولُوق کے ہمراہ تھے۔ ان کے دو سردار سعد المُلک اور ضیاء المُلک بہت پہلے برہان الدّین کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اس روایت نے، جو مذکورہ مآخذ میں موجود ہے، دورِ حاضر کے ایک قابلِ قدر مؤرّخ عبّاس العزّاوی کو اس مغالطے میں ڈال دیا کہ آلِ بوزطُغان قرہ یُولُوق عثمان بیگ کے آبا و اجداد تھے (عبّاس العزّاوی: تاریخ العراق، ص ۳؛ الحکومات التُرکمانیّۃ، ص ۲۰۶)۔

قاضی برہان الدّین کے قتل کے بعد اس کے اعیان و ارکانِ دولت نے اس کے بیٹے علاء الدّین علی چلبی کی حکومت کا اعلان کر کے سِیو اس کو قرہ یُولُوق کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا؛ اس پر قرہ یُولُوق نے شہر کا محاصرہ شروع کر دیا۔ نئے حاکم نے اپنے خسر سے، جو مغل یعنی قرہ تاتار سرداروں میں سے تھا، مدد کی درخواست کی، لیکن قرہ یُولُوق نے ان تمام تاتاری افواج کو جو چلبی کی مدد کو آئیں ہزیمت دے کر بھگا دیا اور پھر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ سیواس چونکہ مقابلے سے عاجز تھے اور ڈرتے تھے کہ ان کے شہر ترکمانوں کے ہاتھ تباہ ہو جائیں گے اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ قرہ یُولُوق جیسے خانہ بدوش سردار کی اطاعت منظور کر لیں، جس کی سخت گیری اور تندی کا انھوں نے اُسی زمانے میں اتنے قریب سے نظارہ کیا تھا، اس لیے انھوں نے عثمانی سلطان بِلدِرِم بایزید کو اپنی حالت سے مطلع کر کے شہر اس کے سپرد کر دینے کی پیشکش کی۔ بایزید نے، جو پہلے آماسِیہ فتح کر چکا تھا، اپنے بڑے بیٹے سلیمان چلبی کو ایک طاقتور فوج کے ساتھ سِیو اس بھیجا۔ اس فوج نے، جس میں شِلٹ برگر (Schildberger) بھی موجود تھا، قرہ یُولُوق کو شکست دی، شہر شہزادے کے حوالے کر دیا گیا اور اس طرح برہان الدّین کے مقبوضات کا ایک اہم حصّہ عثمانیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس اِمارت کی فتح سے ناامید ہو کر قرہ یُولُوق مُطَہَّرتَن کے پاس اِرزِنجان چلا گیا اور اس سے اتّحاد کر لیا۔ مُطَہَّرتَن قرہ قویُنلُو کا حلیف اور آق قویُنلُو کا دشمن تھا۔ اور درحقیقت آق قویُنلُو کے برہان الدّین سے مل جانے کی یہی وجہ تھی، لیکن مُطَہَّرتَن اپنے خوفناک حریف برہان الدّین کے دُور ہو جانے پر اتنا خوش تھا کہ اس نے اپنے سابق دشمن کا خیر مقدم بڑے احترام سے کیا اور اسے عثمانی ترکوں کی افواج کے مقابلے میں، جن کی مشرق یعنی اس کی مملکت کی طرف پیش قدمی کا قوی احتمال تھا، اپنا یار و مددگار بنا لیا۔ قرہ یُولُوق نے، جو اس وقت تک آناطولی میں کوئی اِمارت قائم نہ کر سکا تھا اور اب تک خود اپنے علاقے کے کچھ حصّے کو بھی کھو چکا تھا، ہمّت نہیں ہاری بلکہ اس نے مصری سلطان کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا اور شام کے شمالی حصّے کے بعض اَور تُرکمان سرداروں کی طرح سلطنتِ مصر کی ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ سلطان بَرقُوق نے قرہ یُولُوق جیسے بہادر سردار کی درخواست شکریے کے ساتھ قبول کی اور اُسے ایک امان نامے کے ساتھ پچاس ہزار نقرئی درہم بھجوائے (مَقرِیزی: السُلوک، بذیل وقائع ۸۰۱ھ)۔

لیکن سلطان بَرقُوق کا اس کے جلد ہی بعد انتقال ہو گیا اور اُس کے کمسن لڑکے فَرَج کے تخت نشین ہونے پر سلطنتِ مصر میں فسادات رونما ہو گئے۔ ادھر بِلدِرِم بایزید نے آناطولی کے اُن شہروں پر جو مصریوں کے پاس تھے قبضہ کر لیا اور شام پر حملے کی تیّاری شروع کر دی۔ اس طرح سلطنتِ مصر کی ملازمت سے قرہ یُولُوق نے جو امیدیں لگائی تھیں اُن پر پانی پھر گیا اور اس نے کہیں اَور قسمت

آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اس نے پھر مُطَہَّرتَنْ سے رجوع کیا، جو بہت پہلے سے، یعنی ۱۳۸۹ء میں، تیمور سے عرضِ اطاعت کر چکا تھا اور بعد ازاں ۱۳۹۴ء میں بذاتِ خود اس کی خدمت میں پیش ہو کر اور عرضِ تعظیمات وعبودیت کے بعد اس سے منشور اور خلعت پا چکا تھا، اس کی وساطت سے ۱۳۹۹ء کے آخر میں قرہ یُولُوق تیمور کی خدمت میں، جو اس وقت قرہ باغ میں موسمِ سرما گزار رہا تھا، حاضر ہوا اور اپنے قبیلے سمیت اس کی اطاعت قبول کی۔ تیمور نے آق قویُنلُو کی اطاعت خوشی سے قبول کی، اس لیے کہ یہ لوگ قرہ قویُنلُو کے، جو ہر طرف اس کی مخالفت اور مقاومت کر رہے تھے، جانی دشمن تھے؛ چنانچہ اس نے قرہ یُولُوق کا تحائف، اعزازات اور وعدوں سے خیر مقدم کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد جب تیمور گُرجستان کی مہمّ سے لوٹ رہا تھا اور مُطَہَّرتَنْ اظہارِ عقیدت کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو قرہ یُولُوق بھی اس کے ساتھ تھا (۱۴۰۰ء)۔ اسی سال جب تیمور پہلی مرتبہ آناطولی میں داخل ہوا تو قرہ یُولُوق اپنے تمام قبیلے سمیت آوُنیک [رک بآں] کے مقام پر اس کے ساتھ شامل ہو کر اکرام والتفات سے سرفراز ہوا اور ہراول کے فرائض انجام دیے (ابوبکر طِہرانی: دیار بکریّہ؛ حافظ اَبرُو: زُبدۃ التواریخ)۔ قرہ یُولُوق نے جاہ اور امارت کے لالچ میں اپنے ملک وملّت سے دغا کی، دشمن کے ہراول میں شامل ہوا اور سیواس کے محاصرے میں، شہر کے سَر کرنے اور سپاہیوں کے قتلِ عام میں بھی پیش پیش رہا اور اس کے بعد اِلبِستان اور مَلَطِیّہ کی فتح کے وقت بھی تیمور کے ساتھ موجود تھا۔ تیمور نے عثمانی ترکوں کے ہاتھ سے مَلَطِیّہ چھین کر قرہ یُولُوق کو بخش دیا (شرف الدّین: ظفر نامہ، ۲: ۲۷۳)۔ جب تیمور شام میں داخل ہوا تو قرہ یُولُوق اور اس کے بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ ابوبکر طِہرانی رقم طراز ہے کہ تیمور قرہ یُولُوق کے بیٹے ابراہیم بیگ کی فوق العادت بہادری اور فداکاری سے، جو اس نے حَلَب کے سامنے لڑائی میں دکھائی، بہت خوش ہوا اور شہرِ آمِد، جسے اس نے مَلِک ظاہر مجدالدّین عیسٰی اَرتُقی سے ۱۳۹۶ء میں فتح کیا تھا، اسے انعام میں بخشا۔ یہی مصنّف بیان کرتا ہے کہ قرہ یُولُوق دمشق (شام) کی لڑائی میں بھی شریک ہوا اور اس نے بڑی بہادری وشجاعت کا مظاہرہ کیا۔

حافظ اَبرُو اور شرف الدّین یَزدِی، دونوں مؤرّخ جنھوں نے تیمور کی اس مہمّ کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، مذکورہ واقعات کے متعلّق خاموش ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ شام سے واپسی پر تیمور عراق جاتے ہوئے بِرجیک (Birecik) [یزدی (۲: ۳۵۰): بیرہ] پہنچا اور قرہ یُولُوق اس کے استقبال کو آیا اور مورِدِ التفات ہوا تو تیمور نے اسے اپنے ساتھ لے لیا اور دونوں ماردِین گئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد تیمور خود تو بغداد چلا گیا اور قرہ یُولُوق کو، جس کا مرکزِ امارت وہاں سے بہت قریب تھا، محاصرے پر چھوڑ گیا (حافظ اَبرُو: زُبدۃ التواریخ، بذیل وقائع ۸۰۳ھ؛ شرف الدّین: ظفر نامہ، ۲: ۳۵۰-۳۵۴)۔ ابن عرب شاہ کا بیان ہے کہ اپریل ۱۴۰۱ء میں قرہ یُولُوق کو آمِد کی سمت روانہ کر کے تیمور ماردِین سے چلا گیا اور موصل کو فتح کر کے حسین بیگ بن یار حسن یا قرہ حسن بن حسین بیگ (دیکھیے اوپر) کو وہاں مقرّر کر دیا (ص ۱۲۳ببعد)۔ بعینہٖ یہی معلومات درج کر کے ابوبکر طِہرانی لکھتا ہے کہ اس کے بعد تیمور عراق گیا اور بغداد کو تاراج کیا۔ اس اثنا میں قرہ یُولُوق ماردِین کے محاصرے میں مشغول تھا۔ اس نے وہاں کے حاکم کو شکست دی اور اسے ایک اَور قلعہ دے کر صلح پر مجبور کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی گرمائی قیام گاہ کی طرف چلا گیا اور اپنے بیٹے ابراہیم بیگ کو حِصْن کِیفَا کی طرف روانہ کیا، جسے اس نے تاراج کر کے برباد کر دیا اور وہاں کے حاکم ملک عادل عَلَم الدّین سلیمان ایّوبی کو اطاعت پر مجبور کر کے اس سے خراج ادا کرنے اور سپاہ مہیّا کرنے کا عہد لیا۔ قرہ یُولُوق نے موسمِ سرما رأس العین میں گزارا اور پھر کُرد قبیلوں ــ سلیمانی اور زَرزَقی ــ پر حملہ آور ہو کر ان کے بعض قلعوں پر قبضہ کیا۔

آناطولی میں تیمور کی دوسری بڑی مہمّ کے دوران میں (۱۴۰۲ء) قرہ یُولُوق اور اس کے بڑے بھائی احمد اور پیر علی بیگ اس کی فوج میں شامل تھے۔ حافظ اَبرُو کا بیان ہے کہ اَنقرہ کی لڑائی میں، جو تیمور اور بایزید کے درمیان ہوئی، قرہ یُولُوق مرکزی دستے [قول] کے بائیں بازو میں تھا، جو خود تیمور کی قیادت میں تھا۔ اس کے برخلاف شرف الدّین لکھتا ہے کہ وہ دائیں بازو کے پیچھے امیرزادۂ ابوبکر اور جہان شاہ کے ساتھ متعیّن تھا (۲: ۴۲۴) اور حملہ کر کے اس نے آلِ عثمان کا بایاں پہلو درہم برہم کر دیا (۲: ۴۳۰)۔ عبدالرّزّاق سمرقندی (مطلع سعدین، کتب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۰۸۶) لڑائی میں قرہ یُولُوق کی متعیّنہ جگہ کا مبہم الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کا بیان ہے کہ اس نے جہان شاہ کی مَعِیَّت میں عثمانی فوج کے دائیں بازو پر، جو سلیمان چلبی کی قیادت میں تھا، حملہ کر کے اسے منتشر کر دیا۔ تیمور نے اَنقرہ کی فتح اور تمام آناطولی کے علاقے پر قبضہ کر کے اسے تاخت وتاراج کرنے کے بعد موسمِ سرما اسی جگہ بسر کیا۔ قرہ یُولُوق اور اُس کے بڑے بھائیوں نے بھی جاڑا یہیں گزارا۔ موسمِ بہار کے آنے پر امیر تیمور نے آناطولی سے لوٹا ہوا مال ودولت سمیٹ کر اس کا ایک حصّہ مشرق کی طرف روانہ کیا، لیکن عثمان بیگ کے بھتیجوں، محمّد بن احمد اور پیلتن بن پیر علی، نے اپنے ساتھ کے آق قویُنلُو کے ہمراہ اس قافلے سے آگے نکل کر تمام مال ودولت پر قبضہ کر لیا۔ یہ سنتے ہی تیمور نے احمد اور پیر علی کو، جو لٹیروں کے والد تھے، قید کر لیا۔ چونکہ اس کے بعد ان دونوں کا کوئی ذکر نہیں آتا اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیمور نے انھیں پھر رہا نہیں کیا (ابوبکر طِہرانی: دیارِ بکریّہ)۔ ۱۴۰۳ء میں امیر تیمور آناطولی سے رخصت ہوا اور جب وہ سیواس پہنچا تو اس نے قرہ یُولُوق کو اعزاز وخلعت دے کر دیارِ بکر کے تمام علاقے کی امارت کا منشور عطا کیا اور اسے اپنے وطن جانے کی اجازت بخشی۔ ابن عرب شاہ لکھتا ہے کہ امیر تیمور نے یہ منشور اور اذنِ اِرزِنجان میں دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ایک آدمی شمس الدّین کو کماخ کا قلعہ دار بنایا اور دونوں کو تنبیہ کی کہ ایک دوسرے کی امداد واعانت کرتے رہیں (شرف الدّین، ۲: ۵۰۶ببعد؛ ابن عرب شاہ، ص ۱۴۹)۔ قرہ یُولُوق عثمان بیگ جب تیمور سے

جدا ہوا تو اس نے آناطولی سے فراہم کیا ہوا تمام مالِ غنیمت اپنے بیٹے ابراہیم کے ساتھ آگے آمد روانہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بھتیجے محمّد نے، جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا، اس پر حملہ کر کے اس سے مال چھین لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ محمّد اور ابراہیم کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی، لیکن قرہ یُولُوق کی آمد پر محمّد مجبوراً بھاگ گیا اور مالِ غنیمت صحیح و سالم آمِد پہنچ گیا۔ ۱۴۰۳ء میں قرہ یُولُوق عثمان بیگ آمِد پہنچا اور آق قویُونلُو کی ان سب جماعتوں کو بھی جو اب تک اس کے بڑے بھائیوں کے زیرِ فرمان تھیں اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح اس نے آق قویُونلُو سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو آمِد میں قائم ہو کر دیارِ بکر اور الجزیرہ، تمام مشرقی آناطولی، پھر عراقِ عرب و عجم اور خراسان کو چھوڑ کر ایران میں بھی ہر طرف حکمران ہو گئی اور جس نے ایک چھوٹی سی شہنشاہیت (امپراطوریہ) کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سلطنت، جس میں تقریباً ہمیشہ ہی اندرونی جھگڑے اور مناقشات ہوتے رہے، ۱۵۰۸ء تک قائم رہی اور آخر شاہ اسمٰعیل [صفوی] کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔

مغلوں کے عروج نے اس تمدّن اور نظامِ اجتماع کو برباد کر دیا جس کی بنیاد روما اور ایران کی سلطنتوں نے رکھی تھی اور جسے اسلام نے مزید تقویت اور ترقّی دی تھی۔ اس عروج کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ شہروں کی آبادی کمزور اور باہمی جنگ و جدال میں گرفتار ہو گئی اور خانہ بدوش عناصر زور پکڑ گئے؛ چنانچہ یہ اجتماعی بیماری، جو ہمیں پورے ایشیا میں، مصر اور شام کو کسی حد تک مستثنیٰ کرتے ہوئے، نظر آتی تھی، اب آناطولی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے گرد و پیش لٹیروں کے جتھے جمع کرنے والے رئیس اور صاحبِ خاندان بک، سب کے سب اپنے ساتھیوں کی گزر اوقات کی خاطر اور اپنے لیے کوئی اِمارت حاصل کرنے کی غرض سے، ہر طرف قتل و غارت میں مشغول رہتے تھے، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے اور کبھی موجودہ سلطنتوں کے معاون اور کبھی اجیر ملازم بن جاتے، گویا اُس زمانے کے یورپی ماجراجُو سپاہیوں کے سرخیلوں (condottiere) کی طرح اُن کی گزرِ اوقات محض جنگ پر تھی اور فتح مند فوجوں کے ہراول بن کر جس ملک میں جاتے تھے وہاں تباہی اور بربادی مچا دیتے تھے۔ ان رئیسوں اور بکوں کے دَورِ عمل میں—جو ایک دن کے معاہدے کو دوسرے دن توڑ دیتے تھے، جس حکمران یا بک کے ساتھ اس کی خدمت یا اشتراک کا عہد کرتے اسے دھوکا دیتے اور کسی عہد یا معاہدے کے پابند نہ رہتے تھے، وطن، قوم، جمعیّت اور خاندان کی طرح کی تمام قیدوں سے آزاد تھے، انسانیّت کے سب قاعدوں سے بیگانہ تھے، جن میں سپاہ گری اور تہوّرِ جنگی کے علاوہ کوئی خوبی نہ تھی، جو صرف لوٹ مار، تخریب، مالِ غنیمت یا محض اپنی کامیابی کی فکر میں رہتے تھے— پورے ایشیا کی طرح آناطولی بھی تباہ ہو گیا۔

اسی قسم کے بکوں میں ایک قرہ یُولُوق عثمان بیگ بھی تھا، جو اُن ٹیڑھے اور خراب راستوں سے گزر کر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، آخر امارت اور حکمرانی کے منصب کو پہنچ گیا اور جس نے اپنی وفات (۱۴۳۵ء) تک پوری زندگی جنگوں ہی میں گزار دی۔ اگرچہ وہ تیمور اور اس کے بعد شاہ رُخ کا اقتدار تسلیم کرتا رہا، تاہم اس نے عثمانی سلاطین سے برابر دوستانہ تعلّقات قائم رکھے، بلکہ ایک معیّنہ رقم اور تحائف کے عوض اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ عثمانی علاقے میں لوٹ مار نہیں کرے گا۔ اسی زمانے میں مصر کے ساتھ بھی اس کے تعلّقات خوشگوار تھے۔ وہ سلطان فَرَج اور مؤیّد شاہ کا دوست تھا اور ابتداءً بَرْسْبای [ملک اشرف] سے بھی اس کے تعلّقات اچھے تھے، لیکن چونکہ قرہ یُولُوق نے مصری حکومت کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا تھا، اس لیے سلطان اس کا دشمن ہو گیا۔ اگرچہ وہ مَلَطِیّہ پر، جو تیمور نے اسے دیا تھا، قبضہ حاصل نہ کر سکا اور جب مصریوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو وہ چُوں نہ کر سکا، تاہم اس نے دوسرے ممالک میں منظّم طریقے پر تاخت و تاراج جاری رکھی اور اُورفہ قبیلۂ دورگر سے، بمکاخ شمس الدّین سے، جسے تیمور نے اس کا محافظ بنایا تھا، اِرزِنجان مُطَہَّرتن کے پوتے یار علی سے، چمِش گزنگ پیر حسین بیگ سے، خَرْپُوت ذوالقدر اوغلو سے، اِرضُ روم قرہ قویُونلُو کے والی پیر احمد بیگ طخارلو سے اور ماردِین، جسے آخری اَرتُق شہزادے ملک صالح احمد نے قرہ قویُونلُو ئی سردار قرہ یوسف کو دے دیا تھا، بہت طویل جنگ کے بعد آخر کار ۱۴۳۲ء میں نصیر الدّین سے چھین لیا (نصیر الدّین کو قرہ قویُونلُو نے اس شہر کا محافظ مقرّر کیا تھا)۔ اسی اثنا میں اُس نے کُردوں پر متعدّد دفعہ یورش کر کے ان میں سے بعض کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے قلعوں اور چُورُخ [چوروک صو] کے طاس کو مکمّل طور پر فتح کر کے اپنی سلطنت کی حدود کو اُورفہ کے جنوب تک، جو طُرَبْزُون کی سلطنت کے علاقے میں شامل تھا، وسعت دے دی اور بعض عرب قبائل کو بھی زیر کر لیا۔ ان فتوحات کے دوران میں قرہ یُولُوق کو متعدّد بار اپنے سے زیادہ خوفناک، جنگجو اور غارت گر قرہ قویُونلُو ئی سردار قرہ یوسف [رَكّ بآن] اور بعد ازاں اُس کے بیٹے اسکندر بیگ [رَكّ بآن] سے جنگ کرنا پڑی اور ان تمام جنگوں میں اسے زیادہ تر ہزیمت ہوئی اور بہت نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس شخص نے، جو مصر کے امرا میں سے تھا اور جس کا مرکزِ حکومت حَلَب تھا شمالی شام میں اپنی آزادی کا اعلان کر کے ترکمان بکوں میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ پھر ماردِین کے حاکم ملک ظاہر مجدالدّین عیسٰی سے اتّحاد کر کے آمِد پہنچا۔ اس شہر کے محاصرہ کرنے والے (کُشاتن) امیر چکم (یا چکم) کو اور حاکمِ ماردِین کو مغلوب کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ پھر وہ ۱۴۲۱ء میں قرہ قویُونلُو کے خلاف شاہ رخ کی پہلی مہمّ میں شریک ہوا اور اس نے اسکندر بیگ اور قرہ یوسف کے دوسرے بیٹوں کے خلاف آلشکرد (Alşkerd) [ولایت اِرضُ روم] کی لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ ۱۴۲۹ء میں شاہ رُخ کی دوسری مہمّ میں بھی وہ اس کے ہمراہ تھا اور اس نے اسکندر کے خلاف میدانِ سلماس کی لڑائی میں حصّہ لیا۔ ۱۴۳۵ء میں جب شاہ رُخ تیسری دفعہ آذربیجان میں داخل ہوا اور اسکندر اس سے خائف ہو کر بھاگا تو قرہ یُولُوق نے اسکندر کا راستہ روک لیا؛ لیکن جب لڑائی ہوئی تو وہ اپنے دو بیٹوں اور کئی ایک پوتوں سمیت لڑائی میں کام آیا اور

اسکندر نے اس کا سر کاٹ کر سلطانِ مصر بَرْسبَای [ملک اشرف] کے پاس بھیج دیا اور قاہرہ میں اس سر کی تشہیر کی گئی۔ ابوبکر طِہرانی کے بیان کے مطابق قرہ یُولُوق نے تین سولڑائیوں میں حصّہ لیا۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے کا بلکہ ہر زمانے کا بہادر ترین اور بہترین سپاہی تھا۔ اس کے چودہ بیٹوں میں سے، جن کے نام ہمیں معلوم ہیں، ابراہیم اس وقت مارا گیا جب امیر چکِم نے آمِد کا محاصرہ کیا (۱۴۰۷ء)؛ مُراد اُس وقت جب سلطان بَرْسبَای [زامباور، ص ۱۰۵] نے ۱۴۳۳ء میں آمِد کا محاصرہ کیا؛ ہابیل کو مصریوں نے اس وقت گرفتار کر لیا جب (۱۴۲۹ء میں) انھوں نے اورفہ پر [جو ولایتِ حَلَب میں ہے] قبضہ کیا۔ وہ اسے قاہرہ لے گئے، جہاں وہ اگلے سال قید ہی میں مر گیا۔ باقی ماندہ بیٹوں میں سے دو اس کے ساتھ ہی مارے گئے۔ جب قرہ یُولُوق نے اسّی سال سے زیادہ کی عمر میں انتقال کیا تو اس کے جو بیٹے زندہ تھے ان میں سے ہر ایک اس کے علاقے کے ایک نہ ایک حصّے کا حاکم تھا۔ شاہ رُخ نے ان میں سے اُس کے ولی عہد علی بیگ کو اس کے والد کی جگہ اِمارت کے اعزازی نشانات بھیجے۔ اسی زمانے میں سلطانِ مصر نے بھی اسے منشور اور خلعت بھیجا لیکن علی بیگ [رَئِ بآن] کی امارت کا مختصر زمانہ پریشانی ہی میں گزرا۔ ایک طرف تو وہ قرہ قُویُنلُو کے حملوں کی روک تھام کی کوشش کرتا رہا اور دوسری طرف اپنے بھائی حمزہ بیگ حاکمِ ماردِین کے خلاف مسلسل جنگ کرنے پر مجبور ہوا اور اس طرح وہ اپنی امارت میں آرام وسکون سے نہ بیٹھ سکا، بلکہ پہلے اس نے عثمانی سلطان مراد ثانی اور بعد ازاں سلطانِ مصر چقماق کی پناہ ڈھونڈی اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ چونکہ اسے مطلوبہ مدد نہ مل سکی اس لیے وہ اپنے ملک کو واپس نہ جا سکا اور اپنی وفات تک شام ہی میں مقیم رہا۔ اس طرح آق قُویُنلُو کی اِمارت حمزہ بیگ [رَئِ بآن] ہی کے ہاتھ میں رہی۔ حمزہ نے اپنے باپ کے اکثر مقبوضات پر قبضہ جما لیا۔ آمِد کو علی بیگ سے اور اِرزِنجان کو اپنے دوسرے بھائی یعقوب بیگ سے حاصل کیا۔ اور اِصفہان بن قرہ یوسف حاکم قرہ قویُنلُو سے بھی کامیاب جنگ کی۔ اس طرح تمام بھائی اور بھتیجے اس کی اطاعت پر مجبور ہو گئے اور اسے سلطانِ مصر کی طرف سے خلعت ومنشور عطا ہوے۔ ۱۴۴۴ء میں حمزہ بیگ کی وفات پر علی بیگ کا بیٹا جہانگیر اورفہ سے، جہاں وہ پہلے سے حاکم تھا، آیا اور چچا کے مقبوضات پر تسلّط جما لیا، لیکن جہانگیر [رَئِ بآن] کو بھی اپنے باپ کی طرح ایک طرف قرہ قویُنلُو اور خصوصاً ان کے سردار جہان شاہ [رَئِ بآن] اور دوسری طرف اپنے تین چچاؤں، محمود، شیخ حسن اور قاسم بیگ اور چچازاد بھائیوں سے جنگ کرنا پڑی۔ اُس نے پوری کوشش کی کہ جن سرزمینوں پر اُس کے دادا قرہ یُولُوق نے حکومت کی تھی انھیں یکجا کرے لیکن اس کے چھوٹے بھائی اوزون حسن [رَئِ بآن] نے، جو اب تک ہمیشہ اس کی مدد کرتا تھا اور اس کی کامیابیوں میں شریکِ کار تھا، ۱۴۵۲ء (یا بعض روایتوں کے مطابق ۱۴۵۳ء) میں اچانک حملہ کر کے آمِد پر قبضہ کر لیا۔ وہ عرصۂ دراز تک اپنے بھائی جہانگیر اور اُویس بیگ سے برسرِ پیکار رہا اور انھیں کئی موقعوں پر شکست دی۔ جب قرہ قویُنلُو کے حاکم جہان شاہ نے رُستم تُرخان اور علی شُکُر بیگ کی قیادت میں اس کے بھائیوں کی مدد کے لیے فوج بھیجی۔ تو اوزون حسن نے ان کی فوجوں کو شکست فاش دے کر پراگندہ کر دیا (۱۴۵۷ء) اور اپنے بھائیوں کو مصالحت یا اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ ۱۴۵۷ء میں اوزون حسن نے حِصْن کَیْفا کے آخری ایّوبی حاکم کا خاتمہ کر دیا اور ۱۴۵۸ء میں اس نے ذوالقَدِر اُوغلو آرْسْلان بیگ کو قرہ مان اوغلو کے علاقوں پر حملہ کرنے سے روک کر واپس جانے پر مجبور کیا۔ ۱۴۵۹ء میں اس نے گُرجستان میں داخل ہو کر چھے قلعوں پر قبضہ کیا اور حاکمانِ اِگِل (Egil) کی اِمارت کو، جو اپنے آپ کو سلجوقی نسل سے ظاہر کرتے تھے اور عرصے سے حاکم چلے آتے تھے، ضبط کر لیا (۱۴۶۰ء)۔ اس نے شاہین قرہ حصار پر بھی قبضہ کر لیا، جو پہلے آق قویُنلُو کے پاس تھا اور جس پر قرہ یُولُوق کی وفات کے بعد فتنہ وفساد سے فائدہ اٹھا کر قرہ قویُنلُو قابض ہو گئے تھے اور جو قلعوں اور کچھ شہروں پر مشتمل ایک مستقل امارت کا مرکز تھا۔ ۱۴۶۱ء میں اس نے قویُنلُو حصار (قَوْیُل حصار [دیکھیے سامی، ۵:۳۸۷۷]) پر قبضہ کر کے عثمانی علاقے میں یورشیں کیں۔ علاوہ ازیں اس نے سلطان محمّد کی طُرَبُزون کو فتح کرنے کی تیّاریوں کو روکنا چاہا (دیکھیے گِدِک Gedik احمد) لیکن جب اس کی فوج کو شکست ہوئی تو اس نے صلح کی درخواست کی۔ ۱۴۶۲ء میں اس نے گُرجستان کی دوسری مہم کا آغاز کیا اور اکثر جگہ کامیاب رہا۔ ۱۴۶۳ء میں اس نے قلعہ گِرگِر پر [جو اِرّان کے قریب، مَلَطِیّہ اور آمِد کے درمیان واقع ہے] قبضہ کیا اور ۱۴۶۴ء میں قرہ مان اوغلو اسحٰق بیگ کی مدد کی اور اس کے بھائیوں کو نکال کر حکومت پر اس کا تسلّط قائم کیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد سلطان محمّد ثانی کی فوجوں نے اسحٰق بیگ کو نکال باہر کیا اور اس کی جگہ اس کے حریف پیر احمد بیگ کو قرہ مان کی حکومت دلائی۔ اس کے بعد ۱۴۶۵ء میں اوزون حسن نے ذوالقَدِر اوغلو آرسلان بیگ سے خَرْپُوت چھین لیا اور اسے مکمّل شکست دے کر اس کے دارالحکومت اِلْبِسْتان تک اس کا تعاقب کیا، حتّٰی کہ وہ صلح طلب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۴۶۷ء میں اوزون حسن نے حاکمِ قرہ قویُنلُو ئی جہان شاہ کو، جو ایران (ماسوائے خراسان)، عراق عرب، بلکہ اِرّان اور آناطولی کے انتہائی مشرقی حصّے (جھیل وان کی وادی) پر بھی حکمران تھا، شکست دے کر برباد کر دیا۔ ۱۴۶۸ء میں جہان شاہ کے بیٹے حسن علی کا بھی یہی حشر کیا اور ۱۴۶۹ء میں سلطان ابوسعید حاکم ماوراء النہر اور خراسان کو ہزیمت دے کر قتل کیا۔ ۱۴۷۰ء میں خراسان میں فوج بھیج کر یادگار مرزا کو وہاں کا حاکم مقرّر کیا اور آق قویُنلُو خاندان کے مؤرّخ ابوبکر طِہرانی کے قول کے مطابق اُسے ایک اِمارت کا منشور دیا۔ اسی سال اُس نے جہان شاہ کے بیٹوں کو ایک ایک کر کے پراگندہ کیا اور قرہ قویُنلُو کے تمام علاقے پر قابض ہو گیا۔ اُس کے بعد ۱۴۷۱ء میں اُس نے سلطان حسین بایقرا سے، جو یادگار مرزا کی جگہ خراسان کا حاکم بن گیا تھا، صلح کر لی اور مشرقی ممالک پر حملے کا خیال ترک کر دیا۔ اوزون حسن نے ہزار دِگز کے جنوب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی اپنی اطاعت پر مجبور کیا اور قرہ قویُنلُو کی تابع بہت

سی امارتوں سے بھی اپنی سیادت تسلیم کرائی۔ اس طرح اوزون حسن نے ایک ہی وار میں تمام دولتِ قرہ قویُنلُو کو تباہ کر دیا اور ساتھ ہی قرہ قویُنلُو قوم (اولوس) کی تباہی کا باعث بھی ہوا، کیونکہ اُن قبائل یا خانوادوں میں سے جو قرہ قویُنلُو سے وابستہ تھے بیشتر آق قویُنلُو میں آ ملے، اس طرح اُس نے بہت بڑی طاقت پیدا کر لی اور اُس کے دماغ میں تمام دنیا کو مسخّر کرنے کا خبط سمایا، چنانچہ وہ سلطانِ مصر اور سلطنتِ عثمانیہ کے علاقوں کو قبضے میں لانے کے منصوبے بنانے لگا اور آتشیں اسلحہ کے حصول کے لیے [جنھیں مصری مملوک اور عثمانی ترک اس زمانے میں استعمال کرتے تھے] اس نے یورپ کی سلطنتوں سے تعلّقات قائم کیے۔ ایک ہی سال کے اندر اس نے گُرجستان میں فوجیں بھیجیں اور ایک طرف تو مصری اور عثمانی سلطانوں سے دوستی قائم کی اور دوسری طرف ان دونوں سلطانوں کے خلاف مہمّ تیار کرنے کی فکر میں رہا۔ ۱۴۷۲ء میں اوزون حسن نے پیر احمد اور قاسم بیگ کی، جنھوں نے اس کے پاس پناہ لی تھی، حمایت کی اور ان کے ساتھ مل کر عثمانی علاقے میں فوجیں بھیج دیں۔ اس نے تُوقات [تُوقاد، ولایت سِیواس میں] کے شہر کو تباہ کرا دیا لیکن بالآخر ان فوجوں کو شکست ہوئی۔ اسی سال ۱۴۷۲ء میں وہ گُرجستان کی تیسری مہمّ پر گیا۔ تِفلِس میں داخل ہونے کے لیے کئی ایک شہر فتح کیے اور گُرجی شہزادوں کو اطاعت پر مجبور کیا۔ لیکن اسی سال اسے شام کی مہمّ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۱۴۷۳ء میں اوتلوک بیلی کے مقام پر اس کا مقابلہ محمّد ثانی سے ہوا، لیکن اس لڑائی میں اُسے متعدّد قلعوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ۱۴۷۶ء میں وہ چوتھی دفعہ گُرجستان پر حملہ آور ہوا اور بالآخر ۱۴۷۸ء کے اوائل میں تبریز کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اوزون حسن کا شمار پندرھویں صدی کے عظیم ترین فاتح حاکموں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنے دارالخلافہ کو آمِد سے تبریز میں منتقل کر دیا اور اس کے بعد آق قویُنلُو اولوس سے اور ملحقہ بہت سے قبائل اور خاندانوں کو آناطولی سے نکال کر اپنی وسیع سلطنت کے مختلف علاقوں میں جاگیریں دے کر آباد کیا اور اس طرح وہ مشرقی آناطولی میں ترکی عنصر کے کمزور ہو جانے کا باعث ہوا۔

اس نے تبریز میں ایک عظیم الشّان محلّ سرا ('سرای') تعمیر کی۔ اپنے گرد علما وفضلا وشعرا کا حلقہ جمع کیا اور اس طرح آق قویُنلُو کو، جو اس وقت تک تہذیب و تمدّن سے برائے نام آشنا تھے، مہذّب بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کئی مذہبی، علمی اور خیراتی ادارے بھی قائم کیے اور دولتِ عثمانیہ کے نمونے پر اپنی حکومت کی تنظیم وتشکیل کی سعی کی۔ اُس نے دوسری زبانوں کی بہت سی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا؛ چنانچہ وہ قرآن مجید کو بھی ترکی زبان میں منتقل کرا کے اسے اپنے سامنے پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اوزون حسن کا شمار اُن ترک حکّام میں ہے جو سب سے زیادہ شایانِ توجہّ ہیں لیکن اس عظیم الشّان سلطنت کی تعمیر کمزور بنیادوں پر ہوئی تھی؛ اس لیے کہ، جیسے اَور سب ترک سلطنتوں میں ہوا، سلطنت کی وراثت کسی قانون یا عرف یعنی (رواج ودستور) سے وابستہ نہ تھی۔ جو ادارے اس نے بنائے ان کا کوئی مرکز نہ تھا۔ سلطنت کے ہر حصّے میں جو شہزادے یا شاہی خاندان سے منسوب لوگ تھے وہ بادشاہ کے حقوق کو تسلیم نہ کرتے تھے اور اُن قبیلوں اور خاندانوں کے بک جو آق قویُنلُو اولُوس میں شامل تھے اپنے اپنے قبیلے اور خاندان کے ساتھ دور دراز اضلاع میں آباد ہو کر موروثی اور نیم خودمختار حاکم بن بیٹھے تھے۔ غرض یہ سلطنت دراصل قبیلوں اور خاندانوں کی سلطنت تھی، چنانچہ اس سلطنت کی حکومت کے حصول کے لیے شہزادے اور اُن شہزادوں کے طرفدار بک برابر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے اور اس طرح بہت ہی تھوڑے عرصے میں یہ سلطنت برباد ہو کر ختم ہو گئی۔

اوزون حسن کے بیٹوں میں سے اوغورلُو محمّد تو باپ کی موت سے ذرا پہلے مارا جا چکا تھا؛ زمامِ حکومت باقی ماندہ چھے لڑکوں میں سے سلطان خلیل [رک بآن] کے ہاتھ آئی۔ سلطان خلیل نے اپنی حکومت کی ابتدا اپنے بھائی مقصود بیگ کے قتل سے کی۔ وہ اپنے چچا جہانگیر کے بیٹوں، مراد اور ابراہیم بیگ، کی بغاوت فرو کرنے میں تو کامیاب رہا لیکن اسی سال اپنے بھائی سلطان یعقوب والی دیارِ بکر کے ہاتھوں قتل ہوا۔ سلطان یعقوب [رک بآن] نے سلطان ہونے کے بعد پہلے ہی سال اپنے بھتیجے الوند بیگ بن خلیل اور قرہ یُولُوق کے پوتے کورسہ حاجی بیگ بن شیخ حسن کی بغاوتوں کو فرو کیا اور ۱۴۸۰ء میں ایک فوج بایندر بیگ، سُلیمان بیگ بچن اور صوفی خلیل بیگ مُوصُلُّو کی زیرِ قیادت سلطان مصر قایت بای کی فوجوں کے خلاف، جن کی قیادت یَش بیگ کر رہا تھا، روانہ کی اور اس فوج نے مصری فوج کو شکست دی۔ ۱۴۸۱ء میں بایندر بیگ نے بغاوت کی لیکن شکست کھا کر مارا گیا۔ ۱۴۸۲ء میں یعقوب گُرجستان میں داخل ہوا اور بہت سے شہروں اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جن میں سے آقسُقہ [رک بہ آخسُخہ] خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے بعد کے چند سال اس نے عمارتوں کی تعمیر اور علما وشعرا کی مصاحبت میں صرف کیے۔ وہ خود ترکی اور فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا۔ ۱۴۸۸ء میں اُس کے باج گزار شِرْوَان شاہ (فرّخ یسار) نے اُس سے مدد کی درخواست کی تو اُس نے سلیمان بچن کے زیرِ قیادت ایک فوج روانہ کی، جس نے شیخ حیدر صَفَوِی والی اردبیل کو قتل کیا۔ ۱۴۹۰ء میں وہ خود جوان عمر میں راہی ملکِ عدم ہوا۔ سلطان ابوسعید کی وفات پر اس سے پہلے کی ایلخانی سلطنت کا جو حشر ہوا تھا عین اسی طرح یعقوب کی وفات پر سلطنت آق قویُنلُو ئی بھی ایک زبردست بُحران اور انتشار کے دور سے گزری اور ۱۸ سال بعد بالکل ختم ہو گئی۔

سلطان یعقوب کی وفات پر صوفی خلیل اور قبیلۂ مُوصُلُّو کے دوسرے سرداروں اور پُرناک قبیلوں کے سرداروں نے اس کے تین نابالغ بیٹوں میں سے بایسُنغُر کو تخت پر بٹھا دیا۔ دوسرے قبائلی حاکموں نے اپنی اپنی جگہ اس کے دوسرے بیٹوں میں سے کسی نہ کسی کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ لیکن ان شہزادوں اور ان کے حمایتیوں کو دبا دیا گیا۔ نابالغ حاکم کے (اتابیگ یا) اتالیق صوفی خلیل نے چند شہزادوں اور امرا کو، جنھیں وہ اپنا رقیب سمجھتا تھا، مروا ڈالا اور اس طرح کل ریاست کا مالک بن بیٹھا۔ لیکن جن امرا کو اس نے اپنے تحکّم وتکبّر سے ناراض کر دیا

تھا ان میں اکثر دیارِ بکر کے حاکم سُلیمان بچن سے مل گئے اور انھوں نے خلیل کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ اب سُلیمان اتالیق کی حیثیت سے حکمرانِ سلطنت بن گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چند امرا رستم بن مقصود بن اوزون حسن کے طرفدار ہو گئے، جو اَلَنجق [یا اَلُنجق، موجودہ تلفّظ اِلنجہ، آذربیجان میں نخچوان کے قریب] کے قلعے میں قید تھا۔ انھوں نے اس کی حکومت کا اعلان کر کے سُلیمان اور بایسُنغُر کو مغلوب کر لیا۔ بایسُنغُر نے اپنے بھائیوں سمیت اپنے نانا شِرْوَان شاہ فرخ یسار کے پاس پناہ لی۔ سلیمان شاہ دیاربکر کی طرف چلا گیا، جہاں وہ مارا گیا۔ بایسُنغُر کی سلطنت صرف ایک سال رہی۔

۱۴۹۲ء میں رُستم بیگ [رَسْتَم بآن] سلطان بنا، لیکن اس کی پنج سالہ حکومت کا زمانہ فساد و انتشار میں گزرا۔ بایسُنغُر نے اپنے بھائی حسن کی مدد سے دوبارہ حکومت لینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ خود کام آیا۔ گیلان اور اِصفَہان کے والیوں نے بغاوتیں کیں لیکن ناکام رہے۔ اِردبیل کے شیخ علی حیدر نے قرہ قویُنلُو کے ایسے کئی قبیلوں کو جو آق قویُنلُو میں شامل نہیں ہوے تھے اپنا حلقہ بگوش بنا کر ایک آزاد سلطنت کی بنیاد رکھنا چاہی مگر اُسے ہزیمت دے کر قتل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اوغورلو محمّد کا بیٹا، سلطان محمّد فاتح کا نواسہ احمد بیگ [رَسْتَم بآن]، جو بایزید ثانی کا داماد بھی تھا اور پست قد ہونے کی وجہ سے کوتاہ احمد کہلاتا تھا، استانبول سے نکلا اور رستم بیگ کو، جس سے اس کے امرا نے غدّاری کی، قتل کر کے حکومت پر قابض ہو گیا (۱۴۹۶ء)۔ نئے حاکم نے اپنے ملک میں عثمانی طریقِ حکومت کو رواج دینا چاہا اور آق قویُنلُو اولوس کے بڑے بڑے سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کیا، اس لیے کہ یہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے، ایک نہ ایک شہزادے کو بغاوت پر آمادہ کیا کرتے تھے اور ذرا پہلے جس حاکم کا ساتھ دیتے اس سے ذرا دیر بعد منہ موڑ لیتے تھے۔ ابتدا میں تو کوئی مزاحم نہ ہوا لیکن بعد میں بغاوت ہوئی اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا گیا۔ احمد کی سلطنت مشکل سے ایک سال رہی اور اس کی موت کے بعد سلطنتِ آق قویُنلُو کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ اوزون حسن کے بیٹے یوسف بیگ کے دو بیٹوں اِلوَند اور محمد بیگ اور سلطان یعقوب کے بیٹے سلطان مراد کی آپس میں نہ بنی اور ایک دوسرے کے حریف بن گئے؛ چنانچہ مختلف امرا نے مختلف اطراف میں کسی نہ کسی کی اِمارت کا اعلان کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شدید خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں چوٹی کے بعض امرا اور مدّعی سلطنت محمد بیگ کام آئے۔ آخرکار ۱۵۰۱ء میں اِلوَند بیگ اور سلطان مراد نے تمام سلطنت کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیا۔ اس انتظام کی رو سے عراقِ عرب، عراقِ عجم، فارس اور کرمان سلطان مراد کے حصّے میں آئے اور آذربیجان، اِرّان اور دیاربکر اِلوَند بیگ کو ملے، لیکن ملک خانہ جنگی سے برباد ہو چکا تھا۔ دو سو سال تک پے در پے حملوں اور مصائب نے شہروں کو برباد کر کے ان کے باشندوں کو پراگندہ کر دیا تھا۔ دیہات تباہ ہو چکے تھے اور ہر طرف ایک بھیانک بدبختی کا دور دورہ تھا۔ اسی خانہ جنگی کی وجہ سے جو سردار ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے وہ اپنے اپنے قبیلے اور خاندان کو ساتھ ملا کر یا تو ان ممالک میں، جہاں وہ پہلے سے حاکم تھے یا جنھیں انھوں نے بعد میں حاصل کر لیا تھا، خودمختار حاکموں کی حیثیت سے الگ الگ ہو گئے۔ یہ دونوں نوجوان حکمران اپنے بارسوخ سرداروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ خزانے میں روپے کے فقدان اور امرا کے مرکزی طاقت سے انحراف کے سبب ان کی حالت نازک ہو گئی تھی۔

اس نازک حالت میں اِردبیل کے شیخ [حیدر صَفَوی] کا بیٹا، شیخ اسمٰعیل صَفَوی، جو اپنے بڑے بھائی علی کے قتل کے بعد طریقتِ صَفَوِیّہ کا رہنما بن چکا تھا اور جو بعد میں شاہ کہلانے لگا، نمودار ہوا۔ اس نے اپنے دادا اور خصوصًا اپنے باپ کے مریدوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے قرہ قویُنلُو اولوس سے منسوب اور ان کی سلطنت سے وابستہ تھے، لیکن جب یہ سلطنت اور اولوس دونوں ختم ہو گئے تو وہ بھی کئی ایسے قرہ قویُنلُو قبائل کے ساتھ جنھوں نے پہلے آق قویُنلُو سے رشتہ نہیں جوڑا تھا بلکہ مدّت سے اِردبیل کے شیخوں کا ساتھ دیتے رہے تھے، لہٰذا مذہبًا شیعی اور جعفری تھے، آق قویُنلُو میں شامل ہو گئے تھے، لیکن چونکہ اُس حیثیّت اور مرتبے کو نہ پہنچ سکے جو انھیں پہلی سلطنت اور حکومت کے زمانے میں حاصل تھا اس لیے وہ آق قویُنلُو سے علانیہ یا خفیہ طور پر پرخاش رکھتے تھے اور ان کے علاوہ عثمانی یا ذوالقدِر حکومت کے ماتحت آناطولی کے مختلف مقامات میں رہنے والے خود آق قویُنلُو سے منسوب ایسے قبیلے اور خاندان بھی تھے جو خانہ جنگی کے دوران میں حکومت کے مخالف ہو گئے تھے، یا اس خانہ جنگی سے پریشان اور مضطرب تھے اور ایران، عراق اور آناطولی میں صَفَوِی طریقت کے پیشواؤں کی تبلیغی سرگرمیوں سے متأثّر ہو چکے تھے۔

اس طرح اُستاجلی، شاملی، رُوملُو، مُصلّو، ہِندلی، تکّہ لی، بابیوردلو، چَپانلی، قرہ طاغلی، قرہ مانلی، ذَوالقدِر، قَرسَک، اَفشار، اور قاچار نامی قبائل سے جمعیّت فراہم کر کے اور انھیں مذہبی جوش دلا کر شاہ اسمٰعیل نے اِرّان اور شیروان کی سرزمین کے ایک حصّے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد آذربیجان کی طرف پیش قدمی کی اور ۱۵۰۲ء میں اِلوَند بیگ کو شکست دے کر دیارِ بکر کی طرف بھگا دیا۔ اِلوَند نے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور صرف دیارِ بکر کے علاقے میں ایک حصّے پر قابض رہ کر ۱۵۰۴ء میں فوت ہو گیا۔

۱۵۰۳ء میں سلطان مراد کو شکست دینے کے بعد شاہ اسمٰعیل نے تمام فارس کے علاقوں پر قبضہ کیا اور بعد ازاں عراقِ عرب پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ذوالقدِر اوغلُو علاء الدولہ کو شکست دے کر دیارِ بکر کے پورے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ گویا آق قویُنلُو کی سلطنت کے تمام علاقے اس کی تحویل میں آ گئے۔ سلطان مراد پہلے شام گیا پھر عثمانی علاقے میں پہنچا اور آخرکار اِلبُستان ہوتا ہوا علاء الدولہ بیگ کے پاس پناہ گزیں ہوا، جہاں اس کی ایک لڑکی سے شادی کی، جس سے حسن بک اور یعقوب بک پیدا ہوے۔ جب یاوُز سلطان سلیم نے ایران پر یورش کی تو سلطان مراد اُس کے ساتھ گیا اور عثمانی سلطان نے اُسے اپنے